

جملہ حقوق محفوظ

# غالب

یعنی

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب رحی  
ایک مستند سوانح عمری جو خود میرزا کے مدد و جہ کے  
کلام نظم و نثر سے ماخوذ ہے

از

غلام رسول قمر بی۔ اے

مدیر روزنامہ انقلاب لاہور

مسلم نیٹنگ پریس - لاہور

# فہرست مضامین

۱	پیدائش نام و نسب، خاندان تعلیم	۱	پہلا باب
۲۶	شادی، اور خاکی زندگی اور متعلقین	۲	دوسرا باب
۵۰	وہی میں سکونت اور مکان	۳	تیسرا باب
۵۸	سفر کلکتہ	۴	چوتھا باب
۸۴	رام پورا درپردہ کے سفر	۵	پانچواں باب
۹۸	پنشن کا مقدمہ	۶	چھٹا باب
۱۲۴	اجتلاہ اسیری	۷	ساتواں باب
۱۳۴	مالی حالات۔ بیج گوئی اور سیانی	۸	آٹھواں باب
۱۷۰	دوستان غدر	۹	نواں باب
۲۲۷	پنشن کے حصول کے لئے سعی و سفارش	۱۰	دسواں باب
۲۴۳	عوارض اور وفات	۱۱	گیارہواں باب
۲۵۸	اخلاقی وعادات اور متفرق حالات	۱۲	بارہواں باب
۲۹۳	قصایف	۱۳	تیرہواں باب
۳۵۱	کلام، طریق اصلاح اور شاعرے	۱۴	چودھواں باب

CHECKED-2002

## تصاویر

(۳) مزارِ غالب

(۱) غالب

(۴) غالب علاؤ الدین احمد خان کے نام و شیعہ جانشینی

(۲) غالب کا ایک غیر مطبوعہ فارسی خط

## تفسیر

آج سے بیس سال پیشتر، ایک جلسِ عزائمِ شکریت کا اتفاق ہوا۔ جناب امام اور ان کے رفقاء عالی مقام کے مناقب بیان کئے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک گھنٹے سے کوئی خوش عقیدہ مسلمان بچارٹھٹھا فلیکٹینگی، کمنسٹ معہم معاً خیال آیا، بنفسِ بشری کا یہ لازمی خاصہ ہے۔ بڑے آدمیوں کے جلسوں اور ان کے کارناموں کا حال سن کر بے اختیار نمنا پیدا ہوتی ہے۔ کاش بھرنے والے زمانے میں ہوتے!

انسان دوسرے انسان کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مریض متاثر ہوتا ہے لیکن چونکہ انسان ہے، اس لئے "میں انسانی" چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ بڑا آدمی کہاں رہتا تھا، کون کونوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا اس کے عام مشاغل کیا تھے، طبیعت کی کیفیت کیا تھی، زندگی کے واقعات کیوں کرتا ہوتا تھا، کیا کھاتا تھا، کیا پیتا تھا، کیا پہنتا تھا۔ اس کی شکل صورت کیسی تھی۔ قد و قامت کا کیا حال تھا۔

نفسِ بشری کا یہ تقاضا اس قدر قدیم ہے کہ اس کا سرورِ آدم اول تک لگا یا جاسکتا ہے جب حضرت ابو البشر کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے ان کے پوتوں پڑپوتوں کے سامنے بڑے باوا کے حالات بیان کرتے ہوں گے کہ بڑے میاں کس طرح جنت الفردوس سے زمین پر گرے گئے، پھر انہوں نے کس طرح حوا کی رفاقت و اعانت سے اس زمین کو رہنے کے قابل بنایا، کیوں کہ اس سے خود اک چال کی کیوں کردندوں کا مقابلہ کیا، ایک ہزار برس تک اس خاکدانِ تیرہ پر کیوں کھدیا، انسانی کی بنیادیں ہنوا کر کتنے رہے۔ تو یقیناً وہ سچے بڑے باوا کے حالات اور کارنامے سن کر کھراٹھٹھے ہوں گے کہ کاش ہم بڑے میاں کے زمانے میں ہوتے۔

اتنی دور جانے کی کیا ضرورت ہے، ہر کار و عالم کی جیاتِ طیبہ پر غور کرو، دنیا میں ابتداء سے انوفیش سے آج تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی محبت کی خواہش کروڑوں انسانوں کے قلوب میں حضور سے زیادہ کثرتاً حضور کے برابر پیدا ہوئی ہو، جس کے اعمال و اقوال کی جتنی اور میں اس قدر عظیم انسان اہتمام کیا گیا ہو۔

ساتویں صدی کے آغاز سے آج تک پڑھوں اور لکھوں مسلمان اس دنیا میں آباد رہ چکے ہیں، اور ایک ایک کے

قلب کی سب سے بڑی تندی ہی یہی ہے۔ کہ اسے کاش میں سرکارِ دو عالم کے زمانے میں ہونا حضورؐ کے ارشادِ انا اپنے کانوں سے سنتا حضورؐ کی طاعتِ مقدس کے دیدار سے آنکھیں ٹھنڈی کرنا حضورؐ کی محفل میں بیٹھنا حضورؐ کے پیچھے نمازیں پڑھنا۔ یہی عالمگیر تہمتی جس نے لاکھوں تابعی پیدا کر دیے۔ جو رات دن صحابہ کرام سے حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایک ایک تفصیل کو یاد کر رہے تھے۔ اور ان کے ہاں لاکھوں تبع تابعین پیدا ہو گئے۔ جو تابعیوں سے استفادہ کر کے اسی جذبہ کی تسکین کا اہتمام کرتے تھے۔

یہی عالمگیر تہمتی معیتِ رسولؐ تھی جس نے حدیث و سنت کے بے پناہ ذخائر و معارف فراہم کر دیے۔ اور حضورؐ و رکنائے حالات و خیالات کی تدوین اس طرح کر دی۔ کہ پڑھنے والا محسوس کرنے لگا۔ کہ وہ حضورؐ کے ساتھ زندگی بسر کر رہا ہے۔ چونکہ قرآن مجید نے حضورؐ کی حیاتِ مقدسہ کو ہر مسلمان کے لئے اُسودہ حسنہ بھی قرار دے دیا تھا۔ لہٰذا یہ ہر مسلمان کی دینی و دنیوی صلاح و فلاح کا وسیع بڑا سرمایہ بن گئی۔ لیکن یقین جانیئے۔ خواہی احادیث و سنن کی نفی یا وجہ محض یہ ہے۔ کہ مسلمان کا قلب اپنے آقا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ متعارف ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ تفصیل دینا کی گئی۔ اور ایک عظیم الشان انسان کے افعال و اقوال کا وہ عظیم الشان رکارڈ خزانہ بن گیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔

(سوانحِ محمدی، اسی تہمتی معیت کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے معیت کی خواہش کا پورا ہونا تو بحال عملی ہے۔ اس لئے کہ جو بانی و ریائیں یہ چکا۔ وہ وہیں نہیں لایا جاسکتا۔ اور جو انسان موت کے گھاٹ اتار چکا۔ وہ دوبارہ نہیں آسکتا۔ اس لئے کوشش کی گئی کہ زندگان کے حالات مختلفہ ماخذوں سے اس طرح فراہم کئے جائیں۔ کہ پڑھنے والے اُن سے زیادہ سے زیادہ واقف ہو جائیں۔ اور ان کی واقفیت اس درجے تک پہنچ جائے۔ کہ اگر وہ سوانحِ صاحبِ سوانح کی زندگی میں موجود ہوتے۔ تو اس سے بہتر واقفیت نہ حاصل کر سکتے۔ اس لئے سوانحِ عمری کی عمدگی کا معیار بنیہ قرار پایا۔ کہ وہ پڑھنے والوں سے صاحبِ سوانح کا تعارف مکمل کر دے۔ اور انہیں محسوس ہو۔ کہ گویا وہ صاحبِ سوانح کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سوانحِ عمری کی دو قسمیں قرار پائیں۔ اقل سوانحِ عمری۔ دوم خود نوشت سوانحِ عمری۔ سوانحِ عمری تو وہ ہے جسے صاحبِ سوانح کا کوئی دوست آشنا یا عقیدت مند لکھے۔ اور خود نوشت سوانحِ عمری وہ ہے جسے صاحبِ سوانح خود ہی لکھتا چلا جائے۔



استناد کے اعتبار سے دوسری قسم زیادہ بہتر سمجھی جاتی ہے لیکن ماہر نفسیات اس مطلب میں نہیں ہوتا اس لئے کہ ممکن ہے صاحبِ ریح بعض اہلِ ریح سے بعض ایسے واقعات عذب کر گیا ہو جن کا جہور کے سامنے آجانا بے حد ضروری تھا۔ اپنی ذاتی کمزوریوں کو من و عن بیان کر دینا بے حد دشوار ہے۔ اور پیڑ اور بالائی اور گاندھی نے اپنی خود نوشت سوانحِ عمریوں میں اپنی کمزوریوں کا جو حال لکھا ہے، اس پر بھی نقد و نغیبات کو پورا اطمینان نہیں ہوتا۔

تہر صاحب نے سوانحِ عمری کی ایک تیسری قسم ایجاد کی ہے کہ صاحبِ ریح کے کلامِ نظم و نثر اور اس کی کئی تحریروں اس کے حالاتِ زندگی فراہم کئے ہیں جن کی صداقت سے کوئی دوسرا شخص تو درکنار خود صاحبِ ریح بھی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ ایک ایسا درجہ ہوتا ہے جس سے بڑھ کر تقدیر میں نہیں آسکتا۔ اب اس کا فیصلہ خود کر لیجئے کہ یہ تہر صاحب کا کمال ہے یا مرزا غالب کا۔ بہر حال تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر مرزا غالب ایسے اچھے اور جامعِ رقعات دیکھ جاتے تو تہر صاحب سوانحِ شکاری میں اسے زیادہ کامیاب نہ ہوتے لیکن تہر صاحب کا شرف یہ ہے کہ انہوں نے اس مواد سے وہ فائدہ اٹھایا جس کی توفیق مرزا کے عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی نہ ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ خواجہ جاتی مرحوم بھی معیت اور واقفیت کے باوجود اس سے پورا استفادہ نہ کر سکے۔ تہر صاحب کی یہ کتاب پڑھنے سے وہ تنہا کاشِ ہم مرزا غالب کے عہد میں ہوتے بہت بڑی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں غالب، ورقہ نثار اور شاعر اور نثر نویس غالب کے متعلق اتنی باتیں تحقیقی طور پر معلوم ہو گئی ہیں کہ شاید غالب کی معیتِ معاشرت کی حالت میں بھی معلوم نہ ہو سکتی۔ تہر صاحب میں دو خوبیاں بیک وقت مجتمع ہو گئی ہیں کہ وہ ادب کا نہایت بلند اور سکھا ہوا ذوق بھی رکھتے ہیں اور تحقیق و تفتیش کے معاملے میں بھی انتہا درجے کے محتاط ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا انداز تحریر بے تکلف اور بے تحاشان اور دشمن بھی ہے اور واقعات کی صحت بھی موادِ حاصل کے اعتبار سے کاملاً مستند۔

بہر حال میں اس کتاب کے پڑھنے والوں کو بہت زیادہ نظر رکھنا ظلم سمجھتا ہوں۔ خدا کرے کہ تہر صاحب کے اس قابلِ رشک ادبی کاغذ کے کوٹن قبولِ حاصل ہوا اور ان کے زمانہ مرزا کے فارسی و اردو کلامِ نظم کے ساتھ ساتھ ان کے رقعات کا مطالعہ بھی فرضِ قرار دیں۔ میری تمنا ہے کہ مرزا کے رقعات نئے سرے سے مرتب کیے جائیں اور اگر یہ کام بھی تہر صاحب کے ہاتھوں انجام پائے تو نوزائے نذر ہو جائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

## تمہید

درہم غالب آئے و بشعر سخن گزائے  
خواہی کہ بشنوی سخن ناسخ و کج

کم و بیش پچیس برس ہوئے جب غالبؔ شناسانی کی ابتدا ہوئی تھی۔ اور شناسانی کا ذریعہ اردو کا وہ مختصر سا دیوان تھا جو قرن چار آئے ہیں بازار سے ملتا تھا۔ شاید اب بھی ملتا ہو جبکہ دیوان غالبؔ پانچ پانچ دس دس اپندرہ پندرہ بلکہ دو دو سو روپے کے ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو رہے ہیں میں سکول میں پڑھتا تھا شعر گوئی کا شوق تھا اور ہم چند دوست جن میں سے ایک مولانا عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری ہیں کوئی ایک طرح تجویز کر کے غزلیں لکھا کرتے تھے۔ غالبؔ کا دیوان پڑھنا شروع کیا تو اس کے بعض اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس زمانے میں میرے ایک شفیق استاد مولانا حکیم محمد سلیم صاحبؔ سیم مرحوم دوستی خداؔ جالندھری تھے۔ جو عربی افادہ، اردو اور بھاشا کے جمل عالم تھے۔ چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے علوم عقاید و تقلید کے بہت بڑے ناہل تھے جنہر اور نجوم میں بھی نہایت عمدہ و متکاہ رکھتے تھے خطاطی و خوشنویسی کے مختلف اصناف پر عادی تھے۔ عام علوم و فنون مثلاً اولہ شرقیہ میں ہمارے نامہ کے علاوہ وہ اعلیٰ درجے کے طبیب تھے لیکن ان کا علم و فضل صرف اس وجہ سے ظاہر نہ ہو سکا کہ وہ ناؤ نوش کے بہت عادی ہو گئے تھے۔ اور ان کا زیادہ وقت سرخوشی کے عالم میں گزرتا تھا۔ وہ خود بھی تنہائی، علیحدگی اور خلوت کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ اور عام لوگوں سے دنیا یا علمی مجاہد میں جانا انہیں مرغوب نہ تھا جب کبھی علمی باتیں سنانے بیٹھ جاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فضائل متنوعہ کا دریا موجزن ہے۔ اس قسم کا محبوبوں میں خود ہی کبھی کبھی بے اختیار پکاراٹھتے تھے ۵

یہ سائل قصوف یہ ترایان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو زیادہ خواہتو

ان سے دیوان غالب پڑھا تو دل میں وہ جذبہ عقیدت و نیاز پیدا ہوا جسے اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ اب بھی میں اپنے ذوق ادب کے کلبہ تاریک کی شمع فروزاں سمجھتا ہوں میں سکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لئے لاہور چلا آیا مولانا سلیم پٹواری مدت کے بعد وفات پا گئے۔ امدت تھانے کی رحمت لایزال کے دروازے ان پر کھلے رہیں۔ انہی کی آغوشِ علم و فضل میں میرے دل و دماغ نے ہوش کی آنکھ کھولی اور انہی کے دبستانِ لطف و فرائض میں میں نے عشقِ غالب کا پہلا سبق پڑھا۔ کالج میں پہنچ کر میں نے مولانا حسرت موہانی کی شرحِ غالب دیکھی جس نے غالب کی ذات کے حسنِ عقیدت اور جوشِ نیاز کے اس جذبہ کو زیادہ محکم و پختہ کر دیا جو مولانا سلیم مرحوم کی فیضِ با محبت میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں حالات نے مجھے اخبار نویسی کے دائرے میں پہنچایا۔ جاںِ ذوقِ علم و ادب کے اس نادار لاجورد پیکر کے ساتھ رابطہ محبت و مودت ہوتا رہا جو اس کی رفاقت و معیتِ میری حیاتِ استعار کا عزیز ترین سرمایہ بننے والی تھی۔ میرا اشارہ براہِ درمکر مولانا عبد المجید خاں صاحب سالک کی طرف سے۔ جو چودہ برس سے میرے حقیقی بھائی کے برابر عزیز میرے ہر پنج و راحت کے رفیق، خدمتِ عامہ کے میدان میں میرے ہر قابلِ توجہ اندوختہ عمل کے لئے عند الحلقہ مجھ سے بڑھ کر سستی نہ تھیں اور عند اللہ مجھ سے بڑھ کر سستی نہ تھیں۔ امدت تھانے ہر حال میں ان کا حامی و ناصر رہا۔

میں ہوشِ سمجھاتے ہی کسی دوسرے شاعر کی عقیدت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈالے بغیر غالب کے معتقد بن گیا تھا لیکن سالک صاحب اپنے ذوقِ صحیح کی رہنمائی میں مختلف مراحل سے گزر کر غالب کے آستانہ پر پہنچے تھے میری عقیدتِ اجتماع و تحقیق کے جوہر سے معذرتی ہیں۔ صرف غالب کو دیکھا تھا اور کسی دوسرے سے شناسائی و معرفت حاصل نہیں کی تھی لیکن سالک صاحب کی عقیدتِ غالب ادبِ اردو کے سارے اندوختہ کی اچھائیوں اور برائیوں کے ہمہ گیر و ہمہ رس اندازہ کے بعد مودتِ پذیر ہوئی تھی۔ شہر علی مصطلاح میں میری حیثیت "عامی مغلہ" کی تھی لیکن سالک صاحب "محقق و جہد" کے مرتبہ فائز ہو چکے تھے یا تصوف کی زبان میں "میں مجذوب" تھا اور وہ "سالک" تھے۔ "اس محقق" رفیقِ عزیز کی مستقل محبت نے غالب کے متعلق میرے معتقدات میں بصیرت کی روشنی پیدا کی اور مولانا سلیم کے دستِ فیض

جس عقیدت کا سنگ بنیاد رکھا تھا اسے سالک صاحب کی بجز اندہ عقیدت سے منکر ہٹا کر رت بنا دیا۔  
 آج سے چند سال پیش تک ہمارا عام مشورہ تھا کہ سیاسیات کے خشک اور بے کیف مسائل سے  
 تھوڑی دیر کے لئے انگ ہو کر غالب یا عرفی یا نظری کے دو ادیبوں کے کمر بیچے جاتے تھے اور گھنٹوں پرچے  
 رہتے تھے۔ تنہائی کی ان پُرلطف صحبتوں میں ہم یہ بھی سوچتے رہتے تھے کہ غالب کے کلام بالخصوص فارسی  
 نظم کو زیادہ فروغ دینے اور زیادہ ہر دلعزیز بنانے کی کیا کیا تدبیریں ہو سکتی ہیں اور عقیدت کی جس ولایت  
 سے ہمارے سینے معمور تھے اسے ہر شے سے لکھے آدمی کے دماغ میں پہنچانے کے لئے کون کون سے  
 طریقے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ مختلف اوقات میں ہم نے مختلف سکیں بنائیں مختلف نقشہ اسے عمل  
 تیار کئے جن پر کاربند ہونے کے لئے تھوڑی سی فرصت و ملت کے آرزو مند تھے لیکن اس نوعیت کی  
 کوئی کتاب ہمارے ذہن میں نہیں آئی تھی جیسی اس وقت ارباب علم کے روبرو پیش کی جا رہی ہے۔  
 میں نے غالب کے اردوئے معلّے اور عود ہندی کو جیت جیت کئی مرتبہ دیکھا تھا لیکن میری نظروں  
 میں ان کی حیثیت معمولی خطوط سے زیادہ نہ تھی، اور اس قسم کے دوسرے مجموعوں کے مقابلے میں ان کی  
 ہندی پایہ اور مرتبہ کا مدار بعض یہ تھا کہ یہ غالب کے خطوط تھے جیسی ۱۹۳۵ء میں آنکھوں کی تکلیف سے  
 مجبور ہو کر میں پہلا پر گیا۔ تو غالب کی چند کتابیں اس خیال سے اپنے ہموار لینا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ  
 آشوب کی بلا سے نجات دے گا تو ان کتابوں سے دل بہلا لیا کروں گا میری آنکھوں میں آشوب کے دھندے  
 ہوتے تھے یعنی وقفہ آنکھیں سُرخ اور متورم ہو جاتی تھیں اور ان میں سے پانی بہنے لگتا تھا۔ دس بارہ  
 دن کے بعد آرام ہو جاتا تھا (آرام کے بعد دو دنوں میں میں اردوئے معلّے اور عود ہندی کا ہاتھ قلم  
 مطالعہ کرنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان میں غالب کے سوانح حیات کا کافی سرمایہ موجود ہے میں نے اپنے  
 ذہن میں چند عنوانات قائم کر لئے اور دوران مطالعہ میں کتابوں کے حاشے پر جا بجا نشانات لگاتا رہا۔  
 بعد ازاں غالب کی فارسی تصانیف نظم و شعر نظر ڈالی تو مزید حالات کے نشان کردہ حصوں کو پیش نظر ترتیب کے  
 مطابق جمع کرنا شروع کیا تو خیال تھا کہ غالب کے خود نوشتہ سوانح حیات کے نام سے متوسط حجم کا ایک رسالہ  
 مرتب ہو جائے گا لیکن سارے نشان کردہ حصے جمع ہو گئے تو ایک اچھی خاصی کتاب بن گئی لاہور

پہنچ کر میں نے ان اشخاص کے متعلق مزید معلومات فراہم کیں جن کا ذکر غالب کی تصانیف میں آیا ہے تو کتاب میں مزید مضافوں کی ضرورت پیش آئی۔ جسے اب میں اپنی ادبی بے باگگی کے اعتراف کے ساتھ عاجزانہ و نیازمندانہ رباب علم و ذوق کے روبرو پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں (خدا کرے یہ ناچیز یہ کتاب بارگاہِ عظمت و جلال کے نمایاں سمجھا جائے۔

تالیف کتاب کی اس مختصر سی سرگزشت کے بغض کتاب کی نسبت کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں لیکن سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ”یادگار غالب“ جیسی بلند پایہ کتاب کے بعد سوانح غالب کی ترتیب کیوں ضروری سمجھی گئی؟ مجھے ”یادگار“ کی بلندی پایہ کے اعتراف میں نہ پہلے کبھی تامل ہوا ہے اور نہ اب تامل ہے۔ اور میں خواجہ حالی مرحوم کے ادب نے نیاز مندوں میں سے ہوں۔ (یہ بھی واقعہ ہے کہ غالب کو آج ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں ”یادگار“ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن ”یادگار“ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں ہے۔ اصل کتاب کم درمیش چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن ان چار سو صفحات میں سے غالب کے سوانح حیات کے لئے صرف چھیانوے صفحے مل سکتے ہیں اور ان چھیانوے صفحات میں غالب کے سوانح حیات بھی ہیں ان کے کلام کے اقتباسات بھی ہیں۔ لطائف بھی ہیں۔ حالی اور غالب کا باہمی معاملہ بھی ہے۔ اور غالب کے شاگردوں میں سے نواب غیاث الدین احمد خاں اور نواب مصطفیٰ خاں کے حالات بھی ہیں۔ غالب کی زندگی کے حالات کی تحقیق و فراہمی کے لئے خواجہ حالی کو جو موقع حاصل تھے۔

وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ خواجہ مرحوم غالب کے عزیز شاگرد تھے۔ تمام شاگردوں میں علم و فضل کے اعتبار سے افضل تھے۔ غالب کے نہایت ہی عزیز اور دیرینہ دوست نواب مصطفیٰ خاں شفقہ کے رفیق تھے۔ اکثر غالب کے ملتے رہتے تھے۔ اور ان کے تمام حالات پر چھتے اور سنتے رہتے ہوں گے۔ انہوں نے غالب کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف (بہشت شائے مسکاتیب اردو) پڑھ لی ہوں گی اور جو تحریرات غالب کی زندگی کے واقعات و حالات کا مرقع تھیں ان کے غیر واضح یا کم واضح حصوں کو خود غالب کے واضح کرا لیا ہو گا یا واضح کرا لیا جائے گا لیکن افسوس کہ یادگار ان تو قعات کو پورا

نہیں کئی جو حتمی اور غالب کہے گئے تعلقات کی بنا پر اس کتاب سے وابستہ کی جاسکتی ہیں مگر شاعر وادیکے طرح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصانیف کے فہم میں نیا دہ سے زیادہ مدو ملے۔ اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے جس میں صاحبِ دل نے زندگی گزار لی جس کی آغوش میں اس کے خیالات و افکار نے غالب حیات اختیار کیا۔ اور نشو و نما پا کر حروف و الفاظ کا لباس پہنا تو میری رائے میں ”یادگار“ کی مہندی پایہ کے ہتھکنڈے کا وجود کہنا چاہئے کہ وہ اس مدعا کی مکمل کامرغ نہیں بن سکتی۔ غالب کی تصانیف کے مطالعہ کے دوران میں جا بجا جمادات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواکے لئے شتابی نگاہیں یا ”گوگر“ کے صفحات کی طرف بے اختیار مٹھتی ہیں تو زیادہ تر نا کام واپس لوٹتی ہیں بلکہ غالب کی تصانیف کے غائر مطالعہ کے بعد یادگار کا مطالعہ کیا جائے تو کئی مقامات پر دل پر دل یہ اثر قبول کرتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت غالب کی تمام تحریرات خواجہ مرحوم کے پیش نظر تھیں۔ لہذا ان سے بعض حیرت انگیز وسوسہ زد ہوئے جن کی تفصیل آپ کو آئندہ صفحات میں ملے گی۔

میں نے کوشش کی ہے کہ غالب کے زیادہ سے زیادہ حالات کیجی ہو جائیں اس کی زندگی کے مختلف حصوں کے متعلق اتنی تفصیلات فراہم ہو جائیں کہ کسی صاحبِ ذوق کو کسی حصے کے متعلق کوئی تنگی محسوس نہ ہو اس بات کا فیصلہ قارئینِ کرام پر ہے کہ میری یہ ناچیز سعی جس کا دائرہ بہ ہر حال بہت ہی محدود تھا کس حد تک مشکور ہو گی (میرے بیانات زیادہ تر خود غالب کی تحریرات پر مبنی ہیں۔ اس لئے اس کتاب کو ایک لحاظ سے غالب کی تنزک کہا جاسکتا ہے البتہ تشریحات میری ہیں جن کے لئے مجھے سینکڑوں غیر معروف اور بے حد کیا کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ جہاں جہاں غالب کے بیانات محلِ نظر معلوم ہوئے ہیں ان کے قیول کے وجوہ ظاہر کر دئے ہیں۔)

میرزا محمد عسکری صاحب کی کتاب ”ادبی خطوط غالب“ میں نے برس ویراہ برس پہلے دیکھی تھی۔ یہ کتاب مختلف معلومات کے اعتبار سے بڑی قابلِ قدر ہے اپنی کتاب کی ترتیب کے فائن ہو کر میں نے سرسری طور پر اسے دوبارہ دیکھا تو اس میں بھی جا بجا سہو نظر آئے۔ جن کا تفصیلی ذکر آپ کو باب تصانیف میں ملے گا۔

اٹا سیکو پڑیا آف اسلام ٹری تحفہ دکن کے مالک کے متعلق اس کی تحقیق کا سرمایہ بھی حدود پنجاب کی نظر آیا۔  
مشکلات میں مرقوم ہے کہ غالب اپنے فارسی دیوان میں حاجی احمد بخش تہمال کیا ہے۔ حالانکہ غالب کی کچھ اور بیسی بیسی غزلیات  
فارسی میں ایک جگہ بھی احمد بخش نہیں آیا پھر لکھا ہے کہ غالب کے چچا کی وفات کے بعد شاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ کا وظیفہ  
مقرر کر دیا تھا۔ حالانکہ غالب کا نقل وظیفہ یا خانہ داری میں نہ شاہ دہلی سے متعلق تھی اور نہ پچاس روپے ماہانہ یعنی پیش کش  
انگریزی نے منظور کی تھی اور نہ پورچھہ کی بقا ملک اس سے متعلق رہی۔ بعد ازاں براہ رست انگریزی خزانہ سے متعلق ہو گئی  
اور اس کی مقدار ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ یا ساڑھے سات سو روپے سال یعنی شاہ دہلی سے تاریخ نکالی کے  
صلے میں جو پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئے تھے ان کی ابتداء جون ۱۸۵۷ء سے ہوئی جبکہ غالب کے چچا کی وفات پہ  
جولیس برس گزر چکے تھے۔

ان لغزشوں کے نگار سے یہ مقصود تھا جو نہ نہ یہ نہیں ہے کہ ان ارباب علم و فضل کی مساعی مشکور کی قدر و منزلت  
گھٹاؤں حاشا و کلام بقصود محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان بندگان کی کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی غالب کے متعلق تحقیق کی گنجائش  
موجود ہے۔ شاید میری یہ ناچیز کوشش ارباب علم و ذوق کے سامنے تحقیق کے نئے راستے پیش کر سکے۔

غالب کے خطوط اور دوسری تصانیف کے ان حالات کو جمع کرنا آسان نہ تھا بلکہ یہ مشکلات کا صحیح اندازہ دہی تھا  
فرما سکتے ہیں جنہیں اس نوعیت کے کاموں کا تھوڑا بہت تجربہ ہے۔ ایک ایک مطلب کے لئے ایک ایک صفحہ کو کھول کھول کر  
ایک ایک سطری تفتیش غیر ممکن ہونے کے علاوہ بقدر صرف وقت مفید بھی نہ تھی نیز میری صحت اس قدر ویدہ ریزی کے لئے  
مساعدہ تھی۔ لہذا میں نے زیادہ تر حافظہ اور تھنا پراعتما و کیا اور حافظہ ہی کی بنا پر مختلف اصحاب کے نام کے خطوں  
یاد دوسری تصانیف سے مختلف مطالب جمع کرنا یا کرنا بہت ممکن ہے بعض ضروری چیزیں نظر انداز ہو گئی ہوں لیکن مجھے  
یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ حالات فراہم ہو گئے ہیں۔

بعض امور کے متعلق مجھے محض قیاسات سے کام لینا پڑا جن میں سے ممکن ہے بعض غلط ہوں یا پورے کے  
پورے صحیح نہ ہوں لیکن مستند معلومات سامنے نہ ہونے کی صورت میں قیاسات کے سوا چارہ نہ تھا۔  
غالب کی تمام تصانیف کے پہلے ایڈیشن مجھے ذل کے اس لئے میں نے مختلف تحریرات کو سامنے رکھ کر ان کی اشاعت  
اشاعت کے متعلق بھی قیاس سے کام لیا ہے یقین ہے کہ یہ قیاسات اگر بالکل صحیح نہ ہوں گے تو صحت سے اقرب ضرور ہوں گے۔

ابتداء میں میرا ارادہ تھا کہ غالب کے اس کیا ب کلام کو بھی کتاب میں شامل کروں جو اب غیر مطبوعہ کلام کی حیثیت رکھتا ہے۔ چکا ہے نیز غالب کے ادبی و علمی نجات اور لطائف کا بھی ایک بڑا مجموعہ فراہم کر لیا تھا، جسے کتاب کے آخر میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی اور مجھے مجبوراً یہ حصے روکنے پڑے، حالات نے مسامت کی تو انہیں علیحدہ شائع کروں گا۔ کتاب کی ضخامت کے بڑھنے ہی کا اندیشہ کلام کے باب میں بھی زیادہ تفصیلی مباحث کا عنوان لکھ رہا۔ یہی انشاؤں کی دوسری شکل میں پوری ہو جائے گی۔

میرا ارادہ تھا کہ اس موقع کی ترتیب میں جن جن کتابوں سے میں نے فائدہ اٹھایا ان سب کے نام درج کروں لیکن یہ ذمہ بہت طویل تھی اس لئے اسے نظر انداز کرنا پڑا البتہ کتاب میں غالب کی جن تصانیف کے حوالے آئے ہیں ان کے ایڈیشنوں کی تصحیح اس لئے ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عام قارئین کو حوالوں کی تلاش میں کئی تشریحات و ترمیموں کی ضرورت ہے۔

(۱) کلیات نظم فارسی مطبوعہ نو لکھنؤ طبع دوم ۱۸۹۳ء۔

(۲) کلیات شرف فارسی مطبوعہ نو لکھنؤ طبع سوم ۱۸۸۴ء۔

(۳) اردو کے پہلے مطبوعہ طبع فاروقی دہلی ۱۳۲۶ھ۔

(۴) عود ہندی مطبوعہ نو لکھنؤ، جولائی ۱۹۰۸ء۔

کتاب میں جاں جاں جان کتابوں کے حوالے آئے ہیں ان صفحات کے لئے یہی ایڈیشن ملاحظہ فرمایا جائے۔ ان تہمدی گزارشات کے بعد شکر و سپاس کا فضل ادا کرنا ضروری ہے۔ سب سے پہلے مجھے نواب سیر الدین احمد خاں دہلی نوادر کا شکر یاد کرنا چاہیے جنہوں نے باوجود کثرت مشاغل و بوجہ مصروفیات مجھے دوسرے نواب خورشید علی خاں خلیف نواب سرؤ و الفقار علی خاں مرحوم کے دولت کدہ پر شرف ملاقات بخشا اور گفتگوں میں سے استغفارات کے جواب میں حمت فرماتے رہے۔ وہ اس خاندان کے طویل القدر فرد ہیں جو شاہی کے بعد غالب کا اپنا خاندان بن گیا تھا۔ میسر گرٹ آئی۔ اسی۔ ایس۔ ایس۔ پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اور برادر مرزا ملک صاحب کو نہ محض پرانے ریکارڈ دیکھنے کی اجازت دی بلکہ غوث خلیف فرما کر ہمارے مطلوبہ کاغذات پر نشان لکھ دئے۔ میسر رام بھایا صاحب لاہور میں پنجاب پبلک لائبریری کا ممنون ہوں جن کی ہمدردانہ امداد سے مجھے بعض بے حد کیا ب کتابیں میسر آئیں۔ اور جنہوں نے میرے لاہور جانے کے بعد لاہور میں ہی کتابوں سے

نواب سیر الدین احمد خاں کے نام و تہذیب جانشینی بھی حضرت مجددی ہی کا میر ہے۔



میری سہولت کے مطابق استفادہ کے مواقع بہم پہنچائے۔ اپنے محترم و شفیق بھائی سیدنا حنین نائب تحصیلدار ساکن  
جگاؤں ضلع لہویانہ کا ممنون ہوں جو خان بہادر مولوی سید رجب علی صاحب مرحوم غاٹبہارسطو جاہ کی اولاد میں  
سے ہیں انہوں نے میری کتاب کا اعلان دیکھ کر غائب کی ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کا عکس مرحمت فرمایا جو اس کتاب کی  
زمینت بنا ہوا ہے۔ آغا حنین صاحب نے مولوی صاحب مرحوم کے مفصل حالات، ان کی دو تفسیریں اور فارسی کا کام  
بھی میرے پاس بھیج دیا تھا۔ ان تفسیروں کا ذکر غائب کی فارسی رفاقت موسومہ مولوی صاحب مرحوم میں آئی ہے  
صفی اللہ وحسام الملک نائب سید علی حسن خاں دکنخوا کا ممنون ہوں جنہوں نے میری درخواست پر غائب کے بعض  
غیر مطبوعہ کتابت کے حصول کے لئے زحمت برداشت فرمائی۔ انہوں نے کراچی تک یہی کام کیا نہیں ہو سکی مولانا محمد شفیع  
صاحب پریل اوٹیل کالج کا ممنون ہوں جن کے ذریعے سے غائب کے متعلق بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔ مولانا مظہر الدین حسنا  
شیرکوٹی مالک امان "وحدت" دہلی کا ممنون ہوں جو دور دور میرے ساتھ "دیوان غائب" کے ایڈیشن کی تلاش میں  
پھرتے رہے۔ انہی کی وساطت سے میں خاندان لوطی کے بعض افراد تک پہنچ سکا۔ اور غائب کے غیر مطبوعہ  
کلام کی نقل لے سکا۔ اپنے عزیز و محترم بھائی شیخ مبارک علی صاحب کتاب کا ممنون ہوں جنہوں نے کتاب کی طباعت  
کے سلسلے میں میرے لئے متعدد جہتیں برداشت کیں۔ سب سے آخر میں اور سب سے بڑھ کر اپنے عزیز و محترم بھائی  
مولانا سالک کا ممنون ہوں جنہوں نے ان اوراق پریشان کو شروع سے آخر تک چڑھا، درجن کا علم و ذوق  
کتاب کی موجودہ ترتیب میں میرا بہترین رفیق و رہنما رہا۔

آخر میں یہ عرض کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اگر کتاب کو کسی شخصیت کے اقتباس کے ذریعہ کرنے  
کے شبہ عام کی پیروی سے طبیعت گریزاں نہ ہوتی تو میں اسے اپنے چھوٹے بھائی چودھری امیر محمد خاں  
علوی سناورد شاہ میں اس کے نام سے منسوب کرتا۔ اول اس لئے کہ بیماری کے پرانا مایام میں سکون کے جتنے لمحے  
میرا گئے ان کے لئے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے بعد اپنے بھائی کی سعادت مندی اور خدمت گزاری کا  
ممنون ہوں۔ اگر مجھے یہ سکون حاصل نہ ہوتا تو میں کتاب مرتب نہ کر سکتا۔ دوم اس لئے کہ وہ مسلسل و متواتر مجھے  
اس کی تکمیل کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ میری تندرستی کے اوقات میں وہ روزانہ اس کا کوئی نیا حصہ سننے کے  
آرزو مند رہتے تھے۔ اس وجہ سے میرے دل میں تکمیل ترتیب کا جذبہ تازہ رہا۔ سوم اس لئے کہ غائب کے ساتھ

گھرے روابطِ نیاز میں بھی وہ میرے شریک ہیں لیکن میں انسابات کے عام شیوہ کو پسند نہیں کرتا۔

میں ادیب نہیں ہوں، شاعر نہیں ہوں، نقاد نہیں ہوں، سوانح نگار نہیں ہوں۔ غالب کی ذات کے ساتھ دیرینہ عقیدت کے جذبہٴ فطرت کی سرخوشی میں قلم کے مسافرنے مہینوں کا غذات کے مراحل میں وقوع کی ہے۔ خدا کرے اس کی یہ زحمت کشتی بالکل عبث نہ سمجھی جائے۔ اور یہ یقینہً اربابِ علم و ذوق کی بارگاہِ نوآئش سے خلعت قبول پائے آئیں۔

مسلم باقن - لاہور  
۱۰ مئی ۱۹۳۶ء

مہر



میرزا غالب

(عبدالحق علی خان) کی رعایت سے میرزا کا خاکہ مرصع کیا گیا ہے۔



بسم اللہ الرحمن الرحیم

## پہلا باب پیش نام و نسب، خاندان اور

غالب نام اور منام و نشانم پیرس

ہم اللہم ہم اللہم

تاریخ پیش | اسد شہید خاں نام، میرزا نوشہ عرف، نجم الدولہ و پیر الملک نظام جنگ خطاب، ۸ رجب ۱۲۱۲ھ  
(واحد کتب پرست) کو اکبر آباد (اگرہ) میں تربیت آرائے عالم وجود ہوئے۔ نواب علار الدین احمد خاں  
علانی رئیس لوہار کو ایک خط میں جو غالباً سنہ ۱۲۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:-

”سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں، اب کے رجب کے مہینے سے اہنترواں برس شروع ہوا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب مدح ہی کو لکھتے ہیں:-

”قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم آسپہل کے مجرم عالم ارواح میں منراہتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم

ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر منراہتے ہیں چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھے روبرواری کے واسطے یہاں

حضور آدم علیہ السلام (مرفوعہ ۱۲۱۲ھ)

(یعنی دنیا میں بھیجا) (مرفوعہ ماہ ذیحجہ ۱۲۱۲ھ)

منشی حبیب اللہ خاں صاحب ذکا جید آبادی (پیشانی و قریب نواب مختار الملک سرسالا رنجناں و

کو لکھتے ہیں:-

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہترواں برس شروع ہوا (مرفوعہ ۱۲۱۲ھ)

نواب میرا برہیم علی خاں کو ۵ دسمبر ۱۸۶۶ھ کے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:-

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہترواں برس شروع ہو گیا۔

۱۔ منراہتے نام سے احمد راہین "ملک" میں پائی فریج، چکوا ہے۔ ۲۔ منراہتے منراہتے نام سے احمد راہین  
(عند اللہ ملک خاں) میں رہا ہوا ہے۔ ۳۔ منراہتے منراہتے نام سے احمد راہین۔ ۴۔ منراہتے منراہتے نام سے احمد راہین۔

خواجہ غلام غوث خاں صاحب سحر کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

حضرت میں اب چراغ سحری ہوں <sup>۱۲۸۴ھ</sup> کی آٹھویں تاریخ سے اکثر وہاں برس شروع ہو گیا۔

طاقت سلب، جو اس مفقودہ امراض مستولی -

دیوان فارسی کے خاتمہ کی نشر میں غالب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک دلچسپ باری لکھی ہے جس میں دو مادے نظم کئے ہیں اور دونوں اس نامور روزگارِ ستی کی شاعرانہ زندگی کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

غالب چو ناسازی فرجام نصیب ہم خوفِ عدد و ارم و ہم فوقِ حبیب  
تاریخِ ولادت من از عالمِ ندس ہم شورشِ شوق آمد ہم فقط غریب  
”شورشِ شوق“ اور ”غریب“ دونوں سے <sup>۱۲۸۴ھ</sup> تاریخ نکلتی ہے اور دونوں مادے غالب کی زندگی کا نہایت ہی صحیح موقع ہیں۔

نامِ انام عرف اور خطاب کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں بجا بجا تصریحات ملتی ہیں۔ غالب <sup>مکمل</sup> علی مشہور کتاب ”تنبیہ“ پہلی مرتبہ اگر وہ میں نشی شیونرائن آرام کے مطبع مفیہ خلافت میں چھپی تھی اور چھپائی کا سارا انتظام نشی ہرگپال تفتہ نشی بنی کشن جھیر اور مرزا احاط علی بیگ تھر کے سپرد ہوا تھا۔ غالب ایک خط میں تفتہ کو ”دوستِ سرور“ کی عبارت کے متعلق ہدایات دیتے ہوئے رقم فرماتے ہیں :-

نشی شیونرائن کو سمجھا دینا کہ زہارِ سرور ”دوستِ سرور“ عرف نہ لکھیں..... اجزلے خطاب کا لکھنا نامناسب بلکہ ضرر ہے۔ مگر ان نام کے بعد فقط ہمارا اور ہمارے کے بعد شخص اسدا اللہ خاں بہادر <sup>غالب</sup> پھر نشی شیونرائن کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

سنو میری جان، ذرا بی کا مجھ کو خطاب کے خجلاں دلاؤ اور اطراف و جوانب کے امرا سب مجھ کو نواب لکھتے

ہیں بلکہ بعض انگریز بھی چنانچہ صاحب بہادر نے جوانوں ایک رو بیماری بھیجی ہے تو لغا ذہ پر نواب

اسدا اللہ خاں لکھا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ نواب کے لفظ کے ساتھ میرزا یا میر نہیں لکھئے۔ یہ خلاف دستور

ہے، یا نواب اسدا اللہ خاں لکھو یا میرزا اسدا اللہ خاں لکھو اور بہادر یا نواب دونوں حال میں درست ہے۔

معلوم ہوتا ہے تفتہ نے چھپا تھا کہ ”اسد اللہ خاں“ کے بچائے محمد اسد اللہ خاں کیوں نہ لکھا جائے  
نیز نام سے پہلے ”میرزا“ لکھا جائے یا مولانا یا ”آب“۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

موصاحب نفع مبارک م، ح، م، د (یعنی محمد) کے ہر حرف پر میری جان نثار ہے مگر چونکہ یہاں سے  
ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ یعنی محمد اسد اللہ خاں نہیں لکھا جاتا میں نے بھی موقوف کو یا  
ہے۔ رہا میرزا و مولانا و آب اس میں سے تم کو اور بھائی دشمنی بنی بخش تھیں کہ اختیار ہو چکا ہو لکھو۔  
عرف کا ذکر غالب اپنے ارد و دیوان کے دیباچہ کی شر کے آخر میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-  
یارب ایس بوسے ہمتی ناشنیدہ، از غیبتی بر پیدائی نارسیدہ یعنی نقش ضمیر آمدہ نقاش کہ یہ اسد اللہ خاں  
موسوم، میرزا نوشہ معروف، بہ غالب مخلص است چنانکہ اکبر آبادی مولودہ دہلوی سکن است فرجام کا  
بخنی، مدفن باد۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو اپنے عرف کے اظہار میں تحلف نہ تھا جس زمانے میں ”دستنبو“  
چھپ رہی تھی نشی شیونرائن صاحب آرام مالک مطبع معین غلاتی نے غالب کو ایک خط بھیجا تھا جس کے  
لغات پر میرزا نوشہ صاحب غالب ”برج تھا۔ غالب کو خوف پیدا ہوا کہ کہیں ”دستنبو“ کے سورت پر بھی  
یہی عبارت برج نہ ہو جائے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :-

صاحب مطبع (نشی شیونرائن) کے خط کے لغات پر لکھا ہے ”میرزا نوشہ صاحب غالب“ نہ غور کرو  
کتنا بے جوڑ جملہ ہے ڈرتا ہوں کہ صفحہ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا غازی کا دیوان یا اردو کا یا  
پنج آہنگ یا نہ نیم و زچا پے کی کوئی کتاب اس شہر کو گھر میں نہیں پہنچی جو وہ (نشی شیونرائن) میرزا  
نام دیکھ لیتے؟ تم نے بھی میرزا نام انہیں نہ بتایا صرف اپنی نفرت عرف کے وجہ اس داویلا کی نہیں۔  
بلکہ وجہ یہ ہے کہ دہلی کے عوام کو تو عرف معلوم ہے مگر ملک سے ولایت تک یعنی وزرا کے حکم میں اور ملک  
عالیہ کے حضرات کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا پس اگر صاحب مطبع نے میرزا نوشہ لکھ دیا تو میں  
عدالت ہو گیا، کھو گیا گیا۔

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ غالب کو عرف پسند نہ تھا شاید شروع شروع میں عرف اس لئے اختیار کیا

کہہ لیا تھا کہ اس زمانے میں عرف کا عام دستور تھا۔ اور میرزا نوشہ عرف اختیار کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب کے والد میرزا عبداللہ ریگ کا عرف میرزا دولہا تھا لیکن جب نیکینوں اور شباب کی عامیانہ آرائش جونیوں کا دور گزر گیا اور طبیعت میں متانت و ثقاہت پیدا ہو گئی تو عرف سے عار آئے لگی۔

مولدے محبت | غالب نے اگرچہ ابتدائے شباب ہی میں اگرہ کو چھوڑ کر دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی لیکن اپنے مولد کی محبت ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں تیرہ ایک دفعہ اگرہ فشر لے گئے۔ غالب نے انہیں اگرہ خواجہ بھیا دیکھے اس میں اپنے مولد کے ساتھ والہیت کا کس طرحی پر اظہار کرتے ہیں:-

جان برادر! اشک واہ غالب نامرا یعنی آب و ہوائے اکبر آیا وہ شمساز کا ریادہ.....

گرفتہ کہ خود را پسند گرفته و نزدیک خود از من دور تر رفتہ آید | اچوں ہنوز دم در وطن اید ہانا کہ نزدیک با من اید شاد دم کہ شوق دور اندیش دیدہ دل را دریں سفر یہ شما فرستاد تا ہمدیں عزت داد

شادمانی دیدار وطن نیز تو از نمودار دینہارا کہ آباد را بچشم کم نگذرد | از دہ گزشتہ کسں دیا را بچشم

گوئے والا ان سرے گزشتہ کہ آں آباد پہ دران دآں ویران آباد یاد دیکھا ہم چون بھونے و ہنوز آں بقعہ را در ہر کف خاک چشمہ خستہ است | روزگار سے بود کہ در آں سہریں ہنوز بیاہرے

و بیچ نابل جز دل یارنیا | رے نسیم بیچ در آں گلکدہ پستانہ و زیدین دہارا آنا یہ از جا ہر آنجہ

کہ رنداں را ہوائے صیوچی از سر و پا رسایاں را نیت نمازا از غمیر خرو رینجے | ہر چند ہنوز دہ خاں

آں گل زمین را از تن پیاسے بود دل نہیں دہر برگ آں گلستاں را از جان در و وے بود

خاطر نشان امانا زگی وقت شمارا و نظرداشتہ چشم براہ آں دہشت کہ کے نویند و در بیچ کہ

بیچ گاہ نوز شد نہ کہ رش سنگیں دعائے مرا یہ کہ امرا دا پذیرفت و در یاد یا رخ سلاہ من

از زبان موج چہ گفت ۔

خطاب | نجم الدولہ و میرالماک نظام جنگ کا خطاب دو دو ان نمونہ کے آئری پاوشاہ برج الدین بہادر شاہ مرحوم کی طرف سے ہر چون شمسائے کولہا تھا جبکہ خاندان شاہی کی تاب نگرانی کا مستند



غالب کے جوئے کیا گیا تھا چنانچہ خود مہر نیر و زکے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

پہنچنبہ بست و سوسم شعبان سال یک ہزار و صد و شصت و شش ہجری باچارم جون سال  
 یک ہزار و شصت و صد و پنجاہ عید دی برابر .... شہنشاہ بہ شکوہ کی پنداری اقبال ہست در  
 بیت الشرف براوزنگ شستہ و من ہنشا طے کہ کوئی عطار دوست و تھیم بہ رو بردارینادہ کا  
 پرواز ان شامی بہ فرمان حضرت تل الہی بطلعت خانہ تھم ہر دند و قاسم را بطلعت شش پارچہ  
 آراستہ بہ سلام نگاہم آوردند خداوند دنیا و دین ہاں دست بخشش آئیں کہ کف آن دست  
 دریائے ہست کہ بہفت دریا کف اوست جگر گوشہ ہائے مدن یعنی حینہ و سر بیچ بہ سرم بست  
 درگ جان از نیاساں یعنی حامل مروارید بہ گردنم آویخت چاوش فخر سر و ش گہر ہائے تراویدہ  
 رگ ابرخامہ شاہ پر دین سپاہ برگوشہ بساط بارگاہ افشا ندو غالب سخن ہر سائے را بجم الدولہ و  
 دیر الملک و نظام جنگ خواند۔

تخلص | غالب نے ابتدا میں اُردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ تو اسد تخلص رکھا تھا جب فارسی میں شعر  
 کہنے شروع کئے تو غالب تخلص اختیار کیا۔ بعد ازاں اُردو میں بھی غالب ہی تخلص رہا لیکن جب انہیں  
 کسی قطع میں غالب تخلص لانے میں تکلف ہوتا تھا تو بارگاہ تخلص اسد رکھ لیتے تھے۔ چنانچہ پچیس برس کی عمر  
 کے بعد غالب نے جو اُردو وغیرہ کہیں ان میں سے دس بارہ میں تخلص اسد ہے بعض اوقات تخلص کی  
 جگہ پورا نام رکھ دیتے تھے مثلاً

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں  
 وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

یا

اسد اللہ خاں تمام ہوا،

اے دریغا وہ رند شاہد باز

تبدیل تخلص کی وجہ | تخلص کو بدلنے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بعض لوگ جو ذوق سخن سے نا آشنا

تھے میرا مانی اسد نامی ایک غیر معروف شاعر کے اشعار غالب سے منسوب کرنے لگے تھے۔ ایک مرتبہ غالب کے عزیز شاگرد منشی شیونازن آرام صاحب مطبع مفید سلاقی نے بھی میرا مانی اسد کے ایک شعر کو غالب کا شعر سمجھ کر پوری غزل مانگی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-  
بھائی حاشا تم حاشا اگر یہ غزل میری ہوج

اسد اور لینے کے دینے پڑے ہیں

اس غریب کو میں کچھ کیوں کہوں لیکن اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر نزار لعنت اس سے آگے ایک شخص نے مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلا آپ نے خوب مطلع کہا ہے ۔  
اسد اس جفا پر تیروں سے وف کی  
رے شیر شا باش رحمت خدا کی

میں نے ان سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت ، بات یہ ہے کہ ایک شخص میرا مانی اسد ہو گزرے ہیں اور یہ غزل ان کے کلام معجز نظام میں سے ہے اور تذکروں میں مرقوم ہے میں نے تو کوئی دو چار برس ابتداء میں اس شخص رکھا ہے ورنہ غالب ہی لکھتا رہا ہوں تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے میرا کلام اور ایسا مزخرف ہو؟  
لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے غالب بعد میں کبھی کبھی اس شخص فرماتے رہے۔  
مولانا آوازو نے اب حیات میں کہا ہے کہ مجھ میں کوئی خروا شیخ اسد تخلص کرتا تھا ایک دن ان کا مقطع کسی نے پڑھا ۔

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب

ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سنئے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ اور انہوں نے ۱۲۴۵ھ میں اسد امہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آزاد مروجہ کے اس بیان کو جمنے کیا ہے لیکن ۱۲۴۵ھ میں تخلص بدلنے والا بیان بدانتہا غلط ہے۔ غالب ۱۲۴۲ھ میں کالماتہ جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ وہاں انہوں نے جو غزل کہی تھی اس میں غالب تخلص استعمال کیا ہے۔

لئے جاتی ہے کہیں ایک موقع غالب

جادوہ کدش کا دین کرم ہے ہم کو

اس سے ظاہر ہے کہ وہ ۱۲۴۵ھ سے پہلے ہی اردو میں بھی غالب تخلص فرمانے لگے تھے۔

نسب خاندان | غالب قوم کے ایک ترک تھے ان کا سلسلہ نسب توران ابن فریدوں تک منتہی ہوتا ہے جب تورانیوں کا جاہ و جلال کیا نیوں کے عروج و اقبال کی آندھی میں غبار کی طرح اڑ گیا تو حکمران خاندان کے تمام بقیہ سنیف افراد اپنے وطن کو چھوڑ کر جایا منتشر ہو گئے۔ اسلامی عہد میں اس خاندان کے افراد نے پھر وہ عظیم الشان سلطنت قائم کی جو تیار بجے اور اق پر سلجوتی سلطنت کے نام سے مشہور ہے اور جس کے تاجداروں میں سے الپ ارسلان، ملک شاہ اور بنجر شہرت عام اور بقائے دوام کے تاج پہن چکے ہیں جب یہ سلطنت بھی زائل ہو گئی تو پھر افراد خاندان غربت اور لے کی طرح پریشان و منتشر ہو گئے ابھی میں سے ایک کا نام شہزادہ ترسم خاں تھا جو ترسم خاں جا بسا۔ غالب اسی ترسم خاں کی اولاد میں سے تھے۔

دادا ہندوستان آئے | غالب کے دادا غالب شاہ پادشاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور رسی پہلے لاہور میں نواب حسین الملک کے پاس ملازم ہوئے جب حسین الملک کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کی امارت کی بساط اُلٹ گئی تو غالب کے دادا لاہور سے دہلی چلے گئے جب شاہ عالم پادشاہ ہوئے اور ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں فخر الملک بن گئے تو نواب موصوف کی سرپرستی میں غالب کے دادا کو اچھی ملازمت مل گئی۔ اور پہا سو کا پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہو گیا۔ اس وقت سے غالب کے دادا نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اور غالب کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔

نشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں :-

میں قوم کا ترک سلجوتی ہوں۔ دادا میرزا دادا لہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان میں آیا۔

۱۷ غالب کے اس عرصے کے شعلی میرزا تحقیق آگے چل کر برج ہو گئی۔

سلطنت ضعیف ہو گئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے شاہ عالم کا لوگوں پر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر خاں ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہیں پایادینہ انتقال اس کے جوہر اٹھ الملوک کا ہنگامہ گرم تھا وہ علامتہ نہ رہا۔

مولوی سراج الدین احمد صاحب کو ایک فارسی خط میں لکھتے ہیں :-

ترک شادوم و نسب من بہ افرا سیاب و پشنگ پیوند و بزرگان من از انجا کہ با سلجوقیاں پیوند ہم کہی دشتند بعد دولت ایماں را بیت سروری و سپہبدی افروختند بعد سپہری شدن روزگار چاہ مندی آن گردہ چنار دانی و پیے نوالی روئے آورد و جمعے را ذوق رہبری و غارت گری آرجاے برود۔ و طائفہ را کشا و ندی پیشہ گشت نیاکان مرا بہ توران زمین شہر سر قندار امشکاہ شد از ان میانہ نیائے دوا دامن از پند و نوحیدہ آہنگ ہند کرد و بہ لاہور ہمدی مین الملک گزید، چوں باطہین الملک در نوشتند بہ دہلی آمد و با ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں بہادر پیوستہ اناس پس پدرم عبدالمندریک خاں بہ شاہ جامان آیا و بوجہ آمد و من بہ اکبر آباد۔

انور الدولہ نواب محمد سعد الدین خاں بہادر شفق رئیس کہ ورا کا پسلی کو لکھتے ہیں :-

نیائے نامہ نگار ترکی بود از شاد افرا سیاب و پشنگ از ترکستان بہ ہند روئے آورد و دلائے درمیں الملک کیہ گاہ و آراش جائے ساخت۔

مہر نیمروز کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

نیاکان نامہ نگار از تاج افرا سیاب و پشنگ بودہ اند و فرماندان باختر و فرہنگ۔ فرہ مردان چرخ ہستی نور دیدہ تور (افرا سیاب) بہ باد استین کینہ کیخسرو پشنگیاں را روز بہا پیش آورد خداوندان اورنگت یحیم را از ان برگ و ساز جنتی گندناگوں بہ کف نہ ماند، بہ مرز بوم بیکانہ روئے آوردند و بہ دست فرو تیغ زون نام خوردند ہم ایس نیتاں ایوانان کہ سانشین سلجوقیاں و گریاہ سر بہ افسر و انس رہ گوہر آراستند چرخ گردنہ چنانچہ خوشے و رستاین نامداران کا قوس کوس را نیز از پائے فکندے

در مشرب با خواہش فردوس نہ جوئی در محج ماطلح مسعود نہ یابی،

در بادہ اندیشہ ماوردیہ سینی در آتش چنگامہ مادودنہ یابی،

از واپسیان این قافلہ نیاتے سن کہ در ظلم و مآثرات سمرقند شہر اسقط الراس دے بود چوں  
بیل کہ از بالابستی آید از سمرقند بہ ہند آمد و در قتر سپہ بدشاہ، ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں  
توقیع نوکری شاہش نوشتند و بر برگندہا سوبات روزی دے و سپاہش نوشتند۔

غالب کے دادا | غالب کے دادا کا نام معلوم نہیں ہو سکا نہ یہ معلوم ہے کہ انہوں نے کب انتقال کیا خواہ  
حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ ان کی زبان ترکی تھی نیز ان کے متغذ و میٹھے تھے جن میں سے صرف دو کے نام  
معلوم ہیں ایک میرزا عبداللہ بیگ خاں عرف میرزا دولہا (غالب کے پدر بزرگوار) و دوسرے میرزا ناصر اللہ  
بیگ خاں (غالب کے عم محترم)۔

غالب کا یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ ان کے دادا شاہ عالم کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اس لئے  
کہ شاہ عالم کی پادشاہی کا زمانہ ۱۷۰۷ء سے شروع ہوتا ہے اور نواب حسین الملک جن کے پاس غالب  
کے دادا لاہور میں ملازم ہونے لگے ۱۷۰۷ء میں انتقال کر گئے تھے۔ لہذا ماننا پڑے گا کہ غالب کے دادا شاہ  
عہد میں ہندوستان آئے۔ غالب کا یہ بیان غالباً خاندانی روایات پر مبنی ہے۔ نواب حسین الملک کی  
وفات اور شاہ عالم کی تخت نشینی کے سنیں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس بیان کی تصحیح نہ کر سکے۔

نسب پر خیر | غالب نے اپنے نسب پر جابجا فخر کیا ہے۔ وہ کبھی اپنے آپ کو افراسیاب بنی اور پڑی کہتے ہیں  
کبھی ”دودہ زاد ششم“ میں سے ہونے پر اتراتے ہیں کبھی اپنے آپ کو بلوچی اور تورانی بتاتے ہیں کبھی ایک  
ہونے پر فخر کرتے ہیں مثلاً

غالب از خاک پاک تو نہ ایم لاجرم در نسب منہر ہندیم

ترک زادیم و در نژاد ہے یہ سترگان قوم ہندیم

ایک ہم از جماعت تراک در تہمای زماہ وہ ہندیم

ملہ پنگا افراسیاب باپ ملہ زاد ششم افراسیاب کا دادا۔ ۱۷۰۷ء ایک کرستے لے اور کستے ہمنی ماہ کامل ۱۲

فن آبائے ماکشا و زری است  
مرزباں زادہ مسوقندیم

پھر فرماتے ہیں :-

ساتی چون پشنگی و ہنس را سیاہیم      دانی کہ اصل گوہرم از دودہ جم است  
میراثِ جم کہ ہے بود اکنوں بہمن سپار      زان پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است  
نہرِ دودہ کے دیا پہ میں اپنے نسب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-  
غالب یہ گہر ز دودہ زاد ششم      زان رو بیٹھے دم تیغ است و دم  
چوں فت سپیدی ز دم چپک شعور      رشیدیہ شکستہ نیا کاں تسلیم  
بہادر شاہ کے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں :-

سلو تسیم بہ گوہر و خاقانیسم بہ فن

توقیع من بہ سنجہ و خاقاں برابر است

اتما بزرگ شیرازی تخلص بہ وفا کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

غلیجسم ولے لوز چشم محیلم      غریبسم ولے روشناسِ جہانم  
یہ مضمار دعوئے خداوند رستم      در تسلیم معنی ہاں پہلو نم  
گرفتہ کہ از تخنیم اغرا سیاہم      گرفتہ کہ از نسل سلجوقیتا نم  
دل و دست تیغ آزمائی نہ دارم      رہ و رسم کشور کشائی نہ دارم  
چہل سال توقیع معنی بہ شتم      سہر دگر دلیہ صند صاحب قرا نم  
سہرون کے قصیدہ میں ذوق کی تنک جو ملگی ہنجن ناہمی اور ادانا شناسی سے جو ناگوار  
صورت حالات پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالہ کے لئے غالب نے اردو میں ایک قطعہ لکھا تھا جو  
نیاں ز دعوام ہے۔ اس کا ایک شعر یہ ہے :-

سو پست سے ہے پیشہ آباسپہ گری      کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں بھے

غالب کے اجداد کی جو کیفیت اور پر بیان ہو چکی ہے اسے مد نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ صرفاً فائدہ رست ہے اور اسے عام شاعرانہ مبالغہ یا خالی سخن گسٹری پھول نہیں ہونا چاہیے۔

اپنے ہم قوموں کے متعلق نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو لکھتے ہیں:-  
 سبحان اللہ اکثر امور میں تم کو ہم طالع پاتا ہوں۔ عزیزوں کی ہمت کشی اور رشتہ داروں سے مانگو  
 میلہ ہم قوم تو سراستہ مہذب نہیں۔ بہر تقدیر دوچار اور دشت خفاقی میں سودو سو بہوں گے ہمارے  
 اقربائے سبھی ہیں۔

غالب کے والد ماجد | غالب کے دادا کی وفات کے بعد ان کے والد عبداللہ بیگ خاں اور چچا نظر اللہ بیگ خاں اپنے آبائی پیشے یعنی سپہگسی میں مصروف رہے۔ دونوں میں سے کسی کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمریں کیا تھیں۔ لیکن چونکہ دونو غالب کی کم عمری میں فوت ہوئے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ ان کی عمریں تین تیس برس سے متجاوز نہ ہوں گی۔

غالب کے والد پہلے لکھنؤ میں آصف الدولہ کے پاس نوکر ہوئے پھر حیدر آباد چلے گئے اور نظام علی خاں کے پاس تین سو سواروں کی جمعیۃ کے ساتھ ملازم رہے۔ یہ ملازمت جاتی رہی تو اگرچہ چلے آئے جہاں ان کی شادخی اچھ غلام میں کیدان کی صاحبزادی سے ہو چکی تھی۔ اگرچہ سے راجہ بننا و سنگھ والی الور کے پاس بغرض ملازمت پہنچے لیکن کوئی ضرورت مدعا براری پیدا نہ ہوئی۔ مایوس ہو کر واپس ہو رہے تھے کہ الور کا ایک زمیندار راجہ سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی سرکوبی کے لئے جو فوج بھیجی گئی اس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں کا دستہ بھی شامل کر دیا گیا راجہ گڑھ کے مقام پر پرکاش زمیندار کے ساتھ جھپٹش ہوئی جس میں میرزا عبداللہ بیگ خاں گولی کھا کر شہید ہو گئے۔ اور وہیں انہیں دفن کیا گیا۔ یہ غالباً ۱۸۵۲ء کا واقعہ ہے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف پانچ برس کی تھی۔ راجہ شیو دھیان سنگھ والی الور کی مدد میں غالب نے جو قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے

فرماتے ہیں :-

زاکس کہ گشت گوہر میں درجہاں مہم زاکس کہ گشت شد پدیرمن بہ کا نزار

دیر پنج سالگی شدہ ام چا کر حضور  
 نہیں سخن طرازم و دیریں لطیفہ خوار  
 دارم بہ گوش حلقہ زنجیہ و ہشت سال  
 اکڑوں کہ عمر شصت سے سال است در  
 باید شنید را ز زعمان بارگاہ  
 باید شصت قصہ پیران آں دیار  
 کافی بود مشاہدہ شاہد ضرورت  
 در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار  
 غشی حبیب اللہ خاں ذکا جید را بادی کو لکھتے ہیں:-

باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا ذکر رہا۔ بعد چند روز جید را باڈو  
 نو نظام ملی خاں کا ذکر ہوا تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا کسی بدس دہان رہا۔ وہ نوکری  
 ایک خانہ بنگی کے کھیلے میں جاتی تھی۔ والد نے گھبرا کر الود کا قصد کیا۔ راؤ را جانچا و سنا گئے  
 کا ذکر ہوا وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔

عبد اللہ بیگ خاں نے دولٹر کے چھوڑے، ایک اسد اللہ خاں غالب دوسرے پورنٹ  
 جو غالب سے دوبرس چھوٹے تھے۔ غالب نے ایک موقع پر بہن کا ذکر بھی کیا ہے لیکن حقیقتہً ان کی کوئی  
 حقیقی بہن نہ تھی ممکن ہے یہ ذکر رشتہ کی کسی بہن کا ہو۔

غالب کے عم محترم عبد اللہ بیگ خاں کی دروناک موت کے بعد ان کے بچوں کی کفالت نصر  
 بیگ خاں سے متعلق ہو گئی۔ وہ پہلے مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے لیکن جب آگرہ  
 انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو صوبیداری کشنری بن گئی اور کشنری ایک انگریز مقرر ہو گیا۔ نصر الدولہ  
 ولادور الملک نواب احمد بخش بہادر رستم جنگ رئیس فیروز پور جیکر دجاگیر دار لوہارو کو انگریزوں کے ہاں  
 بڑا اعتماد حاصل تھا۔ ان کی ہمیشہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں سے مشورہ تھیں۔ انہوں نے لارڈ لیکس  
 کہہ کر نصر اللہ بیگ خاں کو انگریزی فوج میں رسالہ داری کا منصب دلا دیا۔ اور ان کی ذات اور  
 رسالے کے لئے نو اجی آگرہ کے دو پرگنے سونک اور سوٹا مقرر کر دیئے۔ ۱۸۴۸ء میں دفعہً  
 ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت غالب کی عمر صرف نو برس کی تھی حبیب اللہ خاں ذکا کو غالب نے

لیجسلیٹو کونسل میں سال ۱۸۸۱ء میں نواب احمد بخش خاں نے درج ذیل تین دفعہ ۱۲



نصرت اللہ بیگ خاں میرا جی چھا مہٹوں کی طرف سے اکیرا باد کا صوبیدار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔  
 ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک کاٹل ہوا۔ صوبیداری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر  
 ہوا۔ یہی ہے جی کہ جرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سوار کا برگیدہ مقرر ہوا۔ ایک ہزار  
 روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر میں حیات علاوہ مرزبانی کے تھی۔ کہہ کر  
 ناگاہ مر گیا۔ رسالہ طرف ہو گیا۔ ملک کے عوض نقدی مقرر ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں۔

چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

میں پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میسرادہر کے  
 شکر کا جھتی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے  
 انہوں نے ندیے لکرتین ہزار روپے سال۔

مولوی سراج الدین احمد خاں کو ایک فارسی مکتوب میں رقم فرماتے ہیں :-

پنج سال از عمر من گذشت، پیداد رسم سایہ برگرفت عم من نصرت اللہ بیگ خاں چوں بخت  
 کہ مرا بنام ز پروردگار مگرش فرازا مکملایش پنج سال بعد گذشتن برادر پے عین برادر برداشت و مرا  
 دیرس خراہ تنہا گذشت و اس حادثہ کہ مرانشان جاں گدازی و گردول را کہینہ یازی بود در سال  
 ہزار و ہشت صد و شش عیسوی (۱۸۰۶ء) بہ ہنگام شکر آرائی و شکر کشانی صمصام اللہ ولی جرنیل  
 لارڈ لیک صاحب بہادر بردے کا رآمد چوں عم مرحوم از دولتیاں دولت اہل فرنگ بود۔ و با

(بقیہ صفحہ ۱۲) کو سرکار انگریزی سے لارڈ لیک نے جاگیر کی دو سندیں دلائی تھیں پہلی ۲۲ ستمبر ۱۸۰۶ء کو  
 دوسری ۲۴ مارچ ۱۸۰۶ء کو۔ یہی ۱۸۰۶ء کو حکومت کی تجویز کے مطابق ایک شفقہ نواب احمد بخش خاں کو لکھا گیا تھا۔  
 جس میں نصرت اللہ بیگ خاں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا گیا تھا کہ کہنی بہادر کو ان کے متعلقین کی پرورش منطوق  
 اور اس سلسلے میں نواب صاحب کی جاگیر پر پچیس ہزار روپے کی جو رقم مقرر کی تھی اس میں سے دس ہزار کی رقم نصرت اللہ  
 بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش کے سلسلے میں معاف کر دی تھی پندرہ ہزار کی رقم پچیس سواروں کے سلسلے میں معاف  
 کر دی تھی جو نصرت اللہ بیگ خاں نے مقرر کئے تھے اس سے ظاہر ہو کہ نصرت اللہ بیگ خاں کا انتقال ۲۴ مارچ ۱۸۰۶ء اور ۲۲ ستمبر ۱۸۰۶ء کے  
 درمیان ہوا

انہوں نے چار صد سوار پر کابھہ صوامیہ الدولہ (لارڈ لیک) یا سرکشاں سرگرم جنگ۔ وہم و گمنا  
 سرکار انگریزی دو پرگنہ سیرجھال از مضافات اکبر آباد در جاگیر دشت سرکار انگلیشیہ پرچوں بہا  
 آفتاب کابھہ تارکدا بیان را چرخ دماہی ذایان را بہ عوض جاگیر ہر مشاہرہ از عمارت حاجت سے  
 وجہ معاش فراخ بخشید و ما امر و نہ کہ شمارہ نفس شماری زندگانی پہل و چار رسد براں را تر بنیم  
 وہاں مایہ قلی۔

غالب نے کسی جگہ بھی صراحت نہیں لکھا کہ چچا کی موت کس طرح واقع ہوئی محمولہ بالا تحریر سے صرف یہ ظاہر  
 ہوتا ہے کہ اول موت ناگاہ ہوئی و دوم اس حالت میں ہوئی تھی کہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں لارڈ لیک کے ہمراہ  
 سرکشاں سے سرگرم جنگ تھے۔ لفظ "خون بہا" سے یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید نصر اللہ بیگ خاں بھی شہید  
 ہوئے لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں اس کے لئے کوئی شہادت نہیں مل سکی۔ بہر حال غلام  
 کے والد اور چچا چار سال کے اندر اندر یکے بعد دیگرے رہ گئے عالم تھا ہو گئے۔ اور لارڈ لیک نے  
 ان کے چچا کی وفات کے بعد دس ہزار روپے سالانہ کی نقد معاش شمال جاگیر نواب احمد بخش خاں  
 مرحوم و متوفی خاندان کے پس ماندوں کے لئے مقرر کر دی لیکن نواب احمد بخش خاں نے تین ہزار  
 روپے سال سے زیادہ نہ دیئے جن میں سے غالب کے حصے کی رقم ساڑھے سات سو روپے سالانہ  
 تھی۔ اس فنڈ کا تفصیلی ذکر دوسری جگہ آئے گا۔

غالب کے نانا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کبیدان تھے جو خواجہ حالی مرحوم کے بیان کے مطابق  
 سرکار شیر پور کے مغز فوجی افسر اور آگرہ کے عامل میں سے تھے۔ ان کی دولت اور وسعت جائداد  
 کا اندازہ اُدوتے محلے کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو غالب نے خشی شیوڑاؤن آرام مالک مطیع ہند  
 خلاق کو لکھا تھا فرماتے ہیں :-

مگر کہ ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے مجھ سے سنو  
 دادا کے والد غنی خاں ایرا نہیں سکتے تانا صاحب خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق تھے۔  
 جب میرے نانا نے نوکری ترک کیا تو ٹھٹھٹھ تہہ ہمارے پردہ دانے یعنی کمر کول دی او بھر

کئیں نوکری نہ کی یہ باتیں میرے ہوش سے پہلے کی ہیں۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے دیکھا کہ منشی منشی دھڑنشی شیونرائن کے دادا خاں صاحب (خواجہ غلام حسین خاں) کے ساتھ ہیں۔ اور انہوں نے کچھ قیمتی گاؤں اپنی جاگیر کا سرکاریں دعوے کیا تو منشی منشی دھڑا اس امر کے منصرم ہیں اور وکالت اور مختاری کرتے ہیں میں اور وہ دھڑنشی منشی دھڑا ہم عمر تھے۔ شاید منشی منشی دھڑا سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں انہیں میں برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت۔ آدمی آدمی رات گزر جاتی تھی چونکہ گھرانہ کا بہت دور تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے میں ہمارے اور ان کے مکان میں مچھیا رندی کا گھروں ہمارے دو کمرے <sup>کچھ عیال</sup> میں تھے۔ ہماری بڑی چوٹی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھمی چند نے مول لی ہے۔ اس کے دروازے کی سنگین بارہ دری پیر کی تھی۔ اور پاس اس کے ایک کھیا والی چوٹی اور سلیم شاہ کے کیکہ کے پاس دوسری چوٹی۔ اور کائے مل سے لگی ہوئی ایک اور چوٹی۔ اور اس کے آگے بڑھ کر ایک اور کٹروہ کہ وہ گدگدوں والا مشہور تھا۔ اور ایک کٹروہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹروے کے ایک کوسٹے پر پنگ پنگ مڑا تھا۔ اور راجا بلوان سنگھ سے پنگ پنگ لڑا کرتے تھے۔ وائل خاں نامی ایک سپاہی ہمارے دادا کا چٹا رتھا تھا وہ کٹروں کا لبادہ لگا کر ان کے پاس جمع کرتا تھا سنو تو سہی تمہارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔ ملائے مول لئے تھے اور زیندارہ اپنا کر لیا تھا۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مالگنداری اور کرتا تھا۔

خواجہ عالی مرحوم نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ جس سرکار (خواجہ غلام حسین خاں) کے سنبھل دس دس ہزار روپے کے مالگزار بن گئے تھے اس کے بڑے ہونے میں کیا شبہ ہے۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے والد بزرگوار اگر وہ میں بطور خانہ دادا کے رہتے تھے۔ اس لئے کہ غالب نے اپنے نانا ہی کے املاک کو اپنے املاک ظاہر کیا ہے یا اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ والد اور چچا کی وفات کے بعد غالب اپنے نانا ہی کے ہاں رہتے تھے خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب غالب نے دہلی میں سکونت اختیار کی تھی تو ان کے نانا کے بعض املاک فروخت ہو گئے

تھے۔ یا خود غالب نے وہ املاک فروخت کر دیئے تھے۔ جنہاں کی طرف سے انہیں ملے تھے۔  
 خاندانی عظمت | یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب کا خاندان بہت اونچا تھا۔ ان کے چچا کی تنخواہ بارہ ہزار  
 سالانہ تھی۔ جاگیر لاکھ ڈیڑھ لاکھ کی تھی۔ ان کے والد کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کی صاحبزادی  
 سے ہوئی تھی۔ ان کے چچا نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ہمیشہ سے منسوب تھے۔ غالب اس آخری  
 رشتے ہی کی وجہ سے غالب کی شادی نواب احمد بخش خاں کے برادر کوچک نواب الہی بخش خاں  
 کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔

یتیمی اور حکمت الہی | میرزا خاں ہے کہ اگر غالب کے باپ اور چچا کا سایہ کبھی اور کم عمری میں سرس نہ اٹھ  
 جاتا تو بظاہر کوئی امکان نہ تھا کہ انہیں سپہگیری کے آبائی پیشہ کو چھوڑ کر پوری زندگی ادب و شعر  
 کی خدمت میں وقف کرنے کا موقع ملتا۔ اگر باپ یا چچا زیادہ دیر تک زندہ رہتے تو اغلب یہی ہے  
 کہ شاعری کا یہ گنج گرانمایہ سپہگیری کی نذر ہو جاتا لیکن قدرت اس نادر روزگار وجود سے دوسرا کام  
 لینا چاہتی تھی۔ لہذا جو ہستیاں غالب کو آبائی پیشہ میں لگنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتی تھیں وہ  
 غالب کے ہوش سمجھانے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ سپہگیری میں غالب بڑی سے بڑی ترقی  
 کرتے تو اپنے چچا کی طرح رسالہ اریا اپنے نانا کی طرح کبیران بن جاتے۔ لیکن ادب و شعر میں انہیں  
 پایہ حافل ہو جو سلطنت و مابعداری میں افراسیاب، اظفر، سنجراپ، ارسلان اور ملک شاہ کے  
 حافل کیا۔ آج تو ہم خاں عبداللہ بیگ خاں، نصر اللہ بیگ خاں اور خواجہ غلام حسین خاں کے  
 ناموں سے ہم صرف اس لئے روشناس ہیں کہ وہ غالب کے بزرگ تھے۔ ورنہ ایسے ہزاروں لاکھوں  
 آدمی ہر عہد میں ہو گزرے ہیں جن کے نام بھی دواوین سیر و سوانح میں اندراج کے شایاں نہیں  
 سمجھے گئے۔

اہل خاندان | یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کے  
 اور کون کون سے رشتہ دار موجود تھے؟ اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ چچا کی وفات کے بعد غالب کے  
 خاندان کے لئے دس ہزار روپے کی معاش مقرر ہوئی تھی جس میں سے نواب احمد بخش مرحوم

صرف تین سزار سالانہ کی رقم دی اس میں سے غالب کا حصہ ساڑھے سات سو تھا ساڑھے سات سو ان کے بھائی یوسف خاں کو ملتے تھے۔ دہلی ریڈنسی کے چوپرائے ریکارڈ حکومت پنجاب کے ریڈن آفس میں محفوظ ہیں ان میں غالب کی فیشن کے متعلق بھی بعض کاغذات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ پندرہ سو روپے نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ یعنی غالب کی وادی اور نصر اللہ بیگ خاں کی تین بہنوں یعنی غالب کی چھ بھٹیوں کو ملتے تھے دو سرشتہ داروں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ جب غالب دہلی میں سکونت پذیر ہو چکے تھے تو ان کی والدہ اس وقت بھی زندہ تھیں اور وقتاً فوقتاً مالی امداد فرماتی تھیں چنانچہ ذوالعین خاں والی لوبار کو ایک خط میں اپنی مالی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ہاں ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی اور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا۔

تعمیر غالب کے عطفی کے حالات تفصیلاً معلوم نہیں ہو سکے لیکن اتنا ظاہر ہے کہ اس عہد کے عام امیر جوہن کی طرح ان کی زندگی باطل لاؤ بالی تھی۔ وہ شہنشاہ اور چور سرکھلتے تھے۔ پتنگ اڑاتے تھے، یاروں اور دوستوں کے جھگڑوں میں بے فکری کی زندگی بسر کرتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ وہ شیخ معظم سے پڑھتے تھے جو اس زمانے میں آگرہ کے مشہور معلموں میں سے تھے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوئی۔ چودہ برس کی عمر میں جب ایک مسلم پارسی سیاحت کرتا ہوا آگرہ پہنچا اور دو برس غالب کے مکان میں مقیم رہا۔ اس کا ابتدائی نام ہرمزد تھا۔ اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا۔ یہ خارجی اور عربی کا بہتر عالم تھا۔ زمانہ قیام آگرہ میں اس نے غالب کی تعلیم پر خاص توجہ صرف کی۔ خارجی کے تمام اصول و قواعد پوری طرح ذہن نشین کر لئے۔ ملا عبدالصمد کے دل پر غالب کی جودت طبع، ذکاوت اور بالغ نظری کا آئنا گہرا اثر تھا کہ ہندوستان سے چلے جانے کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفہ مہم کے بیان کے مطابق ایک تہذیبی صاحب نے غالب کے لکھے خط اسے عزیز کسی کہ باجوہ و نادیدہ گاہ گاہ بہ خاطرے گزری۔

لاحظہ ہو ناظر برائے صفحہ غالب کے خط و کتابت کہ ملا عبدالصمد ۱۲۲۳ میں آگرہ آئے اور دو برس میرے پاس رہے ۱۲

غالب کی فارسی دانی کی بنیاد و اساس ملا عبد الصمد کی تعلیم ہی تھی۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ غالب لکھتی فارسی کے جو طرز میں ڈبکیاں لگانے کے بجائے اہل زبان کی فارسی کے دریا کے شاد و رہن گئے۔ ہندوستانی اکیڈمی صوبہ متحدہ کے سہ ماہی رسالہ ہندوستانی "بابت جنوری ۱۹۳۳ء" میں غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط بنا مولوی ضیاء الدین صاحب ضیاء دہلوی انبیہ ذاب صاحب لکھنؤ دارا پور چھاپا تھا اس کے آغاز میں غالب اپنی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں :-

میں نے ایام دبستان میں میں شرح مائتہ عامل تک پڑھا بعد اس کے مولود لکھنؤ اور آگے بڑھ کر فن و فنون و عشرت میں مہمک ہو گیا۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور شعر و سخن کا ذوق فطری طبعی تھا تاہم ایک شخص کے سارنگی کی نسل میں سے مہند منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور موسیٰ احمد صدیقی صافی تھا میرے شہزادہ گروہ میں وارد ہوا۔ اور مطالعت فارسی بحجت (خالص فارسی بے آمیزش عربی) اور غزلس فارسی آئینہ عربی کے میرے حالی ہوئے سونا کسوٹی پر چڑھ گیا۔ ذہن سے بچ نہ تھا زبان درسی سے پوندازی اور استاد سے بہانہ جانا آپ عہد و بزرگ مصرعہ تھا حقیقت اس زبان کی دشمنی و غلط نشان ہو گئی۔

شاعری میں غالب کو کسی سے تلمذ نہ تھا۔ ملا عبد الصمد سے فارسی پڑھی اور اس کے اصول و قواعد سیکھے۔

لیکن شعر گوئی میں مبداء فیاض کے سوا وہ کسی کے منت پذیر نہ ہوئے۔

غالب کی مختلف تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں فارسی زبان کی صرف و نحو و تاریخ پر کامل عبور تھا۔ وہ عربی سے اچھی طرح واقف تھے۔ نجوم جانتے تھے یقین کی اکثر کتابیں دیکھ چکے تھے طب سے بھی واقف تھے جناب محمد عبدالرزاق صاحب راشد مددگار متحدہ فیئانس دولت اصفیہ نے ۱۶ فروری ۱۹۳۶ء کو غالب کے حالات کے متعلق جو تقریر لکھی کے ذریعہ سے نشر کی اس میں وہ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر سپد قاسم صاحب (پتھر ٹھی جید آباد) کے کتب خانہ کی کتابیں دیکھتے وقت طب کی ایک کتاب میری نظر سے گزری جس کا نام ذخیرہ دولت شامی ہے۔ اس کتاب کی تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۲ جمادی الاول ۱۲۳۳ھ کو مصنف نے احمد شاہ پادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی تھی اور رمضان کو اسے شامی کتب خانہ میں داخل کرنے کا حکم ہوا لیکن کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالب کے مطالعہ میں بھی رہی ہے۔ کتاب پر پادشاہ کی تہ کے علاوہ غالب کی بھی مہر ہے جس میں غالب کے نام کے علاوہ یہ شعر بھی ہے

بہارِ شمس کے مطابق یہ بات پانچ اعتبار سے درست ہے۔

رضینا قسمت الجہاد فینا

لنا حکم و الجہال مال

یہ پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کتاب غالب کے پاس کیوں کو پہنچی لیکن اکثر صفحات کے حاشیوں پر غالب کی تحریریں  
موجود ہیں بعض میں مصنف کے اختلاف کیا ہے بعض میں اس کی معلومات پر اضافہ کیا ہے کہیں کسی مرض کا حال لکھا  
کہیں دوا کے استعمال کے ساتھ پرہیز کے لئے اغذیہ کے نام لکھے ہیں۔ اگر حاشیوں کی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا جائے تو  
فن طب کا ایک رسالہ ہو جائے۔ (درہ زمانہ صحیفہ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۳۶ء)

فن طب کے غالب کی واقفیت کے بعض شواہد ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں لیکن جناب عبدالرزاق حسنا  
کی تقریر میں احمد شاہ بادشاہ کا نام یا ۱۲۳۳ھ کی تاریخ میں سے کسی ایک کو غلط ماننا ضروری تھا ۱۲۳۳ھ میں اکثر  
ثانی بادشاہ تھے۔ احمد شاہ محمد شاہ کی وفات پر ۱۲۴۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا۔ مطابح ۱۱۶۳ھ  
اسراف اور عرض | مولوی ضیاء دہلوی دس خط سے ظاہر ہے کہ درس تدریس ابتدائی حالت میں تھی۔ اسی اثنا میں جناب  
لمر و معرب ہنس و خوجو عیش و طرب میں منہمک ہو گئے۔ ملا عبد الصمد کی صحبت نے فارسی زبان کے فطری ذوق کو  
جلادے دی۔ اس کے قواعد و اساسات ذہن نشین ہو گئے۔ رندی اسراف پنج ہوئی اور اسراف نے انہی فن  
کا عادی بنا دیا۔ ذواب علامہ الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط سے مترشح ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ ہی سے  
قرض لینا شروع کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں:-

بھائی (ذواب ابن الدین احمد خاں والی لوٹارو) کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ تھیں

کہ ادھر قہر ادا اس سے قرض لیا اور ہر باری ل کو مارا اور خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ہر

ایکے پاس تنک ٹری موجود تھا لگاؤ چاٹو نہ مول نہ سوو

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے رشتہ دار بہت کافی مالی امداد دیتے تھے مثلاً وہ خود لکھتے ہیں

اس سے بڑھ کر یہ کہ روٹی کا بیج باطل بھو بی کے سراپاں کہ بھی خاں نے کچھ دے دیا کبھی اور سے کچھ دوا یا کبھی اس نے

کچھ اگر سے بھیج دیا اب میں اور با سٹھ روپے لکھری کے، سو روپے رام پور کے۔

میرزا اور سب خاں | غالب کے دہلی چلے آنے کے بعد ان کے بھائی میرزا یوسف خاں نے بھی دہلی میں مستقل





دریغ آن که اندر دنگ نیست      شدہ شاد و سیالی ناشاد است

تغاک بالیں زخشتش نہ بود      بجز خاک در سر و شستش نہ بود

تھلا براہیں مروہ بختش      کہ نادید و ز ریت آسانست

سروشے بہ دلجوئی او فرست      روانش بہ جادو یمن و فرست

تاریخ وفات یوسف خاں | یعنی ساٹھ برس (بحساب سنین قمری) کی زندگی ہوئی جس میں سے تیس سال شادمانی میں گزرے اور تیس سال ناشادمانی و ناخوشی میں بسر ہوئے۔ میرزا یوسف کا انتقال ۲۹ صفر ۱۲۶۴ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ غالب نے تاریخ وفات لکھی :-

رسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف      کہ زیتے بہ جہان سرخوش بیگانہ

یکے در سخن از من ہے شرویش      کشیدم آہے و گھنم توین دیوانہ

دوین دیوانہ کے اعداؤں سے آہے کے اعداؤ کا تخریب کرنے سے تاریخ نکلتی ہے۔

یوسف خاں کی اولاد | میرزا یوسف خاں کی صاحبزادی کے چار بچے تھے ان کے مشہور غلام فخر الدین خاں (ابن میرزا علی بخش) عذر سے قبل بادشاہ کی جاگیر کوٹ قاسم سے منظم تھے! اور بادشاہ کی ہدایات کے مطابق عذر کے دفتروں میں بھی رہ رہتے تھے۔ عذر کے بعد ان پر بھی مقدمہ بنایا لیکن انجام کار وہ بری ہو گئے۔ بعد ازاں حیدر آباد چلے گئے وہاں کچھ بڑے بزرگ مقرب ہو گئے۔ غلام فخر الدین خاں کے صاحبزادے میرزا محمد سعید خاں تھے جنہوں نے ابتدائیں ملازمت اختیار کی مگر بعد ازاں درویش بن گئے اور بائیس برس گوشہ نشینی اور یاد الہی میں بسر کر دیے۔ وہ بعد وفات محلہ مستعد پورہ حیدر آباد میں دفن ہوئے ان کے صاحبزادے میرزا نصر اللہ خاں بیرٹلرٹ لارنس قریب آباد میں صدر محاسبی کے عہدہ علیحدہ پر فائز ہیں۔ بھتیجی کی پرورش کا اضطراب | غالب کو اپنی بھتیجی اور اس کے بچوں کی پرورش کا بڑا خیال تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

حقیقی میرزا ایک بھائی دیر انداز میرزا اس کی بیٹی، اس کے چار بچے، اس کی ماں میری بھانج ہے جو میں بڑے ہوئے

ہیں اس میں میں بھی (یعنی عذر کے بعد) ایک روپیہ ان کو انہیں بھیجا، بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی چچا ہے۔

غلام فخر الدین کے مقدمے کے دوران میں بھی غالب بڑے مضطرب تھے! وجہ انہوں نے رانی پائی تو غلام

لئے خوش ہوئے کہ اسے غلام فخر الدین کی نئی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں (دراودے صفحہ ۱۸۲)

## دوسرا باب شادی، خانگی زندگی اور متعلقین

بکاشی لختے از کاشانہ یاد آو دریں جنت ازاں ویرانہ یاد آو  
دربغا در وطن و اماندہ چند، بخون دیدہ زورق راندہ چند  
ہوس را پائے درد اہن شکستہ بامید تو چشم از خویش بستہ

شادی | غالب کی شادی، رجب ۱۲۲۵ھ کو ٹھیک تیرہ برس کی عمر میں نواب الہی بخش خاں معروف کی چھوٹی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ نواب علارالدین احمد خاں کے جس مکتوب میں وہ اپنی جیات مستعار عالم ارواح کی گناہ کاری کی سزا قرار دیتے ہیں اس میں فرماتے ہیں :-

۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا دینی کتم عدم مت معزز وجود میں آیا تیرہ برس حالات میں ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام میں صا در ہوا۔ ایک بیٹی میرے پاؤں میں ڈال دی۔ وہی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا غم فشر کو شقت ٹھہرایا۔ ظاہر ہے کہ اس خط میں حکم دوام میں سے مراد شادی اور بیٹی سے مراد بیوی ہے۔ ہر گویا تقفہ نے اپنے اور غالب کے مشترک دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال کی اطلاع دی تھی۔ اس کے جواب میں غالب ۱۹ دسمبر ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے زنگ آیا۔ اللہ اشد ایک وہ ہیں کہ دوبار ان کی پٹریاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک دو پر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا لگے میں پڑا ہے نہ پھندا ہی ٹوٹا ہے نہ وہ جی بھگتا ہے۔

سن قمری کے حساب سے یہ خط ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا تھا بلکہ ۱۲۷۱ھ میں سے اکا دن بحال دیتے ہیں نو ۱۲۶۵ھ رہ جاتے ہیں گویا اس مکتوب سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی شادی ۱۲۲۵ھ میں ہی ہوئی غالب کے خسر نواب الہی بخش خاں معروف شہر جو فخر الدہ ولد اور ایک نواب احمد بخش خاں

رستم جنگ والی فیروز پور بھر کر دیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنی تمام عمر گوشہ نشینی اور عبادت گزار میں بسر کی۔ نواب احمد بخش خاں اگرچہ عمر میں بڑے تھے مگر چھوٹے بھائی کے زہد و اتقا کے باعث ان کی بڑی عزت اور بڑا احترام کرتے تھے۔ معروف اچھے شاعر تھے۔ شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان حال ہی میں شاہ عبدالحمید قادری بدایونی کی کوشش سے شائع ہوا ہے ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں رہگڑھے عالم ٹکھا ہوئے۔ اور غازی نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرہ کے پاس اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں بعد ازاں غالب سپرد خاک ہوئے۔ مولانا آزاد نے اُستاد پرستی کے جو میں معروف کے کمالات کو بھی ذوق کی تراوش طبع کا نتیجہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

معروف کی اولاد | نواب الہی بخش خاں معروف کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، یہیں صرف ایک بیٹے میرزا علی بخش خاں رنجور کے متعلق زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے بیٹے میرزا علی نواز خاں کا صرف نام معلوم ہے۔ ان کی نسبت اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ بیٹیوں میں سے بڑی کا نام بنیادی گیم تھا جو نواب غلام حسین صاحب مسرور سے بیاہی گئی تھیں۔ چھوٹی بیٹی کا نام امراؤ گیم تھا۔ جو غالب کی رفیقہ حیات تھیں۔ امراؤ گیم کی عمر امراؤ گیم غالب کے دو برس چھوٹی تھیں جیسا کہ خود غالب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ اندر سے دو تین برس بعد بیٹی میں ہریضہ کی وبا پھیل گئی تھی۔ میر محمدی مجروح نے جو اس زمانے میں غالباً اولیں تھے۔ غالب سے وبا کی کیفیت پوچھی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کہ ہے یا زیادہ ایک جیسا سٹھ برس کا مرد (غالب) اور ایک سٹھ

برس کی عورت (گیم صاحبہ غالب) ان دونوں میں سے ایک بھی مرنا تو ہم جانتے کہ وبا تھی اُٹھ بریں وبا

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی کے وقت امراؤ گیم کی عمر گیارہ برس کی تھی۔ اور ان کا سن

ولادت ۱۲۱۴ھ تھا۔

علی بخش خاں رنجور | علی بخش خاں رنجور بن نواب الہی بخش خاں معروف غالب کے چار برس چھوٹے تھے۔

غالب خود نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا میں ۱۲۱۴ھ میں پیدا ہوا ایک رجب کے پینے سے نہ ہوا

برس شروع ہو گیا، اس نے (علی بخش خاں نے) چچیا سٹھ برس کی عمر بائی۔

غالب کے ساتھ علی بخش خاں کے تعلقات و روابط ہمیشہ بہت اچھے اور خوشگوار رہے۔ غالب نے

کلکتہ جاکر اپنی فن کے سلسلے میں جو چاہہ جوئی کی تھی اس میں بھی علی بخش خاں ان کے خاص ہمارو معاون تھے۔ اس باب میں غالب نے انہیں کلکتہ سے جو خط لکھے ان مفصل نوکرتیشن کے سلسلے میں آئے گا۔ غالب کی فارسی شری مشہور کتاب ”پنج آہنگ“ علی بخش خاں ہی کے ایما پر لکھی گئی تھی جیسا کہ وہ خود ”پنج آہنگ“ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ ہم تفصیلات غالب کی تصانیف کے باب میں پیش کریں گے۔

کلکتہ جاتے ہوئے غالب کو راستے میں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی اطلاع ملی تھی، اور سب سے پہلے علی بخش خاں ہی خیال پیدا ہوا تھا۔ وہ خود کلکتہ سے نواب احمد بخش خاں کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :-

از جانب شامہ اندیشہ نامہ و دام کہ آنچہ شمارا پیش آید بخواہ نباشد نامہاں را روز بازار غماہ بود...

ہوشندی را کار بایست ہمارہ بخود نگراں باید بود۔

علی بخش خاں کو فیروز پور جھڑک سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے انتقال کے بعد وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ جب نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھڑک و بیہم فیروز کے قتل کی گنجنت کے الزام میں پھانسی پا گئے اور ان کی ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی نے سو روپے کے بجائے علی بخش خاں کے لئے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کی وفات تک ملا رہا۔ وظیفہ کی بندش کے زمانے میں وہ دہلی سے نقل کر بیٹے لکھنؤ میں رہے پھر جے پور چلے گئے۔ بعد ازاں جے پور آباد ہوئے۔ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء کو انہوں نے دہلی میں وفات پائی اور اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ غالب یکم جنوری کے خط میں نواب علار الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ بجے پر ونبجے مرتے نامہ وانا ایہ را چون

نہا سے علم نامہ را نواب دنیا را الدین احمد خاں آج دن کے بارہ بجے زندہ فین کے لئے سلطان جی

سلا پنجاب گورنمنٹ کے۔ پکار روز متعلقہ دہلی رپورٹیں ۱۲

گئے ہیں نہ جاسکا۔ تجزیہ و تکفین ان کی طرف سے ذواب ضیاء الدین احمد خاں کی طرف سے عمل میں آئے۔  
غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ علی بخش خاں کو سخن طرازی کا بہت شوق تھا۔ اور بعض  
اوقات وہ اپنے متعلق غلط فہمیاں باتیں بھی تال نہیں کرتے تھے۔ غالب ذواب علامہ الدین احمد خاں کو  
لکھتے ہیں:-

اکبر آباد میں (علی بخش خاں) میور صاحب کے لئے اثنار کمالت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان (ذواب  
احمد بخش خاں) کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا۔ اور ہلکے سے جو عمارت ہو  
ہیں ان میں شامل رہا ہوں بے ادبی ہوتی ہے ورنہ قبا و پیر بن امارت دکھاؤں تو سارا بدن مکڑ  
مکڑ ہے۔ چاہتا ہوں اور بھیجی کے زخم ہیں۔ وہ (میور صاحب) ایک بسیار نفرا و دیدہ و راوی تھے  
ان کو (علی بخش خاں) کو بیکہ کر کہنے لگے ذواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جنرل کے وقت میں  
چار پانچ برس کے ہو گے۔ یسٹن کر آپ نے (علی بخش خاں) سے کہا کہ درست و بجا ارشاد ہوتا ہے۔  
خدا شس بیا مرزا و وہ ہیں دروغ بے نمک لیکر ادا۔

ذواب علی بخش خاں کی اولاد کا ذکر ہم پہلے باب کے آخر میں کر چکے ہیں۔

خاندان لوہارو | لوہارو کا خاندان چونکہ قرابت قریبہ اور روابط خصوصی کی وجہ سے غالب کا اپنا خاندان  
بن گیا تھا اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مختصر اس خاندان کا بھی ذکر کر دیا جائے خاندان  
لوہارو کے آباد اجداد بھی غالب کے آبا کی طرح ترکستان سے ہندوستان آئے تھے۔ تین بھائی تھے  
قاسم جان۔ عارف جان اور عالم جان۔ عارف جان کے چار بیٹے تھے جن میں سے دو بہت مشہور  
ہیں، اول ذواب احمد بخش خاں دوم ذواب الہی بخش خاں معروف۔ ذواب احمد بخش خاں دو راجہ کے  
نہایت جلیل القدر فرد تھے۔ بڑے اعلیٰ درجے کے جنرل تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ ریاست الود  
کی تائیس احمد بخش خاں ہی کی سماعی کا نتیجہ تھی تو یہ بالغلط نہ ہو گا۔ ذواب صاحب نے لارڈ لیک کی معیت  
میں بڑی شاندار خدمات انجام دی تھیں جن کی بنا پر انہیں علاقہ میوات میں فیروز پور چکر کی ریاست مل  
گئی تھی۔ نیز بعد ازاں لوہارو کا پرگنہ عطا ہوا تھا۔ خواصوں کے علاوہ ذواب احمد بخش خاں کی دو بیگمیں تھیں۔

ایک میواتی اصل تھی جس کے بطن سے نواب صاحب کے بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں تھے اور  
ایک اور بھائی اور بنیں بھی تھیں۔ دوسری بیگم نواب صاحب کی ہم قوم تھیں جن کے بطن سے نواب  
امین الدین احمد خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تھے۔ نواب انجمن خاں نے ۱۸۲۶ء میں  
اپنے بڑے صاحبزادے شمس الدین احمد خاں کو اپنا جانشین قرار دیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ شمس الدین  
خاں چونکہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے اس لئے خاندان کے دوسرے افراد جن میں خود غالب  
شامل تھے انہیں سب اپنا ہم پائیں سمجھتے تھے اور اس وجہ سے خاندان میں کشیدگی رونما ہو چکی  
تھی شمس الدین احمد خاں ایک طرف تھے اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا۔ نواب انجمن خاں  
نے اسی کشیدگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنے دونوں چھوٹے صاحبزادوں  
لوارو کی جاگیر مستقل طور پر دے دیں۔ اور بقیہ افراد خاندان کی منشیوں فیروز پور جھکر سے متعلق کر دیں  
اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے نواب شمس الدین احمد خاں سے ایک قرار نامہ لیا جو لوارو کی  
جاگیر سے دست برداری پر مشتمل تھا۔ اور ۱۸۲۶ء میں لوارو اپنے چھوٹے صاحبزادوں کو دے کر  
اور فیروز پور جھکر کی سند پر نواب شمس الدین احمد خاں کو بٹھا کر وہ خود اپنی خاندانی حویلی واقع تھانہ  
میں گوشہ نشین ہو گئے۔ نواب صاحب نے اکتوبر ۱۸۲۶ء میں وفات پائی اور اپنے پیر و مرشد مولانا  
فخر الدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے۔

نواب انجمن خاں کے غالب کی منشی کا جھگڑا نواب احمد انجمن خاں کی زندگی ہی میں شروع ہوا  
صاحبزادوں کی منشیوں کا تھا لیکن بقیہ خاندانی تنازعات ان کی وفات کے بعد شروع ہوئے۔  
نواب شمس الدین احمد خاں نے یہ دعوے کروا کر لوارو کا پرگنہ انہیں ملنا چاہتے اور ان کے بھائی  
کی منشیوں مقرر ہونی چاہئیں۔ بھائیوں نے یہ دعوے کر دیا کہ نواب صاحب مرحوم کے جمع کئے  
ہوئے نقد روپے، بیٹس، بیابا جواہرات اور دوسری چیزوں میں سے بھی انہیں حصہ ملنا چاہئے۔  
لہذا نواب احمد خاں نے عالم دوار کے اہل اہل اللہ تھے۔ خواجہ سلیمان تونسوی کا سلسلہ فیض انہی سے الٹا تھا  
بادشاہ کے پیشوا نصیر الدین عرف کالے میاں انہی کے پوتے تھے ۱۳

آخر یہ جھگڑا دہلی کے برطانوی ریزیڈنٹ کے پاس پہنچا جس نے گورنر جنرل کے پاس رپورٹ پیش کی وہاں سے ریزیڈنٹ کو فیصلے کا اختیار بنا یا گیا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لوہارو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو مل جائے اور شمس الدین احمد خاں کو اس میں مداخلت کا کوئی حق حاصل نہ رہے۔ ضیاء الدین احمد خاں کی نابالغی کے تنازعے میں لوہارو کی آمدنی میں سے بعد وضع مصارف انتظام جو کچھ بچے اس کا نصف حصہ بنام ضیاء الدین احمد خاں سرکاری خزانہ میں جمع ہوتا ہے اور ضیاء الدین احمد خاں بالغ ہو جائیں تو لوہارو کی جاگیر دو نو بھائیوں میں بے حصہ برابر تقسیم ہو جائے۔

یہ فیصلہ طرفین کو سنا دیا گیا اور منظوری کے لئے اوپر بھیج دیا گیا۔ حکومت ہند نے فیصلے سے اتفاق کیا لیکن اپنی طرف سے تجویز پیش کر دی کہ اگر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں راضی ہو جائیں تو انہیں جاگیر کی آمدنی کے برابر بعد وضع مصارف انتظام و تحصیل، نقد روپیہ سالانہ ملتا جائے اور جاگیر شمس الدین احمد خاں کی تحویل میں رہے۔

ابھی کشمکش جاری ہی تھی کہ ریزیڈنٹ صاحب بدل گئے نئے ریزیڈنٹ نے حکومت ہند کی تجویز کے مطابق فیصلہ کر دیا کہ لوہارو کی جاگیر شمس الدین احمد خاں کی نگہداری میں رہے۔ اس فیصلے کی وجہ یہ قرار دی گئی کہ امین الدین احمد خاں نے ضیاء الدین احمد خاں کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانہ میں داخل نہیں کیا۔ جاگیر کی آمدنی کا اندازہ پچیس ہزار روپیہ کیا گیا تھا جس میں سے پندرہ ہزار روپے انتظام پر صرف ہوتے تھے اور دس ہزار روپے کی رقم خالص بچت تھی۔ امین الدین احمد خاں نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ لوگوں کی سرکشی کے باعث پورا روپیہ وصول نہیں ہو سکا۔ اس امر کے قرائن موجود ہیں کہ مالگذازی کے واجبات کی ادائیگی سے مزاد معین کا انکار شمس الدین احمد خاں کی گنجنت نہ تھا۔ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں دونوں نے اس فیصلے کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور کہا کہ اگر جاگیر لوہارو کو ہم سے پھینکا ہی منظور ہے تو اسے شمس الدین احمد خاں کے حوالے کرنے کے بجائے سرکار انگریزی خود اس پر قبضہ ہو جائے۔ ریزیڈنٹ کو اوپر سے حکم ملا کہ اصل فیصلے کو نافذ کر دیا جائے لیکن اس نے تامل کیا۔ اور اس امر کا انتظام کرتا رہا کہ شاید حالات بہتر ہو جائیں اور

بھائیوں کے مابین مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

شمس الدین احمد خاں نے مسلسل اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ لوہارو کی جاگیر ان کے حوالے کی جائے آخر رینڈنٹ کو یہ مطالبہ قبول کرنا پڑا اور لوہارو کو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے چھین کر شمس الدین احمد خاں کے قبضے میں دے دیا گیا۔

۱۸۳۰ء میں مشرولیم فریر دہلی کے رینڈنٹ مقرر ہو کر آئے۔ فریر صاحب نواب احمد بخش خاں مرحوم کے نہایت گہرے دوست تھے ۱۸۵۰ء میں دہلی میں ٹیڈا کوٹنی کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ نواب احمد بخش خاں کے تمام صاحبزادے انہیں ”بچا“ کہتے تھے انہوں نے رینڈنٹ ہوتے ہی پھر اس سلسلے کو اٹھایا اور تجویز پیش کی کہ لوہارو کا علاقہ نواب احمد بخش خاں کی تقسیم کے مطابق امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملنا چاہئے۔ اگر امین الدین احمد خاں نے ضیاء الدین احمد خاں کے حصے کا روپیہ دہلی کے خزانے میں جمع نہیں کر لیا تو اس پر اعتراض کا حق شمس الدین احمد خاں کو نہیں پہنچتا بلکہ صرف ضیاء الدین احمد خاں یہ اعتراض پیش کرنے کے حقدار ہیں، جب اہل حقدار اس صورت حالات پر مطمئن ہے اور اس کے خلاف شاکہ نہیں تو پھر دوسروں کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ مشر فریر نے یہ بھی کہا کہ لوہارو کی آمدنی چالیس ہزار ہے۔ اور مزید اصلاح کے بعد توقع ہے کہ آمدنی ساٹھ ہزار ہو جائے گی۔ لہذا جاگیر کو ایک تھوڑے رقم پر شمس الدین احمد خاں کے حوالے کرنے سے چھوٹے بھائیوں کے مفاد کو نقصان پہنچتا لیکن مشر فریر کی تجویز کی شنوائی نہ ہوئی اور غالباً انہی کے مشورے کے مطابق امین الدین احمد خاں اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے خود کلکتہ گئے۔

شمس الدین احمد خاں کے خلاف فیصلہ کلکتہ پہنچ کر انہوں نے تمام معاملات حکام دالاکے گونگاڑا کئے تو فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ اور لوہارو کو نواب شمس الدین احمد خاں سے واپس لے کر امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے حوالے کر دینے کا حکم مل گیا۔ شمس الدین احمد خاں کے کیسل نے فوراً کلکتہ سے یہ رپورٹ بیٹھیندر اڑ اپنے آقا کے پاس بھیجی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ رپورٹ پہنچی تو



شمس الدین احمد خاں اپنے رفقا اور مصاحبوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی انہوں نے وقفہ کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور سوچ میں پڑ گئے۔ کریم خاں نامی ایک دہیلا سوار متنبہ لگا ہوا تھا۔ اس نے بلا تکلف کہا کہ سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو اور کھانا کس لئے ٹھنڈا کر رہے ہو۔ شمس الدین احمد خاں نے اس پر خلاف معمول خفگی کا اظہار کیا۔ کریم خاں نے حالات معلوم کئے بغیر کہہ دیا کہ اگر دشمن سے آواز نہ پہنچا ہے تو میں اس کا خاتمہ کروں گا۔ شمس الدین احمد خاں نے کہا کہ شکم پرست لوگ یہی باتیں بنایا کرتے ہیں۔ کریم خاں نے فوراً جواب دیا کہ نواب صاحب ہیں پٹھان ہوں میرے ساتھ دوسروں کی طرح طعن آمیز گفتگو نہ کیجئے۔ نواب صاحب خاموش رہے۔ کریم خاں وہاں سے اٹھا اور دوسرے کمرے میں گیا تو وہاں نواب کا دیوان اور ایک خدمت گزار انیاہو بیٹھتے تھے۔ ان سے نواب صاحب کی پریشانی کی حقیقی علت معلوم ہوئی۔

فریزر کا قتل | اسی وقت کریم خاں انیاہو کو ساتھ لے کر قیر و زہر چھہرہ سے دہلی روانہ ہو گیا تاکہ مسٹر ولیم فریزر کا خاتمہ کر دے جس نے لوہاروں کی جاگیر شمس الدین احمد خاں سے چھینوائی تھی۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ کلکتہ سے فیصلے کی اطلاع پاتے ہی نواب نے خود فریزر کے قتل کی سکیم تیار کی۔ کریم خاں اور انیاہو کو دہلی بھیجا گیا تاکہ فریزر کو تنہا پا کر قتل کر ڈالیں۔ وہ دونوں دہلی آئے تین ماہ تک فریزر کے پیچھے لگے رہے لیکن دار کا موقع نہ مل سکا۔ چاروہ ناکام واپس چلے گئے۔ شمس الدین احمد خاں ان کی ناکامی پر بہت تنہا ہوئے۔ دوسری مرتبہ پھر وہ دونوں دہلی آئے۔ ایک ہندوئی خرید کر اور اس کی نالی کٹوا کر چھوٹی کرائی تاکہ اسے بہ آسانی کپڑوں میں چھپایا جاسکے۔ دو ماہ تک انہیں باوجود تلاش مناسب موقع نہ مل سکا۔ ایک روز معلوم ہوا کہ فریزر صاحب ایک جگہ دعوت میں بلائے گئے ہیں۔ کریم خاں راستے پر گھات میں بیٹھ گیا لیکن فریزر صاحب دعوت سے فارغ ہو کر کسی دوسرے راستے سے مکان پر پہنچ گئے۔ یہ موقع بھی جاتا رہا۔ ۲۲ مارچ ۱۸۵۷ء کو پھر ایک جگہ فریزر صاحب کی دعوت تھی۔ جب وہ رات کے وقت دعوت سے فارغ ہو کر واپس جاتا رہا۔

یہ واقعات بیٹھنے بعض سن رسیدہ بزرگوں سے معلوم ہوئے ۱۲

تھے تو ان کے مکان کے قریب کریم خاں نے انہیں گولی سے ہلاک کر ڈالا اور خود بچ نکلا۔ لیکن شہرے باہر جا سکا قتل کی اطلاع ملتے ہی شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور قاتل کی تلاش شروع ہوئی۔ کریم خاں اور انیائے مشورہ کے بندوق ایک کنوئیں میں پھینک دی۔ باقی سارے نشانات بھی زائل کر دیئے۔ نواب صاحب کی طرف سے اس دوران میں جتنے خط آئے تھے وہ سب جلا ڈالے چند روز کے بعد کریم خاں نے انیائے تمام حالات کے متعلق ایک خط دے کر نواب صاحب کے پاس بھیجا۔ نواب صاحب قتل کی تفصیل سن کر بہت خوش ہوئے۔ انیائے نواب صاحب کے ل کر باہر نکل رہا تھا کہ کریم خاں کے ایک قریبی رشتہ دار نے بہ نظر احتیاط نواب سے کہا کہ انیائے آدمی کو جو تمام رازوں سے آگاہ ہے زندہ چھوڑنا خالی از خطرہ نہیں۔ اس کا بھی خاتمہ کر دینا چاہیئے۔ انیائے یہ بات سن لی۔ وہ فیروز پور سے نکل کر اپنے گھر پہنچا اور وہاں چھپا رہا۔ نواب کے آدمی اس کے پیچھے لگ گئے۔ انیائے گھر سے نکل کر مختلف جگہوں میں چھپتا چھپاتا اور اپنی جان بچاتا ہوا پہلے آگرہ پھر بریلی پہنچ گیا۔ اس آٹھویں کریم خاں بعض شہا کی بنا پر پکڑا گیا۔ کریم خاں کا سر نخل جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ شمس الدین احمد خاں اور مسٹر فریزر کی عداوت کا بہت شخص کو علم تھا اور عام رائے یہی تھی کہ فریزر کا قتل شمس الدین احمد خاں کی انجینٹ پر ہوا ہے۔ اور اس کا ذمہ دار نواب ہی کا کوئی ملازم ہوگا۔ ہمتی یہ کہ جس کنوئیں میں بندوق پھینکی گئی تھی اسی میں ایک شخص کا لوٹا گر گیا اس نے سقوط سے کہہ کر لوٹا نکلوانا چاہا تو بندوق نکل آئی اور کریم خاں قتل کا جرم ثابت ہو گیا۔

نواب شمس الدین احمد خاں | انیائے کو بریلی میں یہ اطلاع ملی تو وہ سلطانی گواہ بن گیا۔ اور اس نے نواب کی شرکت کو پھانسی کا حکم | انجینٹ کے متعلق گواہی دی۔ کریم خاں کو پہلے پھانسی لگائی۔ بعد ازاں نواب کے لئے بھی پھانسی کا حکم ہو گیا۔ ان کی ریاست ضبط کر لی گئی۔ اور اکتوبر ۱۸۵۷ء میں انہیں کشمیر (دروازہ کے باہر) نو سو فوجیوں کے گھرے میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ میت ان کے خسر مرزا نعل بیگ کے حوالے ہوئی جس نے نواب کو قدم شریف میں دفن کیا۔

۱۔ یہ حالات کنیل سلیم نے اپنی کتاب "ریسلس اینڈ ڈریسنگ" میں دو سری جلد میں لکھے ہیں (بقیہ پر ۳۱)

کہتے ہیں نواب بڑی مروانگی سے جان دی۔ پہلے سبز لباس زیب بدن کیا لیکن وہ لباس اُتر دیا گیا تو سفید لباس پہن لیا۔ پچاسی رہنکے کے بعد ان کی لاش قبلہ رخ ہو گئی۔ عام لوگوں نے اسے نواب کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر مدت تک زیارت گاہ عوام بنی رہی۔

شمس الدین احمد خاں کے ترمینہ اولاد کوئی مدد بھی صرف لڑکیاں تھیں جن کی شادیاں بعد میں ہوئیں۔ نواب احمد بخش خاں کے دوسرے لڑکے نواب امین الدین احمد خاں ملیح مارو قرار پائے ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے نواب علار الدین احمد خاں والی لوبا رو بنے۔ نواب علار الدین احمد خاں کے بعد نواب سر امیر الدین احمد خاں مسند نشین ہوئے۔ وہ خدا کے فضل سے زندہ ہیں پچھتر برس کا سن ہے۔ کئی سال سے ریاست کے کام سے علیحدہ ہیں۔ پہلے انہوں نے اپنے فرزند ولید کو مسند نشین کر دیا تھا ان کے انتقال کے بعد نواب سر امین الدین احمد خاں کا نیرہ مسند نشین ہو گیا۔

صاحبزادوں کی اولاد | نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادوں میں سے شہاب الدین احمد خاں <sup>ثنا دہ</sup> سعید الدین احمد خاں طائب کے متعلق زیادہ حالات معلوم ہیں۔ شہاب الدین احمد خاں کے دو صاحبزادے مشہور ہوئے مشہور احمد خاں تائبان۔ اور سر سراج الدین احمد خاں سائل۔ سر سراج الدین احمد خاں زندہ ہیں اور شاعری میں کافی شہرت کے مالک ہیں۔ سعید الدین احمد خاں طائب وفات پا چکے ہیں۔

امین الدین احمد خاں۔ ضیاء الدین احمد خاں۔ علار الدین احمد خاں اور شہاب الدین احمد خاں کے ساتھ طائب کے تعلقات بے حد خوشگوار تھے۔ اور آخر و تم تک خوشگوار رہے۔ یہ لوگ بھی اس تاجدارِ اقلیم

(بقیہ صفحہ ۳۰) پنجاب گورنمنٹ کے پرانے ریگا رڈوں میں سٹریٹ لائٹس کے متعلق بھی بہت سے کاغذات موجود ہیں ان کا مطالعہ ہوتا ہے کہ انیامیو کے بھائی اور ایک دوست نے خود دہلی پہنچ کر افسروں سے کہا تھا کہ اگر انیامی کی حفاظت کا ذکر اٹھایا جائے تو وہ سارے حالات بتائے گئے تیار رہے۔ انہیں حفاظت کا تحریری یقین دلا گیا تھا لیکن انیامی اس وقت مٹا یا اس لئے کہ اسے نواب شمس الدین احمد خاں کی طرف سے گرانقدر انعام کا انتظار تھا۔

مکن ہے نواب نے یا ان کے آدمیوں نے انیامی کی اطلاع پاکر قتل کر ڈالنے کی کوشش کی ہو۔ یہ ہر حال اس میں شبہ نہیں کہ نواب کی شرکت قتل کی بنیاد یا تو انیامی کا بیان تھا۔ یا نواب اور سٹریٹ لائٹس کی باہمی کشیدگی ۱۲

سخنوری کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ سارے اعلیٰ درجے کے فاضل اور ارباب علم و ذوق تھے۔  
 سب کے نام غالب کے مکتوب موجود ہیں۔ ایک مکتوب نواب سرمد الدین احمد خاں کے نام بھی ہے  
 جو غالب کی وفات کے وقت غالب آٹھ برس کے تھے۔ ضیا الدین احمد خاں اور علامہ الدین احمد خاں  
 دونوں فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اول الذکر فارسی میں تیراوردو میں رخصت تخلص فرماتے تھے۔

آخرا الذکر کا تخلص پہلے ہی تھا بعد ازاں علامتی ہو گیا۔ غالب نے عارف کے مرثیہ میں فرمایا ہے :

ہم سے تمہیں نفرت سہی تیرے لڑائی

بچوں کا بھی دیکھا نہ تھا کوئی دن اور

یہاں تیرے مراد نواب ضیا الدین احمد خاں تیرے ہیں۔ ایک اور غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :

ہم سے غالب یہ علامتی نے غزل لکھوائی

ایک بیدار گریخ نسزا اور سہی

علامتی سے مراد نواب علامہ الدین احمد خاں ہیں۔ غالب نے تیراوردو اور علامتی کو اردو اور فارسی میں

اپنا جانشین قرار دیا تھا۔ اور انہیں جانشینی کی سند عطا کی تھی۔ فارسی حکایتیں نواب ضیا الدین احمد خاں  
 کے لئے ایک قصیدہ موجود ہے جس میں لکھتے ہیں :

من آں سپہر کہ داتم چنانکہ مر بہ ماہ بہر نور و ہدایت متور من

منم خنرینہ رازنا و در خنرینہ راز ضیائے دین محمد کیں برادین

بہ دین و دانش و دولت یگانہ آفاق بہ عمر کہ تر و از روئے رتبہ بہت تر من

پہر سردل بہر اور دہم نہ بھویم کہ پور غیش بود دستان دلبر من

خاندان لودکی عقیدت ان لوگوں کو غالب کے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے

جو نواب سرمد الدین احمد خاں کی زبان مبارک سے سنا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم پر تعلق اس

وقت شرفا کا دستور کیا تھا۔ اور کس طرح ہر شخص تعلیم کو خاندان کے اعظم و افضل کا حق جانتا تھا۔

نواب سرمد الدین احمد خاں فرماتے ہیں کہ میں سات آٹھ برس کا تھا اس زمانے میں ایک مشاعرہ

جس میں نواب ضیاء الدین احمد خاں، نواب علاء الدین احمد خاں اور نواب شہاب الدین احمد خاں شریک ہوئے ہیں بھی ساتھ کیا۔ مشاعرہ کی غزلوں میں "بل" کا لفظ کسی مرتبہ سنا تو میں نے نواب شہاب الدین احمد خاں سے "بل" کے معنی پوچھے۔ انہوں نے اوکے ساتھ نواب علاء الدین احمد خاں کی خدمت میں عرض کیا کہ امیر الدین "بل" کے معنی پوچھتا ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں نے اوکے ساتھ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی خدمت میں عرض کیا کہ "بل" کے معنی میں بتاؤں یا آپ بتائیں گے؟ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے فرمایا کہ جب مرزا غالب زندہ ہیں۔ تو ہمیں خود "بل" کے معنی بیان کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مشاعرہ سے خارج ہو کر اسی روز یا دوسرے روز سب غائب کے پاس پہنچے اور یہ واقعہ عرض کیا۔ نواب امیر الدین احمد خاں فرماتے ہیں کہ غالب ایک گاؤں تک پہنچے اور ٹانگیں اکٹھے کئے ہوئے کسی حد تک اونگھ بیٹھے پڑے تھے۔ فرمانے لگے کہ جس حالت میں اس وقت میں نے سچے لوگوں کی حالت دیکھی تو "بل" کہتے ہیں۔

غائب پر بخبری کا شبہ | خاندان لوہارو کا صرف ایک فرد ہے جس کے شعلی غالب کی تحریرات میں کسی مقام پر بھی کوئی کلمہ خیر نہیں ملتا۔ اور وہ نواب شمس الدین احمد خاں ہیں۔ اور تفصیلات بیان ہو چکی ہیں۔ ان صاحب نظر ہرے کہ نواب شمس الدین احمد خاں سے تنہا غالب ہی آزرده نہ تھے بلکہ سارا خاندان ناراض تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری کے سلسلے میں غالب بھی متهم ہوئے یعنی دلی میں عام طور پر مشہور ہو گیا کہ غالب نے بخبری کر کے نواب کو پکڑوا یا ہے شمس الدین احمد خاں کے ساتھ دیرینہ نزاع اور عداوت کے علاوہ اس شبہ کی دو وجہیں اور ہوئیں۔ اول یہ کہ فریز صاحب غالب کے نہایت عزیز دوست تھے۔ دوسرے اس وقت شہر کے مجسٹریٹ فری کاٹ (Fryes cat) صاحب تھے وہ بھی غالب کے شناسا تھے۔ انہی دونوں میں غالب کے خلاف دوسرا ہو کاروں نے زر قرض کی ڈگریاں لے رکھی تھیں اس زمانے میں اونچے طبقے کے آدمیوں کے خلاف ڈگریوں کے ضمن میں یہ دستور تھا کہ ان گھر کے اندر سے کوئی گرفتار نہیں کرتا تھا۔ البتہ باہر نکلنے پر گرفتار کر لیا جاتا تھا اس وجہ سے غالب گرفتاری سے بچنے کے لئے سارا دن گھر کے اندر گزارتے تھے۔ اور گھڑی دو گھڑی رات گئے پر باہر نکلا کرتے تھے۔ ان شبیہ سیروں میں وہ مجسٹریٹ صاحب بھی ملتے تھے۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ خفیہ فیہ نواب شمس الدین احمد

خاں کی جاسوسی کرتے ہیں۔ اور تمام خبریں اعلیٰ جاکر مجسٹریٹ کو پہنچاتے ہیں۔ غالب نے خود یہ سارے حالات شیخ امام بخش تاج کو لکھتے ہیں :-

مجسٹریٹ ہمارے شہر کہ با من سابقہ معرفتے و ملاؤ مودے داشت و وہاں از دو کہ نکلند شدہ مہجینی  
مقدور ضیعت کے سلسلے میں گرفتاری کے خوف سے .... گاہ گاہ بہ نزد دے نہتے و نفٹے چند خوشگوار دوسے  
چوں میں واقعہ رد داد و فریز کا قتل، مود پر پوش کا روغل اسرار باغ و انبار ساخت۔ تا آن شد  
کہ دالی فیروز پو بھیر کہ مجرم قرار یافت و بہ حکم سرکار ہاتے چند از خاصان خود اسیر شدہ .... چوں میانہ مہجینی  
دسے شمس الدین احمد خاں، ماساز کاری بود و مردم شہر اکی داسے دہستہ بگی دسین افتاد و گرفتاری  
آں کا معرفت داد و گشت بہ گردن من بستند۔

یہ بھی ممکن ہے کہ غالب نے واقعی مجبری کی ہو اور اوپر کی تحریر کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ  
غالب کامیلاں طبع شمس الدین احمد خاں کے حق میں نہ تھا بلکہ ان کے خلاف تھا۔ اور وہ نواب کی  
گرفتاری کے پورے ذمہ دار ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کا دامن اس باب میں بالکل پاک نہ تھا۔ خود واقعہ  
قتل کی نسبت لکھتے ہیں :-

یکے از شنگران ناخدا زس کہ بہ عذاب ابدی گرفتار باد۔ ولیم خزینہ ہمارے اکبرینڈنٹ وہلی و غالب  
منسوب راجہ بی بود و رشپ تار یک بہ ضرب تفنگ گشت و مرا غم دگ پڑا زہ گشت۔

اسی قمار کی ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :-

غالب تم نگر کہ چو ولیم خزینہ سے  
نیشاں بہ چیرہ دہی اعدا شود ہلاک

نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر سن کر نواب شمس الدین احمد خاں کی متوقع روش کا اظہار ان  
لفظوں میں کرتے ہیں :-

آج کہ چہ لاف روشن ایں دو دماں مرد و بیستان از زوایتہ و تار شدہ .... اکساں را روز با ناز  
خامہ بود و فو یگانہ ساگری ہنگامہ، زو و کہ انجن از ہم پاشد، و پاکندہ چند گرد آید و دلت روتے

گرداند و آسودگی بر خیزد۔

پچھلے ۱۸۳۵ء کی تحریر ہے جو ۱۸۳۵ء میں حرفا حرفا پوری ہوئی۔

ولیم فریزر نے ۱۸۳۲ء میں نواب امین الدین احمد خاں کو کلکتہ بھیجا تھا تو غالب نے اپنے کلکتہ کے دوستوں کے نام نہایت محبت بھرے سفارشی خطوط لکھے جو ان کے مجموعہ مکاتیب میں شامل ہیں۔

نواب احمد بخش خاں مرحوم کے ایک عم زاد بھائی میرزا قدرت اللہ بیگ ساتھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی غالب کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ میرزا قدرت اللہ بیگ کے دو بیٹے تھے۔ میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں، سیف الحق سیاح کے نام کے دو خطوں میں ان کا بھی ذکر آیا ہے ایک خط میں فرماتے ہیں:-

ہاں صاحب برادر بہ جان برادر میرزا معین الدین حسین خاں بہادر کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ

بھائی جی دیکھنے کو بہت چاہتا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

میرزا معین الدین حسین خاں اور میرزا محمد حسین خاں یہ دونوں بیٹے ہیں نواب قدرت اللہ بیگ خاں کے

اور قدرت اللہ بیگ خاں ابن عم تھے نواب احمد بخش خاں کے، اور معین الدین حسین خاں کی بہن

نسب ہے بھائی ضیاء الدین احمد خاں سے۔

میرزا معین الدین حسین خاں کا مرتب کیا ہوا ایک روزنامہ غدر خواجہ حسن نظامی صاحب کی

مہربانی سے شائع ہو چکا ہے۔

تاہل کی زندگی کے متعلق غالب کی تحریرات میں تاہل کی زندگی کے متعلق بعض ایسی چیزیں ملتی

غالب کے بعض بیانات ہیں جن سے باوی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیگم صاحبہ سے

خوش نہ تھے یا تاہل کو ناپسند کرتے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر انہوں نے شادی کو ”گھمبوس دوام“

سے تعبیر کیا ہے اور یہ وی کو ”بیڑی“ قرار دیا ہے۔ میر محمدی مجروح نے وبا کے متعلق

پھا تو جواب دیا کہ جب ایک چھیا سٹھ برس کا بڑھا اور چو سٹھ برس کی بڑھیا نہ مری  
 تو کیوں کر سمجھا جائے کہ وہ باقی۔ "تفہ بریں و با" امر او سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال پر  
 تفتہ کو جو خط لکھا ہے اس میں بھی ایسے الفاظ ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ تاہل کی  
 قید سے نجات پانے کے بڑے آرزو مند تھے، اس خط کے آخر میں حکیم سنائی کے حلیقہ میں سے  
 بھی بعض اشعار نقل کئے ہیں۔

"سپاچیں" میں ان کا ایک قطعہ ہے ۵

بیرد و رخ نہند تیر نہنیں	گیر کہ در روز حشر چوں تو بیفتی
در طلب نان و جامہ کشکش از زن	لیک نہ باشد در آن مضیق مصیبت
شور تقاضائے نابروائے ہما جن	لیک نہ باشد در آن مقام صعوبت

ان کی ایک رباعی ہے ۵

دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری	اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری
در خانہ زنئے ستیزہ خوئے داری	زین گوئے کہ تندے خرامی دانم

ایک قطعہ میں فرماتے ہیں ۵

سپر دندازرہ مکرم و تار لیل	یہ آدم زن بہ شیطاں طوق لعنت
گراں تر آنداز طوق عزائیل	ولیکن در اسیری طوق آدم

ایک اور رباعی میں لکھتے ہیں ۵

از غصہ فراغتش ہما نابو	آں مرد کہ زن گرفت دانا نابو
نازم بچلا چہرا تو انا نابو	دارو بہ جہاں خانہ وزن نیست درو

یہ تمام چیزیں اس خیال کے لئے تقویت کا باعث سمجھی جاسکتی  
 ہیں کہ غالب تاہل کی زندگی سے نفور تھے۔ یا میگم صاحبہ کے ساتھ  
 عدم مطابقت کی وجہ سے تاہل ان کے لئے مصیبت بن گیا تھا اور



اس مصیبت کا انہما مختلف صورتوں میں کرتے ہیں۔ لیکن یہ خیال حقیقت کے بالکل خلاف ہے نظم و نثر کے تمام مندرجہ بالا کوششے غالب کی طبعی شوخی فطری بے مہالی اور پیدائشی ظرافت کا نتیجہ ہیں۔ جو کچھ ان کے جی میں آتا تھا بلا تحلف کہہ دیتے تھے بعض مذہبی امور کے متعلق بھی ان کے لطیفے مشہور ہیں حالانکہ ان کے دل میں مذہب کا انتہائی احترام تھا۔

بیگم صاحبہ سے محبت | واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیگم صاحبہ سے بڑی محبت تھی۔ بیگم صاحبہ بھی اپنے شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھیں۔ اگرچہ اعمال کے لحاظ سے دونوں میں نمایاں فرق تھا۔ غالب فطرتاً رند تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ بے حد پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ بیگم نے ازراہ کمال اتفاقاً اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لئے تھے۔ اس لئے کہ غالب کم از کم شراب و نوش کے باب میں تقی نہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود طرفین میں گہری محبت آخری دم تک قائم رہی۔

فرغ تہاں کی محبت آئینہ آدہا | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ ضرور گھر جاتے تھے اس کی تصدیق غالب کی مختلف تحریروں سے ہوتی ہے مثلاً میرمدی مخرج کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

خط لکھ کر بند کر کر آدمی کو دوں گا اور میں گھر جاؤں گا۔ وہاں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ اٹھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا مین سے اٹھ دھوؤں گا پھر اس کے بعد خدا جائے کون آئے گا کیا صحبت رہے گی۔

نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

روٹی کھانے کو باہر کے مکان سے محل میرا میں کہ وہ بہت خریج جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانہ میں آکر ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں نواب صاحب ہی کو لکھتے ہیں:-

آج چونتہ روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا شہاب الدین خاں تھا ملاحظہ فرمائی کی ٹھیلے کر آیا میں

اس کو اگر گھر گیا۔

میر ہمدی مخرج کو لکھتے ہیں :-

دوستی اب تم جا ہو جاؤ میں اپنے گھر میں روٹی کھانے کو جاتا ہوں۔

یہ تمام اقتباسات اس امر کا قاطع ثبوت ہیں کہ وہ دن کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے تھے اور یہ دن اس وقت بھی قائم رہا جبکہ ان کے لئے چلنا پھرنا اچھا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ اور بقول ان کے گھر پہنچ کر ان سے واپس آکر ہندوستانی گھڑی بھڑیں دم ٹھرتا تھا۔

غالب کی تحریرات میں کوئی مواد ایسا نہیں ہے جس سے تامل کی زندگی پر پوری روشنی پڑے۔ غالباً اس لئے کہ شرفا اس قسم کے تذکروں کو عام طور پر پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کے فارسی اور دو مکاتیب میں چند ایسے خطوط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جب دہلی سے باہر جاتے تھے تو گھر کا پورا خیال رکھتے۔ اور متواتر خطوط بھیجتے رہتے تھے۔ مثلاً انہوں نے حکمتہ سے رائے جمیل کو خط بھیجے ان میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

سہ تعلقہ مکتوب ملفوف است کیے بہ جناب دیار دارالدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں دیکھے برہت

جناب مولوی فیض خاں صاحب دیکھے بہ غم خانہ بدتر از دیار نہ غالب نام کام رسانند۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

ایک کتو ہے بے لفاظہ در لفافہ خط غم خانہ سے رسد۔

غالب نے ان میں نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے پاس رام پور گئے تھے تو اس وقت میں خاندانی مشن بند تھی۔ وہ حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے۔ گورنر جنرل کے چیف سکرٹری ان کے کسی خط کا جواب بھیجا جسے بیگم صاحبہ نے حکیم غلام نجف خاں سے کہہ کر بند کا بند رام پور بھیجا دیا۔ صاحب نے یہ بھی لکھا کہ گھر خط جلد جلد لکھتے رہا کریں۔ جواب میں لکھتے ہیں :-

یہ تم کیا لکھتے ہو گھر میں خط جلد جلد لکھا کرو تم کو جو خط لکھتا ہوں گویا تمہاری آستانی کو لکھتا ہوں دینی

بیگم صاحبہ غالب (کیا تم سے نہیں ہو سکتا کہ جاؤ اور پڑھ کر سناؤ؟ اب ان کو یعنی بیگم صاحبہ کی چال

ہو گا کہ انگریزی خط میں کیا لکھا ہے۔ تم یہ خط میرا تھم میں سے جاؤ اور حرف بہ حرف پڑھ کر سناؤ۔

انگریزی خط میں گورنر جنرل کے چیف سکرٹری نے یہ لکھا تھا کہ:-

حکم دیا جاتا ہے عرضی دینے والے کو کہ جواب اس عرضی کا جواب گورنر جنرل بعد دریافت کے

ارشاد فرمائیں گے۔

غالب کو تشویش ہوئی کہ شاید بیگم صاحبہ پریشان ہوں کہ انگریزی خط کا مضمون کیا ہے حکیم غلام

خاں کو یہ بھی لکھتے ہیں کہ لفافہ کھول کر پڑھ کیوں نہیں لیا تھا تاکہ گھر والوں کو پریشانی نہ ہوئی۔ اس سے ظاہر

ہے کہ غالب بیگم صاحبہ کی ہلکی سی تشویش کو بھی گوارا نہیں فرماتے تھے۔

رام پور ہی سے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:-

نور الدین (ابن حکیم غلام نجف خاں) کی دادی (بیگم صاحبہ غالب) کا یہ عارضہ صرف دو سال پہلے ہوا تھا

کابجہ سے خفا ہونا..... مطالب معلوم ہوئے..... اس کی دادی اس موسم میں ہمیشہ ان امراض میں

ہو جاتی ہے ایک نسخہ اس کے پاس ملا لکھ کر ہے وہ کھنچو اور فوراً خیریت رہو

نواب یوسف علی خاں والی رام پور کے انتقال اور نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے سلسلے

میں غالب اکتوبر ۱۸۶۵ء میں رام پور گئے تو حکیم غلام نجف خاں نے غالباً بیگم صاحبہ کے ارشاد کے

مطابق ایک خط میں تشویش ظاہر کی تھی کہ شاید کھانے پینے کی چیزیں مزاج کے مطابق نہ ملتی ہوں۔

اس کے جواب میں رقم فرماتے ہیں:-

تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم

میں یہاں بہت خوش اور مست رہوں..... یہ خط لے کر تم اپنی دادی (بیگم صاحبہ) کے

پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہہ دو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی وہ

غلط ہے۔ بے اس ہے۔

ایک اور مکتوب میں جو رام پور کے سفر کے دوران میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:

لوگوں (باقری علی اور حسین علی) انبار نواب زین العابدین خاں (عارف) کے ہاتھ کے دو خط لکھے

ہوئے ان کی دادی کو بھجوا دیئے ہیں تو اس اپنے نام کے خطا کو لے کر ڈیوڑھی پہنا نا اور اتنا ہی جی کو سنا دینا اور خیر و عافیت کہہ دینا۔

حکیم ظہیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

سنو میاں ظہیر الدین تم اپنی دادی کے پاس ابھی چلے جاؤ اور ان سے میری اور لڑکوں کی خیر و عافیت کہو، اور پوچھو کہ شہاب الدین خاں نے اکتوبر کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیئے یا نہیں۔ اچھا میرا بیٹا یہ دونوں باتیں اپنی دادی سے پوچھ کر جلد بھجھ کو لکھیں ورنہ کجگو۔

یہ تمام اقبہا سات اس امر کا ثبوت ہیں کہ غالب نے محض فرائض تامل کی بجائے اور ہی ہی نہیں تھے بلکہ ان فرائض کو دلی لگاؤ اور تعلق سے ادا کرتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ مالی مشکلات کے هجوم پر وہ بعض اوقات بہت تنگ دل ہو جاتے تھے۔ اس حالت میں گھبرا کر ایسی باتیں بھی لکھ جاتے تھے جن سے ان کے دلی خیالات و احساسات کو کوئی تعلق نہ تھا بلکہ انہیں وقتی پریشان خاطر کی نتیجہ سمجھنا چاہئے یا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے طبعی شوخی کا کثر نہ قرار دینا چاہئے ایسی ہی ان کی تحریر بھی بھائی میراڈ کرسنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے ایک تنہائی سے غم ہو، ایک تنہائی

منظور ہوتا ہے میری موت تک میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پیٹیلے جانے میں میری سکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دوست تنہائی میرا جاتی۔ لیکن اس تنہائی چند روزہ اور بچہ بدستغاری کیا تو خدا نے لا دل رکھا تھا۔ شکوہ کیا تا تھا۔ خدا نے میرا شکوہ منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی تبدیلہ داری کی شکل کا نتیجہ ہے یعنی جس لوہے کا طوق (بیکم صاحبہ) اسی لوہے کی دو ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں (یعنی زنجیر باندھا) خاں کے بچے،

اولاد غالب کا اپنا کوئی بچہ نہ تھا۔ سات بچے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی پندرہ مہینے سے زیادہ رونا نہ رہا۔ سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں :-

تمہارے لڑکا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو برا غم ہوا۔ بھائی اس دغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ بہتر برس کی عمر میں سات بچے پیدا ہوئے لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے

زیادہ نہ ہوئی۔

جب اپنے ہاں اولاد کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو غالب نے اپنی بیگم کے بھانجے یعنی فیادی بیگم کے صاحبزادے، میرزا زین العابدین خاں عارف کو بیٹا بنالیا۔ ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ رشتے میں عارف بہت قریبی تھے۔ اور اس لئے بھی کہ بڑے خوش فاعل تھے لیکن عارف بھی جوانی کے عالم میں دائمی مفارقت کا دغ و سہ گئے۔ غالب نے ان کی وفات پر حد درجہ درد بھرا نوحہ لکھا جو ان کی بہترین اردو نظموں میں سے ہے۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا سہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور  
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور  
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے کیا خوب قیامت کا ہو گیا کوئی دن اور  
ہاں اے خاک پیرواں تھا بھی عارف کیا تیرا بکڑا جو نہ مرنا کوئی دن اور  
تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے پھر کیوں نہ رہا گھر وہ نقشا کوئی دن اور  
تم ایسے کہاں کے تھے گھرے داود سند کے کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور  
مجھ سے نہیں نفرت سہی تیرے لڑائی بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور  
گڑی نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش کرتا تھا جو اس مرگ اگزار کوئی دن اور  
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتو نہیں غالب قسمت میں ہو مرے کی تنہا کوئی دن اور  
غالب نے فارسی میں بھی عارف کی خوش فکری اور گہری الفت و محبت کے اظہار کے لئے ایک قطعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں :-

اں پسندیدہ فحشے عارف نام کہ خوش شمع دو دو مان من است

انکہ در بزم قرب خلوت انس غمگسار و مزاجدان من است

اس میں عارف کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

۱۔ میری تحقیق کے مطابق ان کی وفات ۱۲۷۷ھ میں ہوئی ۱۲

ہم نہ کھاتے خوش نہ خوش دل کا نال نمرشان ہن است  
 سودا را یک مال ہنی سخت گنج شامکان ہن است  
 چاکہ دار کہ خوش را نازی کہ طور تو در زمان ہن است  
 چاہے دار کہ خوش را نازم کفایت نہ پیردان ہن است  
 جاوداں باش اے کہ گزینی سخت عمر عوادان ہن است  
 اے کہ میراث خواہی باشی اندر او کہ آن بان ہن است  
 از معانی زبید آفتاب باد آن تو بہ چہ آن ہن است

یہاں آنا اور عرض کر دینا مناسب ہے کہ عارف کی والدہ ماجدہ یعنی بنیادی بیگم کے تعلقاً شہ اسنے مشہور  
 نواب غلام حسین خاں سے اچھے نہیں رہے تھے اور نواسے بیگم کو سات ہزار روپیہ کی مالیت کا ایک  
 مکان دے کر علیحدہ کر دیا تھا فیروز پور بھکر کے بیگم کو سو پے پنشن ملتی تھی۔ عارف کی شادی شمس الدین احمد خاں  
 کی بیٹی بہن سے ہوئی تھی۔ نواب احمد بخش خاں ان کے ساتھ اپنے بیٹوں کا سا سلوک کرتے تھے۔  
 عارف کے بچے عارف کے دو بچے تھے باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ عارف کے انتقال کے بعد  
 غالب اور ان کی بیگم صاحبہ حسین علی خاں کو بیٹا بنا کر اپنے گھر آئے جب عارف کی والدہ یعنی بیگم  
 صاحبہ غالب کی بیٹی بہن کا انتقال ہو گیا۔ تو باقر علی خاں بھی غالب ہی کے پاس چلے آئے۔ غالب  
 کو ان دونوں سے غایت درجہ محبت تھی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ان کو کبھی آنکھ سے اوجھل نہیں  
 ہونے دیتے تھے۔ اگرچہ خود ہیچ تنگ مزاج تھے لیکن حسین علی خاں اور باقر علی خاں کے سارے نانا  
 اٹھاتے تھے۔ اور ان کی کسی بات پر بھی خفا نہیں ہوتے تھے۔

نشی ہر گوہر پال تفتہ کو لکھتے ہیں :-

سُو صاحب یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اب اس کے دونوں بچے

کہ وہ میرے پوتے ہوتے ہیں میرے پاس آ رہے ہیں۔ اور وہ بدتم مجھ کو سناتے ہیں میں تھک کر تا ہوں

اسی یہ حالات ہیں پنجاب گورنمنٹ کے اُن پائے کا مذاکے سطرہ کئے جو یکاڑ ڈاؤن میں موجود ہیں اور جو ریاست لوہارو سے تعلق رکھتے ہیں

خدا گواہ ہو کہ تم کو اپنا فرائض کھانا ملے گا۔ تمہارے نتائج طبع میرے معنوی دوست ہوتے ہیں۔ جب اس عالم کے دوستوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے مجھ کو دوپہر کو سوتے نہیں دیتے۔ شکے پائے پلنگ پر رکھتے ہیں کہیں اپنی لڑائی ہے کہیں خاک اڑا رہے ہیں میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی دوستوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں کیوں گھبراؤں گا۔

میر محمدی مخرج کو لکھتے ہیں :-

امروز باہر سب روزہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی ایک میں اور میرزا بیاض علی خاں روزہ خود میں دہی حسین علی خاں جس کا روزہ مرد ہے نکھلے منہ میں بھی بجار جاؤں گا۔  
رام پور کے دونوں مسافروں میں دونوں صاحبزادے ساتھ تھے رام پور سے بھیجے ہوئے تھے۔  
میں جابجا ان کا ذکر ہے۔ مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

دیکھ دو توں اچھی طرح ہیں کبھی میرا دل بہلا رہے ہیں کبھی مجھ کو تنہا ہے۔ بیکریاں بکرتیں ہیں۔  
نکل، لنگو اسب سامان درست ہے فروری کے مہینے میں دو درو پے دیے دس دن میں اٹھا ڈالے پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے (حسین علی خاں) کہ داواری کچھ ہم کو قرض حسد دو ایک روپیہ دونوں کو قرض حسد دیا گیا۔ بج ۱۴ روپے۔ مینا دو روپے۔ دیکھتے کے بار قرض لیں گے۔

ایک اور خط میں جو راستے سے لکھا گیا تھا فرماتے ہیں :-

دونوں فروردار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے میں چار گھڑی دن رہے اپڑکی سڑتے ہیں پہنچا دوں گا۔  
کو پیچھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا گھڑی بھر دن رہے فائدہ آیا میں نے چھٹا تک بھڑکیا۔  
کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی۔ شرب پی لی۔ کباب کھائے رکڑوں نے  
اور ہر کچھ ہی بکوائی خوب تھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھائی..... ہمارے بیچ  
دونوں بیویوں میں موافقت ہے۔ آپس کی صلاح مشورہ سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات نہ کہہ  
کہ حسین علی منزل پر ٹر کر پاؤں اٹھائی کچھ کھانے خریدتا ہے۔ جو نو بیواؤں کو کھا دیتے ہیں۔  
ہا پور سے آگے کے سفر کی کیفیت کے سلسلے میں فرماتے ہیں :-

دونوں گھڑے کوئل آتے۔ دونوں لڑکے رخت میں سوار آتے ہیں، اب وہ آتے کھانا کھالیا اور چلے  
تم اپنی آسانی (بگیم صاحبہ) کے پاس یہ رخت سراسر ٹپھ کرنا دینا۔

ایک اور خط میں رام پور ہی سے نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ چھڑے ادنا ٹھ چھوٹے کے دلی کو  
روانہ ہوئے دو آدمی میرے ان کے ساتھ تھے۔

باقر علی خاں کی ملازمت معلوم ہوتا ہے کہ باقر علی خاں غالب کی زندگی ہی میں اور غالب غالب کی سفارش  
سے الوریں ملازم ہو گئے تھے۔ اُردو کے معنی میں ان کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط میں ان کے روزگار  
کی درستی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے منشی دی ہے کہ تمہاری ترقی جلد ہوگی۔ آخر میں لکھتے ہیں:-  
تمہاری دادی ابھی طبع ہے۔ تمہارا بھائی ابھی طبع ہے۔ تمہارے گھر میں سب طبع خیر و عافیت ہے  
تمہاری لڑکی ابھی طبع ہے کبھی روز کبھی دوسرے دوسرے میرے پاس آتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی اور ملازمت کے بعد باقر علی خاں علیحدہ مکان میں چلے گئے تھے۔  
”سید حسین“ میں ایک قطعہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا باقر علی کے بچہ پیدا ہونے پر لکھا گیا تھا  
بدین زلف قدیم زلف میرزا باقر  
سروش تنینیت زبدہ مطالب گفت  
چو قصہ شد متعلق گفستن تاریخ  
طریق تعمیر وزید و جان غالب گفت  
جان غالب کے اعداد ہیں ”قصہ“ کے اعداد شامل کئے جائیں تو ۱۲۸۱ھ تا ۱۲۸۲ھ غلطی ہے۔

باقر علی خاں اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ اُردو کے معنی میں ان کا تخلص کامل  
ظاہر کیا گیا ہے لیکن فارسی کے ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تخلص باقر تھا۔ ممکن ہے اُردو  
میں کامل اور فارسی میں باقر تخلص کرتے ہوں حسین علی خاں بھی شاعر تھے۔ اخبار الصنادید سے معلوم  
ہوتا ہے کہ ان کا تخلص شاداں تھا۔ اور وہ نواب کلب علی خاں مرحوم کی سرکلاسے وابستہ تھے۔ خواجہ  
حالی فرماتے ہیں کہ غالب کی وفات کے بعد دونوں کا تھوڑی مدت میں انتقال ہو گیا۔



مستحقین کا خیال | غالب کو آخری ایام میں اپنے متعلقین کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا۔ کوئی جائیداد نہ تھی۔ آمدنی کے تمام وسائل صرف ان کی زندگی تک کھلے تھے۔ ان کی وفات کے بعد نہ خاندانی پنشن کے جاری رہنے کا کوئی امکان تھا نہ رام پورو والا وظیفہ قائم رہ سکتا تھا نہ دوسری فتوحات مل سکتی تھیں۔ اس لئے وہ بہت پریشان رہتے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں باصرہ لوہارو بلوار ہے تھے انہیں لکھتے ہیں :-

واللہ نہیں آسکتا۔ باللہ نہیں آسکتا۔ دل کی جگہ میرے پہلو میں پتھر بھی تو نہیں۔ دوست نہ سی دشمن بھی تو نہ ہوں گا۔ محبت نہ سی عداوت بھی تو نہ ہوگی۔ آج تم دونوں بھی (نواب امین الدین احمد خاں) اور نواب منیا مال دین احمد خاں) اس خاندان میں شرف الدولہ اور فخر الدولہ کی جگہ ہو میں لم بلدہ ولم بلدہ ہوں۔ میری وجہ تمہاری بہن میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری جتنی بھی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے (اس لئے کہ بھتیجی کی شادی نواب الہی بخش خاں معروف باد کوچک نواب احمد بخش خاں کے پوتے سے ہوئی تھی) نہ تمہارے واسطے بلکہ ان بکلیوں کے واسطے تمہارا دعاگو ہوں اور تمہاری سامانٹی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشا اللہ تعالیٰ ایسا ہی ہوگا کہ تم جیتے رہو اور میں تم دونوں کے سامنے مرجاؤں تاکہ اگر اس خاندان کے کو روٹی نہ دوں گے تو چنے تو دوں گے اگر چنے بھی نہ دوں گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ ہیں تو موافق اپنے تصور کے مرنے وقت ان غمزدوں کے غم میں نہ ابھوں گا۔

بیگم صاحبہ کی وفات | تحقیقی طور پر معلوم نہیں ہوگا کہ غالب کی بیگم صاحبہ کا انتقال کب ہوا۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو فرماتے تھے کہ غالباً غالب کے پانچ برس بعد انتقال ہوا۔ اس لحاظ سے بیگم صاحبہ کی تاریخ وفات ۱۸۷۷ء سمجھنی چاہئے۔ بہر حال یقینی ہے کہ غالب کی وفات کے وقت بیگم صاحبہ زندہ تھیں۔ لوہارو والوں کی طرف سے انہیں مستقل ملازمتی ہی بعض اصحاب کے معلوم ہوا کہ رام پور سے بھی وقتاً فوقتاً ان کے لئے کچھ رقم آتی تھی۔

غائبے ملازم | اس ضمن میں غالب کے ملازموں کا ذکر بھی مناسب ہے اگرچہ ابتدائی دور کو چھوڑ کر غالب کی مالی

لے خاندان لوہاروی بعض غائبے سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ کا انتقال چھ ماہ بعد ہوا تھا۔

حالت کبھی بھی اطمینان بخش اور غیر سقیم نہیں رہی۔ لیکن ان کا فوایانہ اور امیرانہ تھاٹھ آخر دم تک قائم رہا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ہر دور میں کم از کم تین چار ملازم ضرور رہے۔ ان کے خطوں میں کلیان نامی ایک ملازم کا ذکر بار بار آتا ہے جو کہار تھا خط ڈاک میں ڈالنا ہو یا رسل بھیجنا ہو چیزیں لانی ہوں یا کسی کے پاس پیغام بھیجنا ہو۔ کلیان ہی ان تمام کاموں کا انتہم نظر آتا ہے بعض خطوں میں آیا زماں ایک ملازم کا ذکر آیا ہے۔ چند خطوں میں کلو داروغہ کا نام دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً قربان علی بیگ ساکن کو لکھتے ہیں "کلو داروغہ کو ریش عرض کرتا ہے" کلو رام پور کے سفر میں بھی ساتھ تھا۔ چنانچہ حکیم غلام نجف کو لکھتے ہیں:-

میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش، کلو اچھا ہو گیا ہے۔ تنہا ہشتابی، خاکروب سرکار سے متین ہیں  
حجام اور دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔

حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے نام خط میں جعفر بیگ اور وفادار کے نام آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-  
کہ از ناٹھ ڈیڑھی پراکر جعفر بیگ وفادار وغیرہ کی تنخواہ بانٹ گیا ہے یا نہیں۔

عنایت احمد نامی ایک ملازم کا تذکرہ حکیم غلام نجف خاں کے نام کے خطوں میں آیا ہے مثلاً:-  
لڑکے بھی درست، آدمی بھی ترانا گراں ایک عنایت دودن سے کچھ پیار ہے فیڑا چھامو جائے گا۔  
ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

میں نے پیٹے پیٹے یہ سطر لکھیں اب عنایت انڈیکوتمار سے کھڑے ہو جا ہوں اور کچھ امٹکا تا ہوں  
کہ تپاواں کیا لکھا جاتا ہے۔

نواب علامہ الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط میں نیاز علی ملازم کا نام آیا ہے فرماتے ہیں:-  
باقری خاں اور حسین علی خاں میں ۱۴ مئی چھ بٹے اور آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے دو آدمی  
میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور راز کا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔

وفادار جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ملازمہ تھی۔ ایک خط میں نواب علامہ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-  
نواب دادا جن کو تم کچھ اور دکھائی دواں اب اب الدین احمد خاں، نواب ارشد ہیں۔ اب تہاری چھی

(بگم صاحبہ) نے انہیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر غلیت اور  
لنسا رہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ  
اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں  
کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کلائی  
کے ہیں (یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

غذریں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی۔ قلعہ کی تنخواہ بند تھی۔ حسا ندانی پیش  
مسدود تھی، کوئی ذریعہ معاش باقی نہ تھا۔ زیور لٹ چکا تھا۔ کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔  
لیکن اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یوسف مرزا کو  
لکھتے ہیں :-

آب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے ہیں، چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایا ز باہر  
مداری کے جو رو بچے بہ دستور گویا مداری موجود ہے۔ میان گھن گئے ہمیں پھر سے آگئے،  
کہ بھوکا مارتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں میں آدمی روٹی  
کھانے والے موجود۔

مداری کا ذکر ایک فارسی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب نوٹارو لکھتے تھے۔ وہاں کچھ سامان  
چھوڑ آئے تھے۔ وہلی سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :-

مداری خاں مے رسد و نامہ رائے رساند آنچه از کالائے ناروائے من دوا بخا باشد  
بہ ذمے سپارند۔

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی وادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس  
قطب صاحب گئے ہوئے ہیں۔ ایا ز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں ایک عاوا  
دو آداب ملتوی۔ دوا، کلو اور کلیان کی بندگیاں بھیجیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

فرض دینے والا میرا ایک سٹار وہ سود ماہ یہ ماہ لیا چاہے مول میں قسط اس کو دینی پڑے  
انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، پنچے جُدا، شاگرد پیشہ جُدا،  
آمد دہی ایک سو باسٹھ۔

اس خط سے بھی ظاہر ہے کہ نوکروں کی قیمتی غاصی فراوانی تھی۔

غالب باوجود قلت آمد و فراوانی مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ رام پور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کدرا ناٹھ نے فلاں فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

ہاں بھائی گھر میں پوچھ لینا کہ کہارنا تھ لے اندر باہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تاک کی بھی تنخواہ بھیجی دی ہے۔

جوانی کی زندگی | یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ غالباً ترقی پر ہمیں گار اور تہی گزار نہ تھے۔  
 علی الخصوص ان کی جوانی طرح طرح کی رنگینیوں اور آواز و مشربیوں میں گزری تھی۔  
 بعض واقعات کے اشارے ان کشتیوں میں بھی ملتے ہیں۔

میرزا احمد نے اپنی محبوبہ کی وفات کو بہت محسوس کیا تھا۔ انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنا مشرب بھی بیان کرتے ہیں :-

ابتداء سے شبہا بہا میں ایک، مرشد کمال۔ نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مائع فسق و فجور نہیں پیو کھاؤ، مرنے اڑاؤ مگر یہ یاد رہے کہ مہرزی کی لکھی ہوئی شہد کی لکھی تہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ . . . . کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خواہی، ازادی کا شکر ہی لاؤ، غم نہ کھاؤ۔

*[Handwritten signature]*

## اسماء

۲۱ مئی ۱۹۳۲ء کے ٹائٹلز آف انڈیا میں ”بی بی گورنر“ ۲۱ مئی ۱۹۳۲ء کی اشاعت سے بعض اقتباسات شائع ہوئے تھے۔ جن میں ایک اقتباس خاندان لوہارو کے متعلق تھا۔ یہ اقتباس میری کتاب ”باب دوم“ سے متعلق ہے۔ افسوس کہ کتاب اس سے قبل لکھی جا چکی تھی۔ لہذا اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اُسے بطور استدراک یہاں درج کیا جائے۔

”سننے میں آیا ہے کہ سوال اٹھایا گیا ہے آیا حکومت فیروزپور جسٹس کی جاگیر کو ضبط کرنے کی مجاز ہے؟  
یعنی ریٹائرمنٹ کے بعد اسے کوئی بیڑہ نہیں ملتا ہے کہ اس کی جاگیر بھی ضبط کر لینی چاہیے؟ اگر اسے تعلق  
قانونی ان صاحبانہ رائے کی جراثینگی تو ہمیں یقین ہے (اس تحقیقات میں) ان کا کافی وقت صرف ہو گا  
یہ ایک اہم قانونی مسئلہ ہے۔

”بیان کیا جاتا ہے کہ شمس الدین کا بھائی امین الدین نے جو جائیداد کا قانونی وارث ہے مندرجہ ذیل دجہ کی بنا پر اپنا حق قائم کرنے کے لئے آراجمع کر رہا ہے۔

”فیروز پور جھک کی جاگیر شمس الدین خاں کے والد نواب حمایت خاں کو دوا می طور پر دی گئی تھی۔ نواب حمایت خاں نے حکومت کو بتا کر اور اس کے اتفاق رائے سے شمس الدین کی دفاتر پر یا دوسرے اسباب پیش آنے پر امین الدین خاں کو اس کا جانشین مقرر کیا۔“

”جس جرم کے اثبات پیش الدین کو سزا موت ملی وہ محض ارتکابِ قتل تھا۔ حکومت اسے بغاوت مانتی تھی اور ضبطی جاگیر کا حکم صرف بغاوت کی بنا پر جاری سمجھا جاسکتا ہے۔“

”ہم نہیں کہہ سکتے کہ حوصلہ الاذعویٰ کس حد تک درست ہے۔ اس کا فیصلہ ہم ان صحابہ پر چھوڑتے ہیں جو قانون کی باریکیوں سے آگاہ ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابراہیم الیمین کو ہندوستان میں کیا جی نہ ہو گی تو ان کا ارادہ ہے کہ مقدمہ انگلستان لے جائیں۔“



# تیسرا باب

## دہلی میں سکونت اور مکان

وہ اندریاست دہلی نئے زعم غالب  
منم ز خاک نشینان آں دیار یکے

غالب دہلی میں کب آئے | دہلی میں غالب کی آمد و رفت سات برس کی عمر سے شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں۔

اے میری جان یہ دہلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دہلی نہیں جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے وہ دہلی نہیں جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں بچھڑے پڑھتے آتے تھے۔ وہ دہلی نہیں جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دہلی نہیں جس میں اکبادن برس سے مقیم ہوں۔ یہاں کبھی پہلے مسلمان اہل عرفہ یا حاکم کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہندو۔

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہے کہ دہلی میں آکر ابتدا میں شعبان بیگ کی حویلی میں رہے۔ تھے۔ جہاں نواب علاء الدین احمد خاں ان سے پڑھنے جاتے تھے۔ اگر اکبادن برس کی مدت کو درست مانا جائے تو یہ بھی ظاہر ہے کہ غالب نے ۱۸۶۱ء کے قریب جبکہ ان کی عمر چودہ پنرہ برس کی ہوگی دہلی میں سکونت اختیار کی۔

لیکن وہ نشی و نشوونما آرام مالک مدتیہ غلام الحق (آگرہ) کو ان کے دادا نشی و نشی صحر کے حالات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شاید نشی و نشوونما ایک و برس چلتے ہوں یا چھوٹے ہوں انیس برس کی میری عمر اسی ہی عمر ان کی۔ بہت شہر میں اور اختلاف تھا۔ آدھی آدھی رات گزار رہا تھا۔ چوگر گھران کا بدلتا ڈیر تھا اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔

ابنیم صاحبہ نے انہیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور  
ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ بچہ وہ محل سے نکلیں گی تو ممکن نہیں کہ  
اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں۔ ممکن نہیں  
کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کھائی  
کے ہیں (یعنی یہ پھول تمہارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں)

غدر میں غالب کی تنگ دستی حد سے گزر چکی تھی۔ قلعہ کی تنخواہ بند تھی۔ سناندا فی پش  
مسدود تھی، کوئی ذریعہ معاش باقی نہ تھا۔ زیور لٹ چکا تھا۔ کپڑے بیچ بیچ کر گزارہ کرتے تھے۔  
لیکن اس حالت میں بھی بیس آدمیوں کی کفالت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یوسف مرزا کو  
لکھتے ہیں :-

اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں۔ ایک بیوی، دو بچے ہیں، چار آدمی گھر کے۔ کلو، کلیان، ایاز باہر  
مداری کے جو روپیچے یہ دستور گویا مداری موجود ہے۔ میاں گھن گئے جینے پھر سے آگئے،  
کہ بھوکا مرتا ہوں۔ اچھا بھائی تم بھی رہو۔ ایک پیسے کی آمد نہیں میں آدمی روٹی  
کھانے والے موجود۔

مداری کا ذکر ایک فارسی خط میں بھی آیا ہے۔ غالب لو مارو گئے تھے۔ وہاں کچھ سامان  
چھوڑ آئے تھے۔ وہاں سے علی بخش خاں کو لکھتے ہیں :-

مداری خاں سے رسد و نامہ راسے رساند آنچه از کالائے ناروائے من در آنجا باشد  
بہ سے سپارند۔

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اپنی دادی کے ساتھ ضیاء الدین خاں کی والدہ کے پاس  
قطب صلیب گئے ہوئے ہیں۔ ایاز اور نیاز علی ان کے ساتھ ہیں۔ دو بندگیاں ایک عاؤ  
دو آداب ملتوی۔ دو، کلو اور کلیان کی بندگیاں بھی ہیں۔

اب اور خط میں لکھتے ہیں :-

قرض دینے والا میرا ایک مختار وہ سود ماہانہ ماہ لیا چاہیے مول میں قسط اس کو دینی پڑے  
 انکم ٹیکس جُدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جُدا، بچے جُدا، شاکر دہیشہ جُدا،  
 آمد دہی ایک سو باسٹھ۔

اس خط سے بھی ظاہر ہے کہ نوکروں کی اچھی خاصی فراوانی تھی۔

غالب باوجود قلت آمد و فروافی مصارف ملازموں کی تنخواہیں ادا کرنے میں بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ رام پور گئے تو پوچھتے ہیں کہ کدرا ناٹھ نے فلاں فلاں کی تنخواہ ادا کر دی یا نہیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

ہاں بھائی گھر میں پوچھ لینا کہ کہارنا تھ نے اتار یا ہر کی تنخواہ بانٹ دی؟ میں نے تو وفادار اور حلال خوری تک کی بھی تنخواہ بھیج دی ہے۔

جوانی کی زندگی | یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ غالباً متقی، پرہیزگار اور تہجد گزار نہ تھے۔ علی الخصوص ان کی جوانی طرح طرح کی نیگنیوں اور آزاد مشربیوں میں گزری تھی۔ بعض واقعات کے اشارے ان کے خطوں میں بھی ملتے ہیں۔

میرزا افسر نے اپنی محبوبہ کی وفات کو بہت محسوس کیا تھا۔ انہیں صبر کی تلقین کرتے ہوئے اپنا مشرب بھی بیان کرتے ہیں :-

ابتداءً شباب میں ایک مُرشد کمال نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو کھاؤ، مریسے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مہری کی مکھی بنو، شہسکی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ۔۔۔۔۔ کیسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی، آزدادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ۔



اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالبؒ نے آپس میں برس کی عمر تک آگرہ کی سکونت ترک نہیں کی تھی۔ اگر اسے درست سمجھا جائے تو دہلی میں ان کی مستقل سکونت ۱۸۱۵ء کے بعد ہوئی، غالبؒ نے ۱۸۱۸ء میں ہوتی ہو۔

میر غلام علی صاحب مدرس مدرسہ اکبر آباد کے نام فارسی خطوط میں ایک خط ہے جس میں اپنی مالی پریشانیوں اور پڑھنے کے سلسلے میں چارہ جہتی کے لئے سفر کلکتہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-  
روزگار بگشت، کار ساختہ شد، صورت تباہی گرفت، اکنون شش سال است که خانهاں بباد داده  
دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ بہ کچھ مشتہام دور آئینش بروئے بیگاہ و دشناستہ۔

غالبؒ نے ۱۸۳۳ء میں کلکتہ سے واپس آئے۔ لہذا مندرجہ بالا خط ۱۸۳۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں اپنے دامہ مفارقت کی نسبت لکھتے ہیں:-

درازی زمان فراق کہ بہ گمان خودم شانزدہ سال است بہ دہشت نامہ نگار کم از بہت سال غیبت۔  
اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۳ء میں غالبؒ کو آگرہ چھوڑے ہوئے قریباً بیس برس گزر چکے تھے۔  
اس حساب سے دہلی میں مستقل سکونت ۱۸۱۸ء یا ۱۸۱۹ء میں اختیار کی گئی۔  
کچیاں گولی خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالبؒ نے دہلی میں کوئی مکان اپنے لئے نہیں خریدا تھا:-

ہمیشہ کراپہ کے مکانوں میں رہائے۔ یا ایک مدت تک میاں کالے صاحب کے مکان میں بغیر کراپہ کے  
رہے تھے جب ایک مکان سے جی اگتا یا اسے چھوڑ کر دوسرا مکان لے لیا۔ مگر قاسم جان کی مہلی یا جیش  
کے پھاگ یا اس کے قرب و جوار کے سوا کسی اور ضلع میں جا کر نہیں رہے۔ سب کے اجیر مکان جس میں کا  
تہال ہو، کلیم محمود، مال مرحوم کے دیوان خانہ کے متصل مسجد کے عقب میں تھا جس کی نسبت وہ لکھتے ہیں  
مسجد کے زیر سایہ اک گھر نہا لیا ہے

یہ بندہ کیسہ ہمایہ خدا ہے

شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں پڑے خدا پرست اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ آپ کے والد شیخ  
قطب الدین اور دادا شیخ فخر الدین تھے۔ جن کا سلسلہ تخلص شیخ کلیم اللہ جان آبادی تک پہنچتا ہے شیخ

نصیر الدین بہادر شاہ سے پیچھے۔ غالب کے ساتھ آپ کو بہت محبت تھی۔ اپنی ایک جوہلی غالب کو رہنے کے لئے معنت عطا کر دی تھی۔ اور دربار شاہی میں غالب کی ملازمت بھی آپ ہی کے وسیلہ سے ہوئی۔ شعبان بیگ کی جوہلی کے بعد سب سے پہلا مکان جس میں غالب کے قیام کا پتہ چلتا ہے۔ کالے میاں کی جوہلی ہی تھی۔ یہ جوہلی اب بھی گلی قاسم جان میں موجود ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب اپنی قید کے بعد تک اسی جوہلی میں رہتے تھے۔ قید کا واقعہ ۱۸۵۷ء میں پیش آیا تھا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ مشہور ہے کہ قید سے رہا ہونے پر کسی دوست نے ہمارا کجاودی تو فرمائے گئے کون کتنا ہے میں قید سے رہا ہوا ہوں پہلے ”گورے“ کی قید میں تھا اب ”کالے“ کی قید میں۔ حکیم محمد حسن خاں کی جوہلی | کالے میاں کے مکان کو چھوڑ کر غالب نے حکیم محمد حسن خاں کی جوہلی کراہ پیرلی۔ وہ اس جوہلی میں اپنی سکونت ۱۸۵۷ء سے بتاتے ہیں، غدر کے بعد وہلی میں جو حالات پیش آ رہے تھے ان کا ذکر کرتے ہوئے میر ہمدی تخریج کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

✱ سب تھاؤں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے شک تقسیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہوئے گئے۔ یہاں کا جہاد جیسے کہ اس بھی آیا ہیں نے کہا بھائی تو مجھے نقشے میں نہ رکھو۔ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھو۔ لکھو کہ اسداٹھ خاں پٹن دار ۱۸۵۷ء سے حکیم ثبیانے والے کے بھائی کی جوہلی میں رہتا ہے۔

لیکن میر خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء والی تاریخ درست نہیں۔ وہ ۲۰۵ راج ۱۸۵۲ء کے ایک مکتوب میں تفتہ کو لکھتے ہیں :-

میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ آیا ہوں اور جلی اماں میں ایک جوہلی کراہ پیرے کر میں رہتا ہوں۔ تفتہ غالب کے ساتھ مسلسل خط و کتابت رکھتے تھے۔ یہ ظاہر یہ امر متنبہ معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کو اس میں تک تبدیلی مکان کی اطلاع نہ ملی ہو۔ میر خیال ہے کہ غالب اور آخر ۱۸۵۷ء یا اوائل ۱۸۵۸ء میں کالے صاحب والا مکان چھوڑ کر حکیم محمد حسن خاں کی جوہلی میں آئے اور جولائی ۱۸۶۱ء تک اس مکان میں رہے۔ حکیم محمد حسن خاں کے بھائی مارا چوٹیار کے لازم تھے وہ پٹیارہ والے حکیم شہر تھے حکیم محمد حسن اسی خاندان میں سے تھے ۱۱

وہ علامہ الدین خاں کو سخت پریشان کرتے ہیں :-

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی چوٹی میں رہتا ہوں۔ اب وہ چوٹی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ چوٹی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو چوٹیاں قریب ہمدردی ملیں کہ ایک محل سرسے اور ایک دیوان خانہ ہو۔ نہ ملیں ناچار یہ چاہا کہ بلی ماراں میں ایک مکان ایسا لے۔ جس میں جا دوں نہ ملے۔ تہا دی چھوٹی چھوٹی بیگنیں نوازی کی کر ڈالو الی چوٹی مجھ کو رہنے کو دی تھیں وہ رعایت مرعی نہ رہی کہ محل سرسے قریب ہو۔ مگر بہت دور بھی نہیں کل یا پرسوں وہاں جا دوں گا ایک پاؤں زمین پر ہے ایک پاؤں رکاب میں تو شہ کا وہ حال گوشہ کی یہ حدوت۔

اسی مکان کی نسبت ایک خط میں منشی ہر گوپال تھتہ کو لکھتے ہیں :-

دس گیارہ برس سے اس مکان میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چاند دے کر یہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کہ یہ کچھ اور پورے دو پیک مشٹ دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا جس نے لیا ہے (یعنی غلام اللہ خاں نے) پیام بلکہ بڑا کم کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں سے تراشوں۔ بے دم نے مجھ کو عاجز کیا اور دنگا دی وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے۔ اس میں پاؤں بندہ گئی رات کو وہیں سونا گری کی شدت پاؤں کا قریب گمان یہ گزنا تھا کہ یک شکر ٹپے اور صحن کو مجھ کو بچانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزاریں دو شنبہ ۹ جولائی (۱۸۵۶ء) دوپہر کے وقت مکان ہاتھ آگیا۔ وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔

حکیم محمد حسن والے مکان میں بہت آرام نہ تھا۔ غالب ایک خط میں جو پنشن کی بندش کے زمانے

کا لکھا ہو اسے یعنی (۱۸۵۸ء یا ۱۸۵۹ء) میر ہمدی مخرج کو لکھتے ہیں :-

برسات کا حال نہ چھو بندہ اکا قمر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادۂ خاں کی نرسے میں جس مکان میں رہتا ہوں عالم بایکے کٹرہ کی طرف کا۔ واڑہ گر گیا مسجد کی طرف کے دالان کو جلتے ہوئے جو دروازہ تھا گر گیا۔ بیڑھیاں گر چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھے کا حجرہ جھک رہا ہے چھتیں چھینی ہو گئی ہیں۔ زمین گھڑی گھڑی تو چھت گھٹتہ بھر رہی ہے۔ کتا بین قلمدان سب تو شہ خانہ میں فرش پر ہیں گمن رکھا ہوا ہے کہیں بھی دھری

ہوئی۔ خط کہاں ٹیچہ کر لکھوں۔

لیکن غائب سے اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک نئے مالک مکان نے انہیں پے پے پے تقاضوں سے نہ نکالا۔

حکیم صاحب والے مکان کا کرایہ چار روپے ماہانہ تھا۔ جب تک ٹینشن کھلی تھی کرایہ ماہ بہ ماہ ادا کرتے تھے۔ غدریں ٹینشن بند ہو گئی تو تین برس کا کرایہ چھ گیا یہی سبب تھا کہ میں چڑھی ہوئی ٹینشن ایک مسٹری کو چھڑھا ہوا کرایہ ایک مسٹری ادا کروا دیا۔ کروڑا ل والی جو ملی جس کا ذکر جولائی ۱۹۶۲ء کے مکتوب میں ہے غالباً کرایہ پر نہیں لی تھی بلکہ مفت رہنے کو لگتی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اس جو ملی میں کب تک رہے۔

نیا مکان | میرزا خیال ہے کہ بعد ازاں انہوں نے کرایہ پر ایک مکان لے لیا تھا۔ اس لئے کہ جولائی ۱۹۶۳ء کے ایک خط (موسومہ ذوالعلا رالدین احمد خاں) میں فرماتے ہیں کہ برسات کی شدت کے باعث مکان میں تکلیف سے مینہ بند ہو تو مالک مکان مرستہ کرادے۔

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرکی دیواریں گر گئی ہیں۔ پانچاٹھ ڈیگیا پچیس ٹپک رہی ہیں۔ تہریا پھوپھی دیگر صاحبہ غائب، کہتی ہیں مائے دینی، مائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل مرستہ بدتر ہے۔ میں مرستے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں چھت چھلنی ہو گئی ہے۔ اب دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرستہ کرے تو کیوں کر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو۔

پھر آٹھ مرستہ میں بیٹیا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی (ذوالعلا رالدین احمد خاں) سے مجھ کو وہ جو ملی جس میں میرن رہتے تھے۔ اپنی چھوٹی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالان زیریں جو الہی بخش خاں مرحوم کا بسن تھا میرے رہنے کو دوا دو۔ برسات گزر جائے گی۔ مرستہ ہو جائے گی۔

پھر صاحب لوگ (ذوالعلا) اور سیم دیگر صاحبہ اور بابا لوگ دبا قر علی اور عین علی خاں) اپنے قدیم بسن میں آ رہیں گے۔ تمہارے والد (الدین احمد خاں) کی ایشاور عطا کے جہاں مجھ پر ادرا احسان ہیں ایک یہ مرستہ کا احسان میرے پاپا یاں کرادو سی۔

۱۲ سیم دیگر صاحبہ غالب جو علا رالدین احمد خاں کے والد کی عم زاد بہن تھیں



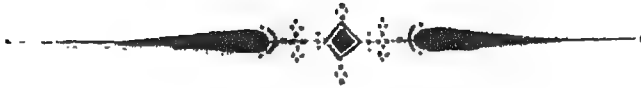


کہیں اُکھال وان رکھ دیا۔ قلمدان کتنا میں اُٹھا کر توشہ خانہ کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرست کی نظر  
مرستہ چھپیں کشتی فوج میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی۔

مکان اگرچہ اپنا کبھی نہیں بنوایا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کبھی اچھا مکان نہ ملا لیکن مذاق اس باب میں  
بھی بے نفیس اور عمدہ تھا حکیم غلام نجف خاں نے غالباً ایک مکان تجویز کیا تھا۔ اس کے ضمن میں حکیم صاحب  
کو لکھتے ہیں :-

حضرت غور کی جگہ ہے۔ ایک مکان دکشا کوچے کی سیر۔ بازار کا تماشا۔ دو کمرے۔ دو کوٹھریاں آتش دان  
صحن دسین، اس کو چھوڑ کر وہ مکان لوں جو ایک تنگ گلی کے اندر ہے۔ دروازہ تار یک کہ دن کو بغیر  
چراغ کے راہ نہ ملے۔ اور پھر ڈیڑھ سی پھلال خودوں کا بنے۔ گروہ کے ڈیڑھ کپڑے میں حلال خوری بکاوہ بگ رہا  
ہے کہیں بلی بندھا ہوا ہے کہیں کوڑا پڑا ہوا ہے۔ عیاذ باللہ خدا دے جاسے ایسے مکان ہیں۔

Nihal Kureshi



# چوتھا باب

## سفر کلکتہ

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد  
نہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

سیاحت کے متعلق غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں دو متضاد رائیں ملتی ہیں۔ فارسی کا ایک مکتوب میں رائے پھیل کو لکھتے ہیں:-

جلاد وطن، عزم سفر و آلام غربت مصیبت است کہ نصیب بیجا آفریدہ مباد۔

اردو کے ایک خط میں سیف الحق میاں داو خاں سیاح کو تحریر فرماتے ہیں:-

میں تم سے توقع رکھتا ہوں کہ جس طرح تم نے لکھنؤ سے بنارس تک کے سفر کی سرگزشت لکھی ہو

اسی طرح آئندہ بھی لکھتے رہو گے میں سیر و سیاحت کو بہت دوست رکھتا ہوں۔

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گزرد

نہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

شت

خیر اگر سیر و سیاحت میرزا سہی ذکر العیش نصف العیش پر قناعت کی میاں داو خاں سیاح کی سرگز

سیر و سفر ہی تھی۔

ان دونوں رایوں میں تطبیق مشکل نہیں صرف انسان جان لینا کافی ہے کہ پہلی رائے حالت سفر میں ظاہر کی گئی دوسری رائے حالت حضر میں مرقوم ہوئی۔ غالب سیر و سیاحت کو وقتی دوست لکھتے تھے لیکن نازک فرحی کے باعث ان شاید کے تحمل اور ان بحالیف کی برداشت تھے اہل نہ تھے جو لازماً سفر میں اس لئے جب خود سفر میں تھے اور قدم قدم پر مختلف تکلیفیں پیش آتی تھیں یا دور



لی بے فکری اور فراغت بال میری تھی تو پکار اٹھے کہ غربت کے آلام خدا کرے کسی کو نصیب نہ ہوں،  
لیکن جب حالتِ حضر میں دو سے شخص کے سفر کے دلچسپ اور دلکش حالات پڑھے تو آرزو پیدا ہوئی  
کہ ایسے حالات مسلسل و متواتر ملتے جائیں تاکہ لطف اندوزی کے سلسلے میں انقطاع پیدا نہ ہو۔

سفرِ کلکتہ کی تاریخ | غالب نے لمبا سفر صرف ایک کیلے یعنی کلکتہ کا سفر جس میں وہ کچھ کم تین برس دہلی سے باہر  
رہے۔ یہ سفر خاندانی مہین کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اس کی تاریخ  
کے متعلق ایک عجیب غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ جو خود غالب کی ایک تحریر سے پیدا ہوئی وہ فرماتے ہیں  
کہ ۱۸۳۳ء میں کلکتہ گیا تھا۔ تمام سوانح نگاروں نے بلا تحقیق اس بیان کو تسلیم کر لیا، اور نہیں سوچا کہ  
یہ بیان غالب کی بعض دوسری تحریرات سے مطابقت نہیں کھاتا۔ تاریخ کے متعلق غالب کا معمول  
استغجاب نہ تھا لیکن ان کے وہ فصل بیانات اس سہو کی بنا پر غلط نہیں مانے جاسکتے تھے جو ان کی قاسمی  
نثر میں جا بجا موجو ہیں۔ میرزا خیال ہے کہ غالب کے کسی سوانح نگار نے ان کی انتہائی نایاب بالاستغجاب نہیں  
پڑھی تھیں۔ یا ترتیب سوانح کے وقت ان تصانیف سے پوری مدد نہیں لی تھی۔ خواجہ حاکمی مرحوم بھی  
اس زمرہ سے تھے نہیں ہیں۔

۱۸۳۳ء کے بیان کی غلطی کے وجہ | ۱۸۳۳ء کے بیان کی غلطی کے وجہ ذیل میں وجہ ہیں :-

(۱) غالب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروزپور جہر کہ زندہ  
تھے۔ کلکتہ کے راستے میں غالب کو نواب صاحب کے انتقال کی خبر ملی تھی۔ وہ خود کلکتہ سے میرزا  
علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :-

میرزا فضل مولے خاں نام یا سہ دستم اور ناگزرت در عرض راہ خبر شد در زاد گشتگو راہ پرس و جو با کہ رفت  
از ما سہ گزشتن بخبر الدولہ (نواب احمد بخش خاں) پس خبر داد۔ ہا وہ کلکتہ میرزا فضل بیگٹ و دیگران بگفتند آؤخ  
کہ چراغ روشن این دو ماں مرود۔

نواب احمد بخش خاں کے متعلق معلوم ہے کہ ان کا انتقال اکتوبر ۱۸۳۳ء مطابق ربیع الاول ۱۲۵۳ھ

۱۲ اردو سے پہلے صفحہ ۲ (خطِ نامِ منشی حبیب اللہ خاں نو کا حیدر آبادی)

۱۸۳۳

میں ہوا ان کی تاریخ وفات میں مقام خمد الدولہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ غالب (۲)  
۱۸۳۷ء سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔

(۲) غالب کلکتہ جانے ہوئے لکھنؤ میں ٹھہرے تھے ان کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ  
اس زمانے میں محمد الدولہ آغا میر اودھ کے نائب السلطنت اور وزیر اعظم تھے۔ یہ معلوم ہے کہ تقریباً  
آغا میر غازی الدین حیدر کی وفات تک۔ جو ۱۹ اکتوبر ۱۸۳۷ء مطابق ۲۷ ربیع الاول ۱۲۵۳ھ  
واقع ہوئی تھا راکل رہے اس کے بعد نصیر الدین حیدر کا عہد شروع ہوا۔ چند ماہ کے اندر اندر آغا میر  
برطرف ہو گئے۔ اور ان کی جگہ اعتماد الدولہ فیصل علی نائب السلطنت بنے۔ غالب بہر حال  
کے اقتدار کے زمانے میں لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اور یہ واقعہ ۱۸۳۷ء سے بعد کا نہیں مانا جاتا۔

(۳) غالب نے کلکتہ پہنچ کر اپنا مقدمہ کونسل میں پیش کیا تھا تو کونسل کے ممبروں میں ایک شخص ولیم ہیلی تھے  
جن سے متعلق غالب ایک کتوبیہ میں فرماتے ہیں کہ ولیم ہیلی سیاحت کے لئے براہِ چلے گئے تھے  
مقدمہ کونسل میں پیش ہونے کے بعد غالب کم و بیش دو برس کلکتہ میں رہے۔ اور ولیم ہیلی  
میں ٹپن لے کر تمام کاروبار سے سبک دوش ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ غالب ولیم ہیلی کے پرنسپل  
سے کم از کم دو برس قبل ضرور کلکتہ پہنچ گئے ہوں گے۔

(۴) غالب کا مقدمہ کونسل میں پیش ہوا تھا تو اس وقت حکومت ہند کے چیف سیکرٹری مسٹر اینڈر  
تھے۔ وہ غالب کے خاص ہمدرد بن گئے تھے ان کی وجہ میں غالب نے پچپن شعر کا ایک قصیدہ لکھا  
جو ان کے فارسی کلیات نظم میں موجود ہے مسٹر اینڈر نے ۳۱ مئی ۱۸۳۷ء کو وفات پائی تھی  
لے ان کی وفات پر جو قطعہ لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں:-

بصد نشاط سی و پنج سالہ دنیا جہیدہ رفت جواناں خیاں روچین  
بہ روز بخت و سونم اڑی بہنگا کہ دوشہر و کسبم بہرین تو کیں

۱۷ کلیات غفر فارسی صفحہ ۶۵ و نحوہ ۱۵ کلیات غفر فارسی صفحہ ۶۹ و کثیری آف انڈین یادگرافی صفحہ ۱۵۵

فارسی صفحہ ۱۶۷ کلیات غفر فارسی صفحہ ۶۸ و کثیری آف انڈین یادگرافی صفحہ ۱۱۵

ہزار و ہشت صد سی زعمد عیسٰیؑ کہ جست برق جہاں میں الم کیوں  
غالب سٹراپیڈ ریواسٹرنگ کی وفات کے وقت کلکتہ سے دہلی واپس آچکے تھے۔ لہذا ان کے سفر  
کلکتہ کی تاریخ اس واقعہ سے کم و بیش تین برس قبل مانتی چاہئے۔  
(۵) خواجہ غلام غوث خاں تاجر کے نام کے ایک خط سے مستفاد ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۲۹ء میں کلکتہ سے  
واپس آئے۔ فرماتے ہیں:-

حضرت وہ شعر نکالی زبان کا ۱۸۲۹ء میں منیافت طبع احباب کے واسطے کلکتہ سے ارغوان لایا ہوں  
صحیح ہیں ہے ۵

تم کہے تھے رات میں آئیں گے سو آئے نہیں

قبلہ بندہ رات بھر اس غم سے کچھ کھائے نہیں،

بہر حال یہ ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء میں کلکتہ جانے کا بیان کسی حالت میں بھی قابل تسلیم نہیں میرا  
خیال ہے کہ یہ طباعت کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اگر طباعت کی غلطی نہیں ہے تو ماننا چاہئے کہ غالب کو سہو ہوا  
اور چونکہ یہ خط سفر کلکتہ سے کم و بیش چالیس برس بعد لکھا گیا تھا۔ اس لئے تاریخ کے باب میں بہت بعد نہ تھا  
دہلی سے روانگی | اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب کب دہلی سے روانہ ہوئے؟ اور چونکہ عرض کیا چکا  
اس سے ظاہر ہے کہ وہ اکتوبر ۱۸۲۹ء سے چند ماہ قبل دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔ ایک فارسی کتب  
میں وہ فرماتے ہیں کہ ۲۶ رزی قعدہ کو لکھنؤ سے چل کر ۲۹ رزی قعدہ کو کان پور پہنچا۔ اس میں سال بڑ نہیں  
لیکن اس کا فیصلہ شکل نہیں ذاب احمد بخش خاں کی وفات۔ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ میں ہوئی اور اس وقت  
غالب کلکتہ سے قریب پہنچے ہوئے تھے۔ اس لئے ماننا چاہئے کہ وہ قعدہ ۱۲۳۲ھ میں لکھنؤ میں تھے۔  
اس لئے میں غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ تھے میرزا دیکھا غالب ہے کہ وہ ۱۲۳۲ھ کی عید شوال کے بعد دہلی سے  
روانہ ہوئے ہوں۔

خواجہ حالی کا بیان | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ پہنچے تھے تو نصیر الدین حیدر فرماؤں

اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ خواجہ مرحوم کا یہ سہوحد و رنج و تعب انگیز ہے۔ غالب کی متعدد تحریریں  
میں صراحتاً مرقوم ہے کہ ان کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں محمد الدولہ غامیز نائب السلطنت تھے۔  
کے بعد اعتماد الدولہ فیض علی نائب السلطنت بنے۔ ان کے بعد نظم الدولہ حکیم محمد علی خاں کو نیابت کا  
عطا ہوا حکیم صاحب کے بعد نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ نائب السلطنت اور وزیر اعظم بنائے گئے۔ اس وقت  
نائب کو سفر کلکتہ سے واپس آئے ہوئے کم و بیش دو برس گزر چکے تھے۔ خواجہ مرحوم کو یہ سہو غالباً اس  
سے ہوا کہ نصیر الدین حیدر کے قصیدہ میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے۔ اگر غالب کی تمام تحریرات خواجہ  
کے پیش نظر ہوتیں تو یہ سہو ان کے شہر نہ ہوتا۔ خواجہ صاحب کا یہ ارشاد بھی درست نہیں کہ لکھنؤ ہوئے ہوئے  
کلکتہ جانے کے وقت غالب کی عمر کچھ کم چالیس برس کی تھی۔ دہلی سے روانگی کے وقت غالب کی  
سین قمری کے اعتبار سے چند ماہ اور تیس برس کی ہوگی۔ سین شمس کے اعتبار سے چند ماہ کم تیس برس  
کی ہوگی۔ اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ خواجہ صاحب نے سفر کلکتہ کے متعلق ۱۸۳۳ء کے بیان کو صحیح قرار  
دے لیا تھا تو اس حالت میں بھی غالب کی عمر زیادہ سے زیادہ تینتیس برس کی ماننی چاہئے تھی۔ اس  
دوسرا بحث کی کتاب تینتیس برس کی مدت کو کچھ کم چالیس برس سے تعبیر کرنا سخن طریق بیان نہیں ہے۔  
سفر کلکتہ کی غرض اور عرض کیا جا چکا ہے کہ سفر کلکتہ خاندانی فیشن کے مقدم میں قانونی چارہ جوئی کے  
لئے اختیار کیا گیا تھا۔ اس مقدمہ کے تفصیلی حالات ایک ملحدہ باب میں بیان ہوں گے۔ یہاں اختصار  
یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ غالب کے خیال کے مطابق انہیں جرنیشن فیروز پور جھڑ کے ملتی تھی وہ مقررہ  
سے کم تھی۔ غالب کا دعویٰ یہ تھا کہ انہیں اور دوسرے اہل خاندان کو دس ہزار روپے سالانہ  
چاہئیں۔ فیروز پور جھڑ کے واسطے تین ہزار روپے سالانہ دیتے تھے جب تک فیروز پور جھڑ کی عثمان نظم و  
نواب احمد بخش خاں کے ہاتھ میں رہی۔ غالب خاموش بیٹھے رہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ نواب صاحب  
پٹن کے علاوہ بھی غالب کی ادا و فرماتے رہتے تھے لیکن جب نواب صاحب نے ۱۸۲۶ء میں اپنے  
بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو سند نشین کر کے خود گوشہ نشینی اختیار فرمائی تو جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اور غالب

پوری نیشن کے لئے چارہ جوئی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نواب سر امیر الدین احمد خاں والی لوہارو فرماتے تھے کہ شمس الدین احمد خاں نے نیشن بالکل بند کر دی تھی۔ بہر حال نیشن کے متعلق چارہ جوئی کے سلسلے میں غالب کلکتہ گئے تھے۔

منازلِ بفری سے لے کر لکھنؤ تک کے منازل سفر کی نسبت کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ابتدا میں لکھنؤ ٹھہرنے کا قصد نہ تھا۔

مگر چنانکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا (غالب) ایک بار لکھنؤ آئیں اس لئے کان پور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ بھی دیکھتے چلتے۔

قیام لکھنؤ بہر حال غالب ماہ ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ میں لکھنؤ میں تھے۔ اکابر لکھنؤ نے ان کا پرنسپل غیر مقدم کیا۔ غالب کو اُمید تھی کہ پادشاہ لکھنؤ سے انہیں اچھی رقم مل جائے گی۔ اس وجہ سے وہ کافی دن لکھنؤ میں ٹھہرے رہے۔ انہوں نے پادشاہ یا نائبِ سلطنت کے لئے کوئی قصیدہ نہیں کہا تھا۔ نائبِ سلطنت کے ساتھ ملاقات کی صورت سامنے آئی تو جلدی میں صنعتِ قیام میں ایک شر لکھلی۔ جو ان کے کلیاتِ شریں موجود ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:-

مہربانانِ گرد آمدند و بدرگانِ انجمن شند و رفتہ رفتہ و کرفا کسار یہاں سے مرا بہ بزمِ تغامیر نامی از سادات  
عامہ آں دیار کو دہاں روز با بہ آہنگِ معتمد الدولگی عینِ آوازہ بودہ بہتر فانی فرما ز وائے آں کشورہ مدالِ ملک  
آں سلطنتِ اشتہار و ہشت رسانیدن تا اناں جانب ایما و کششے رفت ازین سونیر آشوبِ ہوسے  
گل کرو۔ چوں ملازمت تواریفت خواہم و ستما یہ عقیدے سے انجام دادن درہ آہرد عالمِ عبودیتے  
عوضہ دشتِ بلخ از کفر قبیحہ کی کرد و سینہ بریں آرزوئی مجنون شوقم بہ بیدارے کنارنا پیداے شراذخت  
و سوادِ عبارے ہم صنعتِ قیامِ روشن ساخت۔

لیکن معتمد الدولہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غالب خود کہتے ہیں:-

اگرچہ وقتِ اقتباسے دیدن آں جایہ مند نہ ز وائے ہوس از سببِ ہر زنت اما آں سودہ و مرغینہ ماند

غالب نے ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ محض لکھی ہے :-

آپ نے درباب ملازمت قرار یافت خلاف آئین خویشین داری ذنک شیوہ خاکساری بود فیصل میں  
اجمال و توضیح میں ابہام جز بہ تقدیر بود انہوں کرو۔

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب نے ملاقات کی دو شرطیں پیش کی تھیں جو منظور نہ ہوئیں۔ اول یہ  
کہ نائب السلطنت غالب کی تعظیم دیں۔ دوم نہ پیش کرنے سے انہیں معاف رکھا جائے۔  
آغا میر کے متعلق غالب کی رائے [غالب رائے سمجھیں کہ معتمد الدولہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

ہر چہ در آن بلاد انکہ منہ بکشی فیض و سانی دیں گد طبع سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شہید ہونے  
بجہ کہ حال بکس است۔ در ابتدا سے دولت ہر کہہ آ است حصول مدعا سے خود دیر برو سے بچید۔ لاجرم  
یک دو کس بہ ہر رنگ متبع گشتند و کنوں کہ از اتکام اساس دولت خود خاطرش جمع است و در بند جمع نہ  
افتادہ است جملہ فاذا انہا سے قدیم لکھنؤ از بیدادیں سبے رحم بہ سیلاب فدا رسیدہ و نادرہ و دروگان مال با  
آوارہ و جات گیتی گردیدہ و او خود از زودی و سرفرازی و بیسیماں شدہ و ازین شیرہ برگشتہ با بکلیہ بازار سیدار گم  
است ہما زبان و ساہوکاران و تاجران نہاں نہاں زرو مال خود بہ کان پور سے رساتند۔ و این زمینہ  
ہر کہ بود گر بخت و ہر کہ مست و رہنہ گرفتین است چوں حال میں دیار بدیں رنگ است آں خوشتر کہ سخن  
از خود نگیم تا بخی بست و چشم قوی قعدہ روز جمعہ زانک تم آباد بر آمد و بتاریخ بہت و انہم در و اسرور  
کان پور رسیدیم میں جادو سہ مقام گزیدہ رہا سے باندہ سے شوم۔

معتمد الدولہ آغا میر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ذاتی نام کا می پھٹکی کا نتیجہ قرار نہ دیا جائے بلکہ یہ جرحاً و ثباتاً

غالب کے اردو دیوان میں "دانی بخشی میں ایک غزل ہے جس کے آخر میں یہ قلم ہے :-

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا بسنی ہوس سیر و تماشا سودہ کم ہے ہم کو  
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے شیر عزم سیر بخت طوف حرم ہے ہم کو  
لے جاتی ہے کہ کہیں آیا توقع غالب جاوہرہ کشش کا مہر کم ہے ہم کو

آغا میر کا نام سید محمد رضا بہتمند الدولہ درویش راہیہ نہیں جنگ تھا۔ وہ اصلاً کشمیری تھا۔ اور غازی الدین حیدر کی لکھنؤ

غالب کے ایک غیر مطبوعہ فارسی خط کا عکس



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش از ہر عرضداشتی ہر پاسخ توفیق عطا فرمادے  
 ارسل شدہ اغلب نظر اور گزشتہ بابہ درین زمانہ کے از  
 کتابہ مع نقشہ اثرات عارت و پہلی کہنہ و نو نگاشتنہ کو سرچنے  
 آراستہ شد و معہذا باب ہارم ہر ختم کتابت رقمہا  
 انصار سخن سنجہ این دیار ہم دارد چون بند را این نسخہ کرد  
 جامعیت پسند آمد یک نسخہ از نسخہ مطبوعہ ہر مشتمل بر سہ جلد شد  
 از مطبعہ خرمیا بہ ارسلان میفرستم و چشم قبول این نذر محقر دارم  
 اطلاع رسید این راجع بحواب نامہ پیشین امید دارم و اسام  
 است کہ یکشنبہ ۲۴ ذی الحجہ ۱۲۶۲ مطابق ۵ دسمبر ۱۸۴۵ء



بر غلامانی خواہد کرد

یہ خط مولوی سید رجب علی صاحب مخوم مخاطب از طو جا  
 کے نام بھیجا گیا تھا۔ اور اس میں سید مخوم کی "آثار الصنادید"  
 کی تریل کا ذکر ہے۔ غالب کے انداز تحریر کا یہ نہایت عمدہ نمونہ ہے





اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نخل کھنویں کی گئی ہوگی لیکن اس زمانے کے کسی شاعر کی طرح؟

(بقیہ صفحہ ۶۴) شہزادگی کے زمانے میں خان سماں کے عہدے پر مامور تھا مستندینی کے سلسلے میں اس نے غازی الدین حیدر کی اعانت میں سرگرم حصہ لیا تھا انہی خدمات کے سلسلے میں وزارت کا خلعت پابائیکین تین برس کے بعد وہ معزول ہو گیا جب انگریزی مصالحت نے ادھر دھک دیا تو دہلی کے حلقہ اطاعت سے آزاد کر دیا گیا تو آغا میر پھر سر اقتدار گیا۔ اسی کی تجویز کے مطابق غازی الدین حیدر بادشاہ بنے اور خولے سے اس کی سلطنت کا عہدہ لے گیا۔ اس وقت سے لے کر غازی الدین حیدر کی وفات تک آغا میر خود مختار بادشاہ کی طرح کام کرتا رہا جسے چاہا آگے بڑھا یا جسے چاہا پیچھے ہٹا یا جسے چاہا نکالا جسے چاہا نکھا۔ غازی الدین حیدر کو سرات کا عادی بنا کر باطل معطل دے خبر بنا دیا تھا اس کے زمانہ اقتدار کے عجیب غریب واقعات سنئے گئے ہیں مثلاً ایک ساہوکار سے لاکھ روپے کا گڑا کناری خرید لیا تھا۔ جب اس نے روہ پیدا نکھا تو اسے شہر دیا کہ تم بادشاہ سے ملاقات کرو اور ان واثیل میں تمہارا اعتبار بڑھ جائے گا۔ وہ غریب رہتی ہو گیا سو اتفاق سے اس کا جسم بہت فروزہ رنگ بہت سیاہ تھا۔ باریالی کے لئے شہر لے لیا گیا۔ بادشاہ باہر آئے تو دودھی اسے دیکھ کر گھبرا گئے اور پکارا "تھے یہ کون؟" یہ کون ہے؟ خدام نے آغا میر کی ہدایت کے مطابق عرض کیا کہ یہ دیوباجین معلوم ہوتا ہے بادشاہ نے شہر بھجایا اسے پکڑو اسے پکڑو اور خود اندر چلے گئے۔ غریب ساہوکار پکڑا گیا جب اس نے دیکھا کہ ذلت انتہا کو پہنچ چکی ہے تو آغا میر کے قدموں پر گر پڑا اور دہلی اس لئے لاکھ روپے کی خان غلی لکھ دی۔

ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ کا ایک منہ چڑھا صاحب تھا۔ آغا میر نے اسے حکما گھر بٹھا دیا۔ اور کہا کہ کبھی باہر نہ نکلو۔ بادشاہ نے اس کے متعلق بار بار پوچھا لیکن ہر دفعہ جواب ملا کہ وہ مر چکا ہے، ایک روز بادشاہ باہر پیر کر رہے تھے کہ وہ مصاحب فاصلے پر نظر آیا غازی الدین حیدر نے کہا دیکھو فلاں شخص ہے۔ آغا میر اور اس کے رفیقوں نے تعجب ہو کر عرض کیا کہ خدام بارگاہ کو تو نظر نہیں آتا جھنڈور کی آنکھوں پر بکھر روشن ہے۔ اس لئے عالم روح کی مخلوق بھی صاف آتی ہے۔ بادشاہ ہر چند کہتا رہا کہ سے بلا لیکن آغا میر نے یقین دلا دیا کہ وہ شخص مر چکا ہے۔ اور بادشاہ کو شخص اس کی روح جسم صورت میں نظر آتی ہے۔ غرض آغا میر نے آٹھ برس تک ادھر کو بہت بری طرح برباد کیا۔ آخر میں بادشاہ سے انگریزوں کو قرض دلا کر اس کا سود اپنے نام لکھوا لیا غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ انہوں نے چند ماہ کے بعد آغا میر کو معزول کیا اور اس سے صاحب کی شہرشی کی لیکن انگریز آغا میر کے معاون بن گئے۔ دو برس تک وہ انگریزوں کی خاطر کے بھروسے پر کھنویں غازی الدین کی آخر ۱۸۵۳ء میں انگریزوں کی حفاظت میں کھنویں سے غل کر اپنے مال متاع سمیت کان پورا گیا۔ وہیں دو سال کے بعد وفات پائی اس کی

کئی گئی ہو اور مشاعرہ میں پڑھی گئی ہو۔

کان پورا اور باندہ | غالب ۲۶، ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو لکھنؤ سے نکلے ۲۹، ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ کو کان پورا پہنچے

وہاں دو تین روز کے قیام کے بعد باندہ چلے گئے۔

باندہ سے بنارس تک | یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ باندہ میں کتنی مدت قیام کیا لیکن باندہ سے نکلنے کے بعد مولوی

محمد علی خاں صدرا میں باندہ کو چمکا تیب لکھے ان سے بعد کی منزلوں کا حال معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً باندہ سے نکل کر دو روز موڑہ میں قیام کیا۔ ایک رات روستا میں بسر کی۔ پھر چلتے تاراپنچ گئے۔ فرماتے ہیں:-

روز پنج شنبہ دروڑہ رسیدہ تاجک شنبہ بہ آتش گرائید۔ دو شنبہ کوس جیل کو فتنہ شبے بہ روستا بسر روہ شنبہ

در چلتے تار رسیدہ بادادان اگر حیات باقی است بسج راہ فتح پور کردہ خواہ شد۔

موڑہ سے غالب نے سامان برداری کے لئے ایک گاڑی کرایہ پر لی تھی۔ جو بڑی سست رفتاری

اس کے انتظار ہی میں رات روستا میں بسر کی تھی۔ دوسرے روز غالب چلتے تاراپنچ گئے لیکن گاڑی

وہاں بھی دیر سے پہنچی موڑہ اور چلتے تارا کا درمیانی فاصلہ اگرچہ صرف بارہ کوس کا تھا لیکن گاڑی کی سستی بنا کے باعث دو روز میں پھٹک چکی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں:-

دو شنبہ از موڑہ برآمدم کہ دو کسے کہ دیں ملک بہ لڑھا موہم است بائے پاکشیدن یا فتم چوں ازین

ضعیف الخفقت تر افتادہ بود آن آہستہ خرام بلکہ خرام وہ از وہ کردہ ران تو ہست برید۔ و از موڑہ تا چلتے تارا نہ رسید

ناچاہے بہ ویسے (روستا) اتفاق اقامت افتاد و شنبہ آخر شب رواں شد من خود دوپہر روز برآمدہ بہ سرائے

چلتے تارا رسیدم وہاں پہنچ فرام بلکہ خرام نا ساعنے از شب گذشت بہ من نہ پیوست۔

باندہ میں غالب سے کہا گیا تھا کہ مولوی محمد علی خاں کو خط بھیجنا ہو تو چلتے تارا کے تھانہ دار کے

حوالہ کر دینا غالب نے چلتے تاراپنچ کو خط لکھا تھا نہ دار صاحب سرائے میں آئے اور ادھر ادھر پھرنے لگے

تو غالب نے ارسال خط کے باب میں اعانت چاہی تھانہ دار صاحب نے درخواست قبول کر لی لیکن ان

گفتار غائبانہ غیر مناسب تھا۔ غالب اس انداز سے اتنے مکر ہوئے کہ خط تھانہ دار کے حوالے کر کے

کے بجائے ایک سرفراز کو دیا جو باندہ جا رہا تھا۔ لکھتے ہیں:-

میزائل صاحب دربانہ فرمودہ جو مذکور فیض مولوی صاحب بہ تھانہ دار چلہ مارا حوالہ باید کرد کہ وہ  
خواہر رساندہ اتفاقاً آخر روز بلکہ اول شب بہ کاررواں سر اسے چلتا مارا در انتظار گردید کہ وہ اما نہ کان راہ  
نشستہ بود کہ ناگاہ تھانہ دار بہ کاررواں مسریدہ ہر سو خرمیدن آغاز کردہ در باب ارسال نامہ عانت جتم  
اگرچہ پذیرفت اما پذیرفتن سخت سفیرانہ بود چنانکہ طبع ابا کرد و گوارا نہ شد مکتوب بہ دے دادن دہرے  
بجملہ احوال چوں نام جناب از من شنود نامہ بہ عجز زمین طلب کرد۔

پہلے خط میں غالب نے لکھا تھا کہ وہ چلتا مارا سے فتح پور جائیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نگاری  
کی سستی ز قمار سے تنگ آکر مجبوراً انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کشتی میں سوار ہو کر دیا کے راستے الہ آباد  
پہنچیں وہ لکھتے ہیں :-

آخرا بیدار گردون دہن تھوہ آمدہ خود را بہ دریا انداختم یعنی ہم ازیں مقام کشتی پہ کرایہ گرفتہ دو آدم تم تل  
ہم دروے عجیبہ و سیرم اندہ بھر ہوا دم نہا بر خواندہ سفینہ در و دہن را ندہ ام بنظر ایں کہ بہ اللہ آباد رسیدہ کو  
کہ در بنارس سے خواہم کہ ہم دیں بقعہ کار بندم دروے چند آسائشے کرہ اختلاج بہ امضا رساندہ دگر  
شوم و دیگر خبر شد آباد بہ بنگالہ در پنج ہا توقف نہ کریم۔ حال سفر دریا نیز دریں دو سہ روز نہاں نخواہ  
ماند کشتی باناں گویند کہ دروہ سہ روز بہ اللہ آباد رسیدہ خواہد شد اسے تو اں ویدیا اینک روز چار شنبہ  
قریب نیم روز کشتی نشستہ دل بہ خدا نہ یا خدا بستہ ام۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب الہ آباد میں کتنے روز ٹھہرے اور وہاں سے بنارس پہنچ کر کتنی مدت  
قیام کیا لیکن انہوں نے جو یہ لکھا تھا کہ بنارس میں نہیں ٹھہروں گا اس پر عمل نہیں کیا۔ بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ  
کافی مدت بنارس میں مقیم رہے۔ انہوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مستقل ٹنوی لکھی ہے جس کا نام  
چتران و پتران کی فارسی ٹنویوں میں قسیری ٹنوی ہے۔

ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باندہ میں بیمار ہو گئے تھے مولوی محمد علی خان صاحب صد امین  
نڈہ کو چلتا مارا سے لکھتے ہیں :-

مدد محمد کہ نہ مت صبر دلی از ساحت طبع رخت پرست۔

پھر لکھتے ہیں :-

مٹا الحمد للہ صدق وحی ہم از باندہ انرے در طبع ذکر اشد ضعف اگر باقی است تزد غیبت کہ  
ایں یسین است کہ از دامن کمر بہر ہی بستہ است ۔

قیام ہائیں | بنارس سے رائے گجھل کو لکھتے ہیں :-

چونوسیم کہ از متلع ذشتینہا پرتیہدست افتادہ ام اگر از وظایات گفتہ آید ہاں برنج عمدہ دامنہا است  
دہماں بدودت جگر و درت قلب و ضعف تو را اگر از غار حیات سخن راندہ شود پیش ازین نیست ۵

مفلوحت غم دل غالب نہیں کاہد تیش ضعف قہاں گھٹ جان بڑ

گویند زندہ تابہ بنارس رسیدہ است "مارا زین گیا و ضعیف این گمان بود"

بنارس میں قیام کی ایک ٹیل یہ بھی ہے کہ غالب خود ایک خط میں مولوی محمد علی خاں کو لکھتے ہیں  
عظمت نامہ و ایام خاک نشینی ہائے بنارس چشم جنت را از دوسے و بخت چشم را عروسجے بخندہ بود ۔

مناسبت مقام کا اقتضای یہ ہے کہ مثنوی چیراغ ویر کے بعض ہم حصے بھی یہاں پیش کر دئے جائیں اور  
آغاز یوں ہے ۵

نفس با صومسا ز دست امرؤ خموشی محشر را ز دست امرؤ

رگ نگم شرارے مے نوسیم کف خاکم عبارے مے نوسیم

اجاب دہلی کی شکایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۵

ز دہلی تا برون آورد بختم بطوفان تنافل دادہ خرم

کحل اہل طن غوازمینیت مراد و ہر ہنداری طنمینیت

نارباب طن جو کم سہ تن را کہ رنگ سونق انداین چین را

چو خود را جلوہ سنج ناز خواہم ہم از حق فضل حق را باز خواہم

مولوی فضل حق خیر آبادی آخری دو میں معقول کے امام تھے ۔ غالب کے نہایت عزیز دوست تھے ۔ عذر کے بعد انڈیا جان  
نیجے گئے وہیں وفات پائی ۔

چو حرز بازوئے ایمان نویسم      حسام الدین حیدر خاں نویسم  
چو پیوند قبائے جاں طرازم      امین الدین احمد خاں طرازم  
گرفتہ کن جہان آباؤں رستم      مرایاں را چہ از یاد رستم  
نگرداغ فراق بوستان سوخت      غم بے مہریں بوستان سوخت  
جہان آباؤں گرسودالم نیست      جہان آباد و ادا جائے کم نیست  
ان تمہیدات کے بعد بنارس کا ذکر فرماتے ہیں :-

تعالی اللہ بنارس چشم بدور      بہشت خرم و فردوسِ حمور  
بنارس اکے گھٹا کہ چین است      ہنوز از گنگ چنیش رہیں است  
بہ خوش پرکاری طرز وجودش      زوہلی سے رسد ہوم و دوش  
بنارس کے متعلق ہندوؤں کے عقیدے کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں :-  
تناسخ مشرباں چوں لب کشا بند      بکیش خورش کاشی رہستایند  
کہ ہر کس کا ندراں گلشن بہ میرد      وگر پیوند جسمانی نگیرد  
چمن سراپا یہ امید گردو      بہ مردن زندہ جاوید گردو

لیکن غالب کی دلچسپی کا حقیقی مرکز مزاج بنارس کا حسن تھا۔ اس حسن کے کیف و خوش کو  
غالب کی مینا سے سخن میں ملاحظہ فرمائیے :-

۱۔ مبارز الدولہ ممتاز الملک حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ رٹو ساہلی میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے  
پہننے والے تھے لیکن بعد ازاں دہلی چلے آئے۔ دہلی دربار میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ غالبؒ ۱۸۴۷ء میں  
فوج سے انتقال ہوا۔ شاعر بھی تھے۔ نامی تخلص تھا۔ غالب نے ان کے دیوان کا دیباچہ فارسی میں لکھا ہے جو  
کلیاتِ نثر میں موجود ہے۔

۲۔ نواب امین الدین احمد خاں الی لودھ۔

یہاں غافل از کیفیتِ ناز      نگاہ ہے بر پریزا و آتش انداز  
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا      نثار و آبِ خاکِ اس جلوہ جاشا  
نہادشاں چو بونے گل گرانِ نسیت      ہمہ جاندر جسمے در میاںِ نسیت  
خس و خارشِ گلستانِ است گوئی      غبارش جو ہر جانِ است گوئی

کفِ ہر خاکش از مشتی کشتے      سرِ ہر خارش از سبزی ہشتے  
سوادش پائے تختِ بہتِ پرتال      سرِ پائش زیارتِ گاہِ مستال  
عبادتِ خانہٴ ناقوسیانِ است      ہما نا کعبہٴ ہندوستانِ است  
بتائش را ہیولےٴ شعلہٴ طور      سرِ پایا نورِ ایندو چشمِ بدو  
میانہا نازک و دلسا توانا      ز نادانی بہ کارِ خویش دانا  
تقسیمِ یکہ ذر بہا طبعی است      دہنہا رشکِ گہمائےٴ بیعی است

بہ لطف از مویں گوہرِ نرمِ روتر      بہ ناز از خونِ عاشقِ گرمِ دوتر  
بہ سامانِ دو عالمِ گلستاںِ رنگ      ز تابِ سخنِ چراغانِ لبِ گنگ  
قیامتِ قائماتِ رخاںِ درازاں      زمزمِ گھاںِ در صفیلِ نیزہِ بازاں

پھر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات ایک وطنِ بیان سے جو زمانہ کی گردش کے اسرار سے آگاہ تھا سوال کیا کہ جہان سے نیکی، وفا اور محبت رخصت ہو چکی ہے۔ ایمان کا محض نام باقی رہ گیا ہے۔ باپ بیٹوں کی خونریزی کے درپے ہیں بیٹے آبا کے دشمن جاں ہیں، بھائی بھائی سے سرگرم جنگ ہے موافقت زمانے سے اٹھ چکی ہے۔ گویا قیامت کی تمام علامتیں پیدا ہو چکی ہیں لیکن قیامت کیوں نہیں آتی ؟

بہ نفعِ صورتِ عیوق از پٹےٴ چسیت ؟      قیامتِ راعنا نکیر جنوں کیست ؟

سے کاشی بہ اندازہ اشارت تبسم کرد و گفتا میں عمارت  
کہ تھا نیست صلح را گوارا کہ از ہم ریزو میں نگیں بنارا  
آخر میں اپنی درو انگیز حالت نہایت سوڑ و دل نشین انداز میں بیان کرتے ہیں :-

الاسے غالب کار و قتادہ ز چشم یار و اغیار و قتادہ  
چو بوسے گل نہیر میں بوسے بہ آندادی ز بندن بوسے آتے  
مدہ از کف طریق معرفت را سرت گردم بہ گردیش شجرت  
خودماندن بہ کاشی نارسائی خدا را میں چه کافر جڑی است  
یہ کاشی لختے از کاشانہ یاد آ دریں جنت انساں ویرانہ یاد آ  
درینا در وطن و اماندہ چند بخون دیدہ ز ورق رانندہ چند  
ہوس را پاسے درد اسنکستہ بہ امید تو چشم از خویش بستہ  
بہ شہر از یکسی صحرانشیناں، بروے آتش ل جاکویناں  
مگر کاں قوم را و ہر آفریدہ ز سیماب بہ آتش آفریدہ  
ہمہ در خاک و غول افگندہ تو بہ حکم یکسیہا بندہ تو  
چو شمع از درغ دل آرزو ناں بہ زمزم عرض عوی بے زبان  
سرو سہر پایہ عمارت کردہ تو ز تو ناںاں وے در پردہ تو  
اورانانت تنافل خوشنماست بہ درغ شاں ہولے گل نمست

غالب کے اہل و عیال کی کیفیت اور اس کیفیت کے لئے غالب کی ذمہ داری اس سے بہت برکیا  
بیان ہو سکتی ہے۔ اپنے پیش نظر کام کی نسبت لکھتے ہیں :-

تالے بے خبر کار بہت دیش بیابا و کھسار بہت دیش

.....

تراز اندوہ مجنوں بود یا بد خراب کوہ و ہاسوں بود یا بد

تن آسانی بہ تاراج بلا وہ چو بیتی سچ خود را رد نمادہ

شہر آسا فنا آما وہ خبر سیر بے فشاں دامن آزا وہ بر خیز

اس واقعہ سے تینیس برس بعد دیاں دود خاں سیاح کے ایک مکتوب کے جواب میں جو سیاح نے بنارس سے لکھا تھا فرماتے ہیں :-

بھائی بنارس خوب شہر ہے اور میرے پسند ہے ایک ٹنوی میں نے اس کی تعریف میں لکھی ہے اور

چھان دیکھ اس کا نام رکھا ہے۔ وہ غامبی دیوان میں موجود جو اس کو دیکھتا۔

غالب بنارس کے کوئی صاحب اشرف حسین خاں تھے جن کا ذکر سیاح نے اپنے خط میں کیا تھا۔ غالب لکھتے ہیں :-

اشرف حسین خاں صاحب میرے دوست ہیں فقذہ و فساد (غدر) کے زمانے سے پہلے ان کا خط

اور کچھ ان کا کلام میرے پاس آیا ہے تم ان کو میرا سلام کہنا۔

بنارس سے روٹنے سے روٹنے کے دن عمل میں آئی۔ چاند کی نوین یاد سوس تیار خنقی ہندو معلوم نہیں ہو سکا غالب لکھتے ہیں :-

امرو کہ آدیتہ بھول جیسے ہم ماہ و باہار گروہ و ہم است در بند بستی جنت سفرم .... فرد بہ روز شنبہ

از بنارس سے پویم۔

معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو کشتی کی سواری میں بہت آرام ملا تھا لہذا ان کی آرزو تھی کہ کشتی تک

کشتی ہی میں جائیں لیکن کشتی والے کرایہ بہت زیادہ مانگتے تھے۔ اس لئے مجبوراً غالب کشتی کے راستے گھوڑے پر بیٹھ پہنچے۔ وہ لکھتے ہیں :-

ناخدایان ناخدا ترس در باب کشتی صفائے نقد کردند چہ بہ ہر کہ بر غور دم تا کشتی کم ہندرو پیہ نہ طلبید و تا بیٹھ فزون

از بہت رو پیہ خواست۔ ناچار ہماں اسپ سوار تا بیاں بقعہ صحر اہم ہوید۔

لیکن ان کا خیال تھا کہ بیٹھ پہنچ کر کشتی کا بندوبست کریں وہ فرماتے ہیں :-

ہمنوز ہواے کشتی از سر بردہ رفتہ در بیٹھ نیز جستجو اہم کرد۔



کلکتہ پہنچنے کی تاریخ | ٹنٹہ تک کی سڑکیں۔ وہاں کے قیام اور بعد ازاں کلکتہ تک کے مقامات کی نسبت کوئی

سُرغ نہیں مل سکا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ

گاہے از شدت بردیالیی افسردہ در بخورد و گاہ از غنی گردش ایام تم رسیده و نالای روز شنبہ چارم شعبان (۱۲۳۳ھ) در کلکتہ رسید۔

”بردیالی“ سے ظاہر ہے کہ بنارس سے کلکتہ تک کا سفر و تیراجنوری اور فروری میں طے ہوا یعنی غالب لکھنؤ سے نکل کر جہاں سے وہ ہمیشہ راندازے کے مطابق ماہ جولائی میں روانہ ہو چکے تھے۔

بآندہ، الہ آباد اور بنارس میں زیادہ وقت گزرا۔ وہ جون ۱۸۲۶ء میں دہلی سے نکلے تھے اور اواخر ذی الحجہ ۱۲۳۵ء میں کلکتہ پہنچے گویا سفر میں کم بیش آٹھ ماہ صرف کئے۔

قیام کلکتہ | کلکتہ میں غالب نے شملہ بازار میں مکان کرایہ پر لیا تھا وہ علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :-

فردو آمدن جاستے من کا شملہ است در شملہ بازار کہ آں را روز دوا و دہماں ہنگام درو دیے حمت جو قائم رائے جھیل کو اپنا پتہ اس طور پر لکھتے ہیں :-

در کلکتہ قریب جیت بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب در جلی میر زلی سوداگر بہ اسدا شدہ میر۔

مکان ٹہرا کشادہ اور آرام دہ تھا، اور اس کا کرایہ صرف دس روپے ماہ تھا مولوی محمد علی خاں صدر امین بآندہ کو لکھتے ہیں :-

غریب نواز یہاں سے وہاں پہنچے سنت رانا زم کہ در پیش دیار خاند چنانکہ باید و ہر گزہ اسایش را بہ کار آید۔

ہم اور بہ اندازہ فراغ خاطر غصائے دہم اندر سے مانند دان دنیا طلبان بیت الخلاء۔ در گوشہ سخن

پراز آب شیریں چاہے۔ در بر طرف بام در خواہی نغم آرا مگاہے بے آنکہ جہتوںے شود یا گفتگوئے او دے حمت

و بے سنت بہ کرایہ وہ روپیہ ماہانہ ہم رسیدہ۔

کلکتہ کی تعریف | شہر کلکتہ اور بنگال کی آب و ہوا غالب کو بہت پسند آئی تھی فرماتے ہیں :-

شکر فی آثار رحمت الہی است کہ آب و ہوائے کلکتہ با من نیک در ساخت درین بقعہ آسودہ نوازاں ہم

کہ در وطن بودہ ام سے

غالب زکوہ ہر پردہ فرماتے دارو ہر گوشہ آزد و ہر نفساے دارو

برجیدہ پرست اذو ما غم کبیر بنگالہ شگرف آبے ہوائے دارو

علی بخش خاں رنجور کو کلکتہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

پچھلکتہ جاسے اذہر گو نہ کالا مالا مال، ہر چارہ مرگ ہر چہ گوئی پیش ہنر و دانش سہل، ہر چہ بخت ہر چہ خواہی بہ

بادارش ارزاں۔

مولوی سراج الدین احمد کلکتہ میں غالب کے ایک نہایت عزیز دوست تھے۔ کلکتہ سے واپس آکر دہلی سے مولوی صاحب کو جو خط لکھے ان میں سے ایک خط میں فرماتے ہیں:-

شارستانے ہیں تازگی و گیتی کجاست خاک نشینی آں دیار و اورنگ آرائی مرز بوم دیگر خوشتر سن و خط

کہ اگر سوال نہ بودے دطوق ناموس عیال بگردن نہ دانشے و اسن بہر چہ ہست افشا ندے و خود را دراں

بقعہ رساندے تازیسے درالینو گدہ بودے از رخ ہوا آئے افوش آسودے زہے ہوا آئے سردو

خوش آب آئے گوارا فرخا بادہ آئے تاب و خراما اثر آئے شیریں۔

غالب کو آم ویسے ہی حد سے زیادہ مرغوب تھے۔ بنگالہ کے آم انہیں بہت پسند آئے۔ خوا

فرماتے ہیں:-

ہمہ گرمیوہ فروں بہ خوانت باشند

غالب آں انبہ بنگالہ فراموش مباد

غالب کے کلیات نظم میں ایک قطعہ ہے جس میں انہوں نے سفر کلکتہ کی غرض و غایت،

دہلی، بنارس، پٹنہ اور کلکتہ کی کیفیت ساقی بزم آگے کی زبان سے بیان کی ہے۔ وہ ہر امر کو بطور

سوال "ساقی" کے روبرو پیش کرتے ہیں اور "ساقی" جواب دیتا ہے اس میں فرماتے ہیں:-

گفتش چیت منشا ہمنرم گفت جو رجھائے اہل وطن

گفتم اکنوں بلکہ کہ دہلی چیت گفت جان ہستائیں جانش تن

گفتش چیت این بنارس گفت شاہے رست محو کل چیدن

گفتنش چوں بود غمِ آ باد؟ گفت ز گیس ترا از نضائے چمن  
گفتنش سلسبیل خوش باشد گفت خوشتر نہ باشد از سوسن  
حال کلکتہ باز جستم گفت باید تسلیم شمش گشتن  
گفتم آدم بزم رسد و رسد گفت از ہر دیار و از ہر فن

اس کے بعد انگریزوں کی طرز و روش کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

گفتم ایں جاچہ شغل سو و دہڑ گفت از ہر کہست ترسیلن  
گفتم ایں جاچہ کار بیکر دہڑ گفت قطع نظر ز شعر و سخن  
گفتم ایں ماہ بیکر ایں چہس اند؟ گفت خوبان کشور نسن

غالب جس مقصد کے لئے کلکتہ گئے تھے وہ پورا نہ ہوا یا اس کے عالم میں خوبان کشور

دن کے متعلق مزید فرماتے ہیں :-

گفتم ایناں مگر دے وارند؟ گفت و از ندلیک از آہن  
گفتم از بہر دوا آدہ ام گفت بگریز و سر بنگن

کلکتہ کی تعریف میں غالب نے اردو میں بھی چند اشعار کہے ہیں :-

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینے میں مارا کہٹے ٹے  
وہ سبزہ زار ہائے مہر کہ ہے غضب وہ نازیں تہاں خود آرا کہٹے ٹے  
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ ہر طرف نظر طاقت ربا وہ ان کا اشار کہٹے ٹے  
وہ مہوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہٹے ٹے

فارسی کی ایک غزل کے تھک میں فرماتے ہیں :-

غالب رسیدہ ایم بکلکتہ و بے

از سینہ دلغی دوری اجاب شہیم

ایک ہمدرد دست | اور غرض کیا جا چکا ہے۔ غالب کے سفر کلکتہ کا مشافہش کا قصیدہ تھا۔ لہذا کلکتہ میں

وہ زیادہ تر اسی غرض کے لئے حکام یا دوسرے دوستوں سے ملنے رہے۔ ہم ان تمام مشاغل کو غلطیہ باب میں بیان کریں گے جن اصحابِ کلکتہ میں پٹن کے سلسلے میں غالب کی سب سے بڑھ کر عانت کی ان میں سے نواب اکبر علی خاں طباطبائی متولی امام بارہ ہوگی۔ مولوی سراج الدین احمد خاں اور مولوی محمد حسن خاں صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نواب اکبر علی خاں کے نام مولوی محمد علی خاں صدر امین بانیہ نقاری خط دیا تھا۔ غالب فرماتے ہیں کہ کلکتہ پہنچ کر دو روز آرام کرنے کے بعد ہوگی بندر گیا اور نواب صاحب نے ملا، ان کے تپاک، محبت، ہمدردی اور حسن اخلاق سے غالب بہت متاثر ہوئے فرماتے ہیں :-

اگر گویم کہ مراد از محبت و اگر گویم کہ مراد از شک اور دینار و دار و بھڑائے کہ خود

آفریدہ و خود در بگزیده۔ کہ دین گزنائی و صاحب دلی دینکار و دیگرے نخواہد بود۔

نواب صاحب نے ملاقات کے بعد ان کے ساتھ محبت و دو دو کا محکم و محکم رشتہ پیدا ہو گیا جس زمانے میں غالب کلکتہ گئے ہیں نواب صاحب بجا پرے خود امام بارہ کے وقف کے متعلق مقدمے میں اُبھے ہوئے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

آخر کہ دریں روز نواب را با حکام ہوگی بندر در خصوص زمینے کہ وقف امام بارہ است معارف

بلکہ عاودہ و پیش دول سرگرم فکر و غرض است شد و مثال ۵

محمد راتنی حسرت و نیا دیدم

چون بعشرت کدہ کبر و مسلمان نیم

مولوی سراج الدین احمد خاں کے ساتھ غالب کا رابطہ مودت و اخوت بہت گہرا تھا۔ فانی مسکاتیب میں ان کے نام متعدد خط میں مولوی صاحب غالباً لکھتے رہنے والے تھے بلکہ انہیں کاروبار کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے جس زمانے میں غالب نے ”تسنبو“ چھپوائی ہے۔ مولوی صاحب لکھتے آگئے تھے۔ غالب ”تسنبو“ کا ایک نسخہ مولوی صاحب موصوف کو بھیجے کی ہدایت دیتے ہوئے ان کا پتہ منشی شیو زائے کو یوں لکھتے ہیں :-

در کتبہ اعلا خانہ مانتھنہ شاعر علی شاہ بہ کائنات مولوی عبدالکیم مروحہ خدمت مولوی

سراج الدین احمد برسد۔

مولوی صاحب کے ساتھ جو گہر تعلق تھا۔ اس کی کیفیت خود غالب کی زبان سے سنئے۔  
خواجہ غلام غوث خاں سنجیر کو لکھتے ہیں :-

ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرہ جو میں ہیں سے و عوام کا شمار نہیں دو مخلص

صادق الوالد کیجیے۔ ایک مولوی سراج الدین جتہ امجد علیہ و سرانشی غلام غوث خاں سلمہ اللہ تعالیٰ

لیکن وہ مرحوم جن صورت نہیں رکھتا تھا اور خلوص اخلاص اس کا خاص میرے ساتھ تھا۔

ادبی ہنگامہ سفر کلکتہ کی صرف ایک ضروری چیز باقی رہ گئی ہے یعنی وہ ادبی ہنگامہ جس کے  
نتیجے میں غالب کو شہنوی یا دخیال فکھنی پڑی۔

غالب کو فارسی زبان سے طبعی مناسبت تھی۔ ان کا مذاق نہایت اعلیٰ درجے کا تھا۔  
اور ملا عبدالمحمد کی دو سالہ تربیت نے ان کے ہر نادر جوہر کو یگانہ جلا دے دی تھی غنچہ ان شباب ہی  
میں انہوں نے جو کچھ لکھا تھا وہ فارسی زبان کے بہترین اور مشہور ترین اساتذہ کے کلام کے ہم پتا  
تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان کے ان فارسی گو شعرا کو خاطر میں نہ لاتے تھے جن کی زبان، اسلوب  
بیان اور کلام غرض ہر چیز فرمایہ تھی۔ اس زمانے میں قتل اور واقف کا بہت شہرہ تھا۔ غالب کے  
نزدیک قتل اور واقف بے حقیقت تھے جب غالب کلکتہ پہنچے تو اس زمانے میں ہر انگریز  
کے پہلے اتوار کو مدرسہ کلکتہ میں شاعر ہوتا تھا جس میں فارسی اور اردو زبان کے شعرا شریک ہوتے  
تھے۔ غالب کے اعزاز میں ایک خاص شاعرہ منعقد کیا گیا۔ اس زمانے میں شہزادہ کامران دہلی  
ہرات کی طرف سے ایک سفارت کلکتہ آئی ہوئی تھی جس کے رئیس کفایت خاں نامی ایک خوش  
ذوق اہل علم تھے۔ وہ بھی شاعرے میں شریک تھے۔ شعرا نے کلکتہ نے اپنی غزلیں پڑھیں۔ کفایت  
ان کے پوچ کلام پر دیر لب قسم فرماتے رہے لیکن جب غالب غزل پڑھی تو خان مدوح نے  
دل کھول کر داد دی۔ اس پر عام شعرا میں غالب کے خلاف حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور جیسے کہ

پوچھ گو، فرومایہ اور تنگ نظر شعرا کا دستور ہے وہ غالب کے کلام میں عیب تلاش کرنے لگے۔ غالب نے  
اس مشاعرے میں اپنی مشہور غزل ”گماں بر خیز“، ”تیریاں بر خیز“ اور ”پریاں بر خیز“ کے چند شعرا پر یہیں ہے

✓ پچھ گیس بندیا رہوں عشقِ فکر رسم بیدا و بہا و از جہاں بر خیزد  
ز بہارِ اذقب و فوجِ جاوید ترس خوش بہارِ سیتِ نیم خزاں بر خیزد  
عمرِ باجِ بگر و در کجسگر سوختہ چوں سن آزد و وہ آتشِ نفساں بر خیزد  
گرد ہم شمعِ ستمناست غزلیں غالب رسم امیسد بہانا ز جہاں بر خیزد  
اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے ۷

خبر سے انعام و از ہمہ عالم میترسم ہم چہ ہوئے کہ تباں را ز میاں بر خیزد  
اس پر ہی مشاعرے میں یاد و سر شاعری میں یہ شعر بھی کیا گیا تھا کہ ”ہمہ عالم کی تیرا سب سنت نہیں“ نیز غزل  
کیا گیا کہ ”تو نے از میاں بر خیزد“ صحیح ہے بعض اور اعتراضات بھی کئے گئے نواب اکبر علی خاں اور  
مولوی محمد حسن خاں صاحب نے ان اعتراضات کے جواب دیئے۔ کفایت خاں نے ”ہمہ عالم کی سند  
میں اساتذہ کے متعدد اشعار پیش کئے مثلاً ۷

گر کین آلود ہوں چہ عجب،  
”ہمہ عالم گراہ صحت اور ست“  
(حافظ)

اور ۷

بہ جاں قرم از انکم کہ جاں قرم از دست  
عاقلم بر ہمہ عالم گراہم از دست (سعدی)

حکایت کے شعرا کا سرمایہ ناز و انجھار اور دستان و ساز و ساز و ساز و ساز کا کلام تھا۔ خواجہ حالی فرماتے  
ہیں کہ غالب نے قاتل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں فرید آباد کے کھتری بچے کے قول کو  
سنیں مانتا۔ اس پکھلتے کے شعرا کو بھی بگڑ گئے تھیں جب جوہ کی انتہا پر پہنچ جائے تو مذہب بابت  
۷۷

۷۷ حکایت شاعرانہ شعراء اس قاتل فرید آباد کے کھتری تھے بعد ازاں دستان پرستے اور کھنڈہ مار کر شروع کیا تو قاتل کا کھنڈہ مار کر قاتل

یا معاشرت یا دوپے محمدین فن اور مجددین طریق و راہ کو جن احمقانہ و جاہلانہ مخالفتوں سے سابقہ پڑتا ہے وہ سب غالب کے گرد و پیش کھڑی ہو گئیں وہ کسی ادبی ہنگامہ اور علمی جہاد کے لئے کلکتہ نہیں گئے تھے۔ بلکہ اپنی ٹپشن کے متعلق چاہہ جوئی کے لئے انہوں نے اس لمبے سفر کی رحمت برداشت کی تھی۔ جب ان کے خلاف شعر نے ہنگامہ بپا کیا تو وہ بہت گھبرائے اور انہوں نے نواب اکبر علی خاں دہلوی اچمن صاحب کی فرمائش پر حضرت میں "بادِ مخالفت" کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں اپنی مصیبتوں کا حال بیان کیا اپنی آمد کی غرض غایت بتائی۔ اعتراضات کے جواب دیے اور ناسی زبان میں اپنے پس منظر کی وضاحت کی۔ میرے نزدیک اس ہنگامہ کو غالب کی ادبی و علمی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ وہ شروع ہی سے قلیل، واقف اور اس قماش کے دبے شعر کو خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکہ تعارضیات گرم ہوا۔ اس نے غالب کے جذبہ مخالفت میں بہت تندی تیزی اور لہجہ پیدا کر دی یہی جذبہ مخالفت انجام کار قاطع برہان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جو غالب کی طرف سے فارسی و انان ہند کے درجہ امتداد و اعتماد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ غالب کے کلام نظم و نثر میں جا قلیل، واقف، عبد الواسع، غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فروماہگان ذوق و ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں ان سب کی تیزی اور تندی کا حشر شیعہ کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔

مثنوی "بادِ مخالفت" میں پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ میں تنظلم اور فریاد دے لے لے اس شہر میں آیا ہوں۔ مجھے چند روز یہاں آرام سے گزارنے دو، مہمان نوازی کا حق ادا کرو پھر اپنی مصیبتوں کی داستان لکھتے ہیں۔

چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر	کہ بدیں جا رسیدہ ام آخر
بسیہ روز غم بتم منیسید	تیرہ شہائے جہتم بلینیسید
اندہ دوری وطن نگرید	غم حوران انجمن نگرید
نہ ہیں نالہ و فغاں بہم	من جاں آفریں کہ جاں بہم

مویہ چوں سو گزودہ است مرا غصہ بد خوئے کردہ است مرا

پھر کہتے ہیں کہ مخالفت کا آغاز میری طرف سے نہیں ہوا بلکہ خود مجھ پر بلا وجہ نادرست اعتراض کئے گئے ۛ

ہم عالم غلط کہ گفت نخست؟ پارہ زیں غلط کہ گفت نخست؟

مئے را برکہ کہ گفت غلط؟ شعرا سرسبز کہ گفت غلط؟

اور جب اعتراضات کا جواب ملنے پر ثابت ہو چکا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ بالکل درست تھا۔ تو کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات نے میری تائید نہ کی۔ اور میری شہرت پر جو درغ غالیغین نے لگائے تھے انہیں دھو ڈالنے کی طرف توجہ نہ فرمائی؟ آپ کی اس حق نادرستی سے میری گفتگو کا انداز نگہ مندا ہو گیا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ قدر دان صحاب اس پر ناراض ہو گئے ہیں تو مجھے بڑی شہمانی لاجن ہوئی کاش میں چپ رہتا ۛ

نامیدم ز شاعر سیتیم بود شاستہ مرزا تسلیم

کاش با اعتراض مساختے نالہ در زیر لب گداختے

زانکہ آنہم رضائے یاراں بود رنگے از جوشش بہاراں

خار دمان و متاں بودن خوشتر از باغ و بوستان دمن

بعد ازاں اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں ادبی بحث سے نہیں ہٹتا صرف یہ خوف ہے کہ میرے جانے کے بعد لوگ کہیں گے کہ دہلی سے ایک سفیہ آیا تھا اور بزرگوں کے ساتھ معرکہ ستیز گرم کر کے چلتا بنا۔ اس طرح میرے وطن کی عزت و آبرو، بلند نامی اور اعلیٰ تربیت کا خون ناحق میری گردن پر ڈالا جائے گا ۛ

تہ آدیشِ بیاں ترسم من ایمانِ من کراں ترسم

کہ پڑن من بہ سالک دراز بہ زباں ماند ایں حکایت

کہ سفیہ رسیدہ بود ایں جا چند روز تاز رسیدہ بود ایں جا



باز رگاہیں تیز پیش رفت زحمتے داد و راہ خوش رفت  
 ہم سفیدانہ گفتگوئے دہشت ہم خرابا تیانہ ہرے دہشت  
 برگِ دنیا نہ سازد پیش بڑ تنگِ ہلی دوسرے پیش بڑ  
 آہ زال دم کہ بعد رفتنِ من خونِ دہلی بود بیکدول من  
 کلکتہ والے اس بات پر بہت بگڑے تھے کہ غائبِ قتیل کی ستائش کیوں نہ کی۔ غالب  
 فرماتے ہیں ۷

ویکہ در پیش گاہِ بزمِ سخن بہ زبانِ فنا و ہرست از من  
 کفلاں یابلِ نیکو نیست مگر جوانِ نعمتِ او نیست  
 زلہ برو کس چہ را بشم من ہمایم کس چہ را بشم  
 پھر کہتے ہیں کہ ہمیں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا نہ اس کی شہرت پر رشک ہے  
 نہ میں اسے برا کہتا ہوں۔ اور جو کچھ کہتا ہوں وہ اپنی طرف سے نہیں کہتا۔ فارسی زبان جانتے ہیں  
 کہ قتیل اہل زبان نہ تھا۔ وہ شائستہ اعتماد نہیں اور اس کے کلام کو استناد کا درجہ نہیں دیا جاسکتا  
 اس لئے کہ فارسی اہل ایران کی زبان ہے۔ اور سندوبی مقبول ہوگی جو اہل زبان کے کلام سے  
 مستفاد ہوگی اگر دوستوں کو چھ پرہ شکوہ ہے کہ میں قتیل کی پیروی کیوں نہیں کرتا تو خدا را چھ بتاؤ  
 کہ میں خریں، آسیر، طاہب، عربی، نظیری اور کاوری کو چھوڑ کر قتیل کے پیچھے چلنا کیوں کر گوارا کروں  
 آنکہ طے کردہ ایں موافقت را  
 چہ شناسد قتیل دواقت را

آخر میں قتیل کی مدح لکھی ہے جو حقیقتہً ہجو بیج ہے فرماتے ہیں ۷  
 مے شوم خوش را صلح و صل مے سراہم فوائے قتیل،  
 گرچہ ایرانشِ نخواستہ گفت سعدی نایشِ نخواستہ گفت  
 بیک از من ہزار بار بہت از من چہ ہزار بار بہت

نقش آب حیات اماند در وانی ذرات را ماند  
نشر نقش بال طاووس انتخاب صراح قاموس است

جامدقلید اور حقیقت ناشناس رہر و معذرتوں اور مصالحت کوششوں سے حق بات کو قبول کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے اور غالب کی تو عذر خواہی بھی باوجود اعنائے مصالحت اپنے اندر سینکڑوں تیز تر شکر تھی تھی۔ لہذا اس سے کوئی اچھا نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب جب تک کلکتہ میں رہے یہ معرکہ جاری رہا۔

اُردو و سکا تیب میں غالب نے میری تحقیق کے مطابق صرف دو جگہ اس جہنگ مرکا ذکر کیا ہے ایک خط میں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں کہ پانچ ہزار کے مجمع میں تمہارے گئے تھے دو مہر خاں کو لکھتے ہیں کہ تیرے ہمیشہ مورد اعترافات رہا ہے لیکن اکثر ایسا ہوا ہے کہ بعد دو ہاروں کے معترض صاحب کا خط آیا ہے لغت و ترکیب معترض قید کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں وجہ کئے ہیں! لہذا کلکتہ میں جو شور مچا رہا تھا میرا شہر

جزوے از عالم د از ہجہ عالم شہم ہجہ کوئے کہتاں را زمینیاں خیزد  
خستہ جرات سے اعراض ہوا ہے نشا اعراض یہ کہ عالم مفروض ہے۔ اس کا ربط ہمہ کے ساتھ جسے اجما قیل منوع ہے بقضار اس زمانے میں شاہزادہ کامراں درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا یہ کیفیت غالب اس کا نام تھا اس تک یہ قصہ نہچا اس نے اساتذہ کے اشعار پان سات ایسے پڑھے جن میں ”عالم“ ”ہمہ روز“ ”ہجہ“ ”جاء“ ”مرفوم“ ”قضا“ ”اور وہ“ ”اشعار“ ”قاطع“ ”بران“ میں مندرج ہیں۔

واپسی کب ہوئی [کلکتہ سے واپسی کی تاریخ کا تعین پھر ایک مسئلہ ہے اور پر عرض کیا جا چکا ہے کہ سر لنگ اسٹرنگ غالب کے خاص ہمدرد تھے ان کا انتقال ۳۳ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد غالب دہلی آچکے تھے۔ اس مقدمہ کے بعد اب غالب کے اپنے بیان پر نظر ڈالے۔ ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں :-

لے لافہ ہر قاطع بران مشغول ہوں۔

ایک شہزادہ ہم جمادی الثانی بختی سہی آواہی درزاویہ دہلی پاستے بدہم کبشید نازم بد غواہی جاں  
پردہ ہی انکو یانے را کردیں سفر دیدہ روٹناس کف پاستے آنا گشتہ کہ وطن ماہ ہماقی من آشفته  
مشریب تلخ ترا غزبت ساختہ رسیدن بدہلی تلافی اندوہ ہجران کلکتہ مذکور تا بد شادی پہ رسیدہ ہر کہ  
اداہلی نظر مرا نگرد ہر گز اند کہ رہد بمنزل رسیدہ بدہلی آرمیدہ است بلکہ پندارو کہ درو مندست  
از وطن دور افتادہ تازہ بدہلی غزبت مبتلا ۔

جب یہ مسلم ہے کہ سنی ۱۸۳۱ء میں غالب دہلی میں تھے تو ماننا چاہئے گا کہ وہ ۲۰ جمادی الثانی  
۱۲۴۵ھ کو دہلی پہنچے یعنی اوائل جنوری ۱۸۳۱ء میں یا اواخر دسمبر ۱۸۲۹ء میں  
آخر میں اتنا اور عرض کروینا چاہئے کہ غالب واپسی میں باندہ ضرور ٹھہرے ۔ اس لئے کہ  
مولوی سرلج الدین احمد خاں کو ایک خط میں رقم فرماتے ہیں :-

نامہ نامی کہ در باندہ بہمن رسیدہ و جہاں ہم انڈیا منزل مر قوم گردیدہ سلمے از نہفت لوانے  
جاں کشائے گورتری و ہشت ۔

اور کسی مقام پر پٹھرنے کے متعلق کوئی بیان نہیں مل سکا کلکتہ ہی میں غالب نے چکنی ڈلی  
کی تعریف میں ارتجالاً وہ قطعہ لکھا تھا جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :-  
یہ ایک قلعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کما تھا فقریب یہ کہ مولوی کریم میرے ایک دوست  
انہوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ و بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مجھے کما گاس  
کی کچھ تشبیہات نظم کیجے میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھا اگر ان کو دیا اور صلہ میں وہ  
ڈلی ان سے لی ۔



# پانچواں باب

رام پورا و میرٹھ کے سفر

اتفاق سفر اقدار بہ پیری غائب

آنچہ از پائے نیامد ز عصائے آید

کلکتہ کے سفر کے بعد غالب کی تحریرات سے صرف تین سفروں کا علم ہو سکا ہے وہ دو مرتبہ رام پور گئے اور ایک مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیقہ سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے البتہ کلکتہ کے سفر سے قبل وہ فیروز پور جھڑک یا لودھانہ آتے جاتے رہے جب انگریزی فوج نے ۱۸۵۶ء میں بھرت پور پر حملہ کیا تھا تو اس موقع پر نواب احمد بخش خاں کے ہمراہیوں میں غالب بھی شامل تھے اگرچہ ان کا یہ شمول کسی فوجی خدمت کے لئے نہ تھا۔ وہ خود بیچ آہنگ میں لکھتے ہیں :-

دو سال ایک ہزار دو صد چل دیک بھری کنگینی شانان انگلیہ بر بھرت پور لشکر کشیدہ و ان میں  
ڈنڈا در میان گرفتہ اندرین دریں یورش بہ جنابہ خطاب ہم عالی مقدار فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں  
برادر رستم جنگ نام اقبالہ و زود افضالہ رفیق و گرامی برادر ستودہ خوش میرزا علی بخش خاں بہادر ہم سفر است  
روزانہ بہ زقار ہم ہم قدم و شبانہ بہ یک خیمہ فرو و آئیم۔

پہلا سفر رام پور | رام پور وہ پہلی مرتبہ اور آخر جنوری ۱۸۶۱ء میں گئے اور پانچ میں واپس آئے۔ نفقہ کو لکھتے ہیں :-

میاں میں جو آخر جنوری میں رام پور جا کر پانچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کموں یہاں کے لوگ  
میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔

قاضی عبدحمیل بریلوی کو رقم فرماتے ہیں :-

گزشتہ سال ان دنوں رام پور میں تھا پانچ ستمبر میں وہیں آگیا۔

خواجه غلام غوث خاں سیخبر کو تحریر فرماتے ہیں :-

جب جنوری ۱۸۶۶ء میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا جاو پر لکھا آیا ہوں تو میں آخر جنوری میں رام پور

گیا چھ سات ہفتے وہاں رہ کر دلی واپس آیا۔

گورنمنٹ کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ عذریں غائب کی نیشن باغیوں کی اعانت کے الزام میں بند ہو گئی تھی عذر کے بعد گورنر جنرل دہلی آئے تو غائب چیف سکرٹری سے ملنے کے لئے گئے۔

صاحب موصوف نے ایک روز عدم فرصت کا عذر رکھ کر مال دیا دوسرے روز ملے تو یہ جواب دیا کہ تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملتے ہو جب تک نیشن کے کھل جانے

کی اُمید تھی۔ غائب رام پور جانے میں متال تھے۔ نواب یوسف علی خاں بہادر ناظم والی رام پور کے ساتھ مدت سے دوستانہ تعلقات تھے درمیان میں استاد ی شاگردی کا رشتہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن جب حکومت کی طرف سے ایسی ہو گئی تو میرٹھی رائے ہیں اس خیال سے رام پور گئے تھے کہ

نواب صاحب کے ذریعہ سے حکومت کو اپنے معاملہ پر توجہ دلائیں۔ اگرچہ بعد میں خیال تبدیل ہو گیا تھا۔

نواب علار الدین احمد خاں لوہارو آئے پر اصرار دے ابرام کر رہے تھے انہیں ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء

کے مکتوب میں اپنے ضعف و فصحال اور عدم استطاعت سفر کے سلسلے میں لکھتے ہیں :-

کہو گئے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ (صحیح مدت ایک سال اٹھ مہینے اور چھ دن)

منزل سفر | غائب اس سفر پر پہلی سے ۱۹ جنوری ۱۸۶۶ء کو روانہ ہوئے تھے۔ رات مرادنگر میں سیر

کی۔ ۲۰ کو میرٹھ پہنچے وہاں ایک روز قیام کیا۔ ۲۱ کو میرٹھ سے روانہ ہو کر ۲۲ کو شاہ جان پور پہنچے

گڑھ مکتیہ اور وہاں سے مراد آباد ہوئے ہوئے رام پور فائر ہوئے۔ بہر گو پال تفتہ کو لکھتے ہیں

بھائی میں نے ولی کو چھوڑا۔ پانچشنبہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۶ء کو مرادنگر۔ اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا آج شنبہ

۲۱ کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے تمام کیا یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر روانہ کیا کل شاہ جان آباد

اور پرسوں گڑھ مکتیہ رہیں گا پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور چلاؤں گا۔

حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

میں تم سے نصرت ہو کر اس دن مرادنگوٹیں رہا دوسرے دن یعنی جمعہ کو میرٹھ پہنچا <sup>مصطفیٰ خاں</sup> اب خاں نے ایک دن رکھ لیا آج شنبہ ۱۲ جنوری یہاں تمام ہے۔ فوج گئے ہیں، بیٹھا ہوا بیٹھ لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا کل شاہ جہان پور۔ پرسوں گڑھ کتیسرے ہوں گا۔ مراد آباد سے پھر تم کو خدا لکھوں گا۔

اس سفر میں باقر علی خاں اور حسین علی خاں (ابنا تیرزا زین العابدین خاں عارف) بھی ہمراہ تھے۔  
فرماتے ہیں :-

دھوکوں کے لٹکے کے لکھے ہوئے دو خط ان کی داوی کو بھیجا دیتے ہیں (یعنی نگیم صاحبہ غالب) تم اس اپنے نام کے خط کو لے کر ڈیوڑھی پر جانا اور آسانی جی دیکھ صاحبہ کو پڑھ کر سنا دینا اور خیر خواہی غالب نے سفر کی منزل مقصود کو شروع میں خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر پردہ افحاش میں لکھا ضرور سمجھا تھا لیکن دہلی سے نکل جانے کے بعد ان کے خیال میں افحاش کی ضرورت نہ رہی۔ وہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

بھائی میں اندرون سے مصنعت اپنے کو مختلف مقامات کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کر اس سے پردہ نہ کرنا بصاف کہہ دینا کہ رام پور کو گیا ہے یعنی سب کو معلوم ہو جائے اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔  
رام پور کی کیفیت | رام پور کی کیفیت ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

اب میرا حال سنو تنظیم و توقیر بہت ہے۔ ملاقاتیں تین ہوتی ہیں۔ ایک مکان کو وہ تین مکانوں میں چلے جاتے رہنے کو ملا ہے۔ یہاں پھر تودہ کو بھی میر نہیں۔ خشتی مکان گنتی کے ہیں کچی دیواریں اور کچھریں، سارے شہر کی آبادی اسی طرح ہے۔ کچھ کو جو مکان ملے وہ بھی ایسے ہی ہیں ہنوز کچھ گفتگو دیکھنا میر نہیں آئی میں خود ان سے ابتداء کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کریں گے۔ مگر یہ واسطہ ۲۴ پروردگان پر ہر دیکھ لیا کیا کہتے ہیں اور کیا قدر کرنے ہیں۔ کھانا دونوں وقت، پھر۔ یہ آواز ہے۔ اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔  
غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔ پانی ہاں مگر کس منہ سے ادا کروں ایک دیا ہے کوسی بھان اضر

اتنا بیٹھا کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، میٹھ، نفوذ، اس آٹھ دن میں فیض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ رات کے بھی تندرست آدمی بھی تو ناگمراں ایک غنایت دو دن سے کچھ بیدار ہے۔

یہ خط ۳۱ فروری ۱۸۶۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس وقت غالب کو رام پور پہنچے ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔ لہذا سمجھنا چاہیے کہ وہ ۲۶ مارچ ۱۸۶۶ء کو دارام پور ہوئے تھے۔  
**دریائے کوئی کی تعریف غالب میر ہمدی مخرج کو بھی لکھی ہے۔**

میٹھو بہرام پور دارام پور رہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔ پانی سبحان اللہ شہر سے تین سو قدم کے فاصلے پر ایک دریا ہے۔ کوئی اس کا نام ہے۔ بے شبہ شہر آب حیات کی کوئی بوت اس میں ملی ہے۔ خیر آریوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے۔ مگر اتنا شیریں کہاں ہوگا۔  
**نیشن کے متعلق سفارش کی پید** ۳۱ فروری ۱۸۶۶ء کے خط میں حکیم غلام تحفہ خاں کو لکھتے ہیں:۔  
 نواب نصرت گورنر آگرہ سے مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ وہ صاحب دو چار دن میں پھرتا ہے۔ اگر ان کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے تو میں بھی ساتھ جاؤں گا۔  
 اگرچہ گورنر غائب و شمال (صوبہ متحدہ آگرہ و دہلی) کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں مگر دیکھوں کیا گفتگو دربان میں آتی ہے۔ جو واقع ہو سکتا نہیں کہوں گا۔

اس گفتگو سے غالب کا مدعا یہی تھا کہ نیشن کے باب میں جو گفتگو ہوگی اس کی کیفیت لکھوں گا اگرچہ صوبہ جات متحدہ کے گورنر کو دلی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ لیکن وہ سمجھتے تھے کہ شاید نواب خاں کی سفارش سے کوئی راستہ نکل آئے۔

میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوست بنا آیا ہوں اور اپنی صفائی بذریعہ ان کے گورنمنٹ سے چاہتا ہوں دیکھوں کیا ہوتا ہے کتاب اور عرضی اداسٹا ماہ جنوری میں ولایت کو روانہ کر کے یہاں آیا ہوں۔ چھ ہفتے میں جاؤں پتہ چاہیے یقین ہے کہ پارسل ولایت پہنچ گیا ہوگا۔

دلی | جیسا اوپر عرض کیا جا چکا ہے غالب آخر پانچ ستمبر ۱۸۶۶ء میں رام پور سے واپس آگئے دلی

میں ان کی واپسی پر چہرے گونیاں شروع ہو گئیں۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

میں اس وقت جو آخر جنوری کو رام پور جا کر تخریلج میں یہاں آ گیا ہوں تو کیا کہوں یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول ہے کہ شخص دلی رام پور کا متا تھا وہاں گیا تھا۔ اگر وہ اسے کچھ سلوک نہ کیا ہو گا تو بھی پانچ ہزار سے کم نہ دیا ہو گا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر ذکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے نواب نے ذکر رکھا یہاں تک کہ دو سو روپیہ دینا کر دیا تھا نواب لغٹ گورنر لدا یاد جو رام پور آئے اور ان کو غائب کا وہاں ہونا مسلم ہوا تو انہوں نے نواب صاحب کے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اسے جواب دے دو نواب نے برطرف کر دیا۔

اس کے بعد خود اصل حقیقت بیان کرتے ہیں :-

اب تم اصل حقیقت سنو نواب یوسف علی خاں تین تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ عجیب دیا کرتے تھے اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سرورہ ہینڈا ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلائے رہتے تھے اب میں گیا دو مہینے رہ کر چلا آیا بشرطیات بدبرسات پھر جاؤں گا۔ ہر کو پال تفتہ نے قیام رام پور کے دوران میں لکھا تھا کہ مجھے بھی وہیں بلا لیجئے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

بفضل نواب لغٹ گورنر بہادر مراد آباد اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔ بعد ان کے جانے کے کوئی طور قاست یا عدم قاست کا ٹھہرے گا منظور ہو کر یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا تو تم کو بلا لوں میری ہمدی مخرج نے غالباً جلد واپس آ جائے گا سبب چھا تھا لکھتے ہیں :-

میر ہمدی تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح نافہونی ہے ؛ میں اس مہینے میں رام پور کیوں رہتا انواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے برسات کے آسمان کا لہجہ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن پہل پہنچا۔ ایک شنبہ کو غزوہ ماہ مقدس ہوا۔ اسی دن سے صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب لوی



جبرئیل صاحبِ قرآن سُنتا ہوں شب کو مسجد جامع میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں کبھی جو جی میں  
 آتا ہے تو وقت صوم ہوتا ہے یا نہیں جا کر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں۔  
 لیکن یہ سب مشاغلِ محض افسانہ تھے۔ شوقِ طبعی کے کرشمے تھے اہل کیفیت یوں بیان  
 کرتے ہیں:-

لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا وہاں انہوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بچہ دینے میں دہم آیا کہ  
 خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو دہنامی عمر بھر کی رہے۔ اس سب سے جلد چلا آیا درہ گری برسات  
 کے دن وہاں کا کتاب ہر شرط حیاتِ جدیدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دن تک نشاںِ آؤں گا۔  
 یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:-

میں ۲۳ شبان (۱۲۷۵ھ) کو رام پور سے چلا اور ۲۴ شبان کو دہلی پہنچا سی دن چاند ہوا۔  
 اپنی تنخواہ کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

نواب صاحب نے سنا وہ شاکر وادہ دیتے ہیں مجھ کو کو کہ نہیں سمجھتے۔ ملاقات بھی دوستانہ ہی نہ تھی  
 بظہیر جس طرح احباب میں رسم ہے وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر و لوائی تھی۔  
 بس بہر حال غنیمت ہے رزق کے بھی طرح ملنے کا شکر ادا کرنا چاہئے کبھی کا شکوہ کیا۔

دوسرا سفر رام پور | غالب نے رام پور کا دوسرا سفر اکتوبر ۱۸۶۵ء میں کیا اور جنوری ۱۸۶۶ء میں واپس  
 آئے۔ نواب یوسف علی خاں والی رام پور نے ۱۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو وفات پائی ان کی جگہ  
 نواب کلب علی خاں بہادر نشین ہوئے۔ نواب صاحب کی ہمسند نشینی کے جشن کی تقریب  
 میں غالب دوسری مرتبہ رام پور گئے تھے مولوی عبدالرزاق شاکر کو تحریر فرماتے ہیں:-

فقیر پاور کا ہے۔ سہ ماہیہ چار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہو گا۔  
 تقریب وہاں کے جلنے کی رتیں مرعوم نواب یوسف علی خاں کی تعزیت اور رتیں حالِ دوا  
 کلب علی خاں کی تنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہو گا۔

راستہ اور نازل | یہ سفر غازی آباد دیکھو سے، لاہور اور موداد کے رستے ہوا تھا۔ باقر علی خاں اور

حسین علی خاں اس سفر میں بھی ساتھ تھے قواب شہاب الدین احمد خاں شاقب کو لکھتے ہیں:

غازی آباد کا حال ششاد علی دشاد علی بیگ رضوان سے سنا ہو گا جتنے دن معین گھڑی  
دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا یہ مقصد یہ تھا کہ لکھنؤ سے رہوں۔ وہاں توافد کی گنجائش  
نہ پائی۔ ہاؤس کو روانہ ہوا۔ دو نو رختہ دار گھوڑوں پر سوار پہلے چل دیے چار گھڑی دن رے میں ہاؤس  
کی سرائے میں پہنچا۔ وہ فوجیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹٹلتے ہوئے پایا۔

ہم راہی پہلے سفر میں بھی کافی تھے اور دوسرے سفر میں بھی ان کی تعداد اچھی تھی  
ہوتی ہے۔ کھانے کی کیفیت ان لفظوں میں لکھتے ہیں:-

میں نے چھٹانک بھر گئی دغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دیے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب  
پانی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے اسہر کی کچڑی پکوائی۔ دو غب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب  
آدھ سوں کو بھی کھلائی، مکن کے واسطے سادہ سالن پکوا یا۔ ترکاری نہ ڈلوائی۔

پھر فرماتے ہیں:-

چار پانچ بجے صبح، کے عمل میں ہاؤس سے چل دیا، سورج غلبے باؤر گھر کی سرائے میں پہنچا۔ چار پانچ بجائی  
اس پر بھجھنا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں اور یہ خاکہ رہا ہوں دو گھوڑے کوئل آ رہے ہیں۔ دو نو لڑکے رختہ  
میں سوار آتے ہیں۔ وہ آئے، اور کھانا کھالیا اور چلے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سواری کے لئے دو گھوڑے تھے۔ ایک رختہ تھا دو گائیاں تھیں  
اور غالب پالکی میں سفر کرتے تھے حکیم غلام کف خاں کو لکھتے ہیں:-

بدھ کا دن ہے۔ پھر بھون چڑھا ہو گا فقط میں پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۱۲ جمادی الاول کی اور اکتوبر  
کی ہے۔ دو نو لڑکے دو نو گائیاں اور رختہ اور آدمی پیچھے ہیں اب آئے جاتے ہیں، رات بخیر گزرے  
کل رام پور پہنچ جاؤں گا (دینی ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو) گھبراہوا ہوں تیسرا دن ہے پافانہ پھرے کو  
لڑکے بخیر و مافیت ہیں۔

واپس ۱۱ رام پور وہ ۱۲ اکتوبر کو پہنچے تھے۔ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ اکتوبر کو دلی سے چلے

اس لحاظ سے پانچ روز سفر میں صرف ہوتے۔

رام پور کی سرکار کا فیکٹرکچر در روزینہ خوار میں حال نے نمونہ نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو در دولت پر ہانا دوا جب ہوا ہفتہ اکتوبر کو دلی سے رام پور روانہ ہوا بعد قلع منازل ستہ واپس پہنچا۔ بعد اقامت جشن عازم وطن ہوا ہشتم جنوری کو دلی پہنچا عرض روا میں بیمار ہوا پانچ دن مراد آباد میں صلا خط بنا۔ دلی واپس آنے کی تاریخ کے متعلق ایک عجیب بھجن ہے غالب نے لکھا ہے کہ وہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے راستے میں پانچ روز رام پور میں بیمار رہے۔ اس لحاظ سے سفر میں کم و بیش دس روز صرف ہوئے یعنی غالب اواخر دسمبر میں رام پور سے چل پڑے تھے لیکن علامہ الدین احمد خاں کے نام کے ایک خط جو رام پور سے لکھا گیا تھا ۱۳ جنوری کی تاریخ ثبت ہے سال درج نہیں یہ معلوم ہے کہ غالب صرف دومرتبہ رام پور گئے۔ اگر وہ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی واپس آچکے تھے تو ماننا پڑے گا کہ وہ تیسری کو رام پور میں نہیں تھے پہلی مرتبہ وہ ۲۶ جنوری یا ۲۷ جنوری کو پہنچے تھے۔ اس لئے پہلے سفر کے سلسلے میں بھی ۱۳ جنوری کو ان کا رام پور میں ہونا قابل تسلیم نہیں۔ میرزا خیال ہے کہ نواب علامہ الدین احمد خاں کے خط پر جو تاریخ ثبت ہے وہ غلط ہے اور غالب کے مطبوعہ رسائل میں اس قسم کی متعدد غلطیاں موجود ہیں حالات زمانہ قیام | ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں :-

تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے خدا کی قسم میں بیاں خوش اور تندہ دست ہوں دن کا کھانا ایسے وقت میں آتا ہے کہ پہرہ نہ چڑھے مک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے کئی طرح کے سالن، پلاؤ، پنجن، پھنڈے، دو دو وقت روٹیاں وغیرہ بچاوتیاں، سر، آچاریں بھی خوش لڑکے بھی خوش، کھانا اچھا ہو گیا ہے۔ متقا، مشعلی، خاکروب سرکار سے شہین ہے مجام اور دھوبی رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں تعلیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کم نہیں۔ کچھ لکھتے ہیں :-

نواب صاحب کا اخلاص و انصاف روز افزوں ہے آج نعل کا دن ہم جہادی انسانی کی اور ہم ہرگز کی ہے۔ کھانے اور کھوٹوں اور بیوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی لیکن اس میں بیرونا غرہ ہے

نقصان نہیں۔ دسمبر کی پہلی سے جشن شریف ہو گا ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اس کی ہے۔ جشن کے مناسبت  
میرزا شمشاد علی بیگ نے ضواں کو تحریر فرماتے ہیں:-

آج ۴ روزہ برکی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں فرماتے ہیں دو ہفتہ میں آؤں گا اگر  
چار روزہ یہاں رہیں گے پھر نایش گا وہ بریلی کی سیر کر جائیں گے۔ وہاں سے پھر کرب آئیں گے تو صاحب  
مکشتری کی کا انتظار فرمائیں گے وہ پانچ دسمبر تک آجائیں گے تین دن جشن رہے گا۔ اس کے دو چار  
روز بعد غائب حضرت سید ہو گا۔ حذا کرے تم تک زندہ پہنچ جاتے۔

کیفیت جشن | ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کے مکتوب میں نواب علار الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

یہاں جشن کے وہ سامان جو رہے ہیں کہ جمید لکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر ناچو نامی  
ایک بستی ہے آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا ہے۔ پرسوں صاحب کشنریچ چند میمنوں اور صاحبوں  
کے آئے اور جیوں میں اترے کچھ کم سو صاحب اور میمن جمع ہوئے۔ سب سرکار اور ہر کے ہمان بکلی شہ  
۵ دسمبر حضور پر نور سے تہل سے آغا پور شریف لے گئے۔ بارہ پروں بچے گئے اور شام کو پانچ بجے  
خلعت پہن کر واپس آئے وزیر علی خاں خاں سامان خواہی میں سے روپیہ چھینکنا ہوا آتا تھا۔ دو  
کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ شمار ہوا ہو گا کچھ صاحبان عالی شان کی دعوت ہے تین اور  
شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے  
طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع جس کی طوائف الملک کتنا چاہئے۔

نواب کلب علی خاں مرحوم | نواب کلب علی خاں کا حلیہ یوں بیان کرتے ہیں:-

قد، دنگ، شکل، شامل، معینہ، بھائی، ضیاء الدین احمد خاں۔ عمر کافوق، اور کچھ چہرہ اور کچھ تفاوت  
حکیم خلیق، باذل، کوہ مستواض، متشع، متورع، شرف، سیکڑوں شعرا، نظم کی طرف توجہ نہیں اتر  
لکھتے ہیں۔ اور خوب لکھتے ہیں جلا لائے طباطبائی کی طوط پر کہتے ہیں شگفتہ جیسے ایسے کان کو دیکھنے  
سے غم کوسوں بھاگ جاتے۔ فیض بیان ایسے کمان کی تقریر کن کر ایک اور نئی روح غالب میں آئے۔  
حکیم غلام کھنٹ خاں کو لکھتے ہیں:-

نواب صاحب حال ہتھکھڑے والد شریف محسن اخلاق میں نواب فردوس آرا نگاہ کے برابر  
بالکلیں شیوہ و روش میں ان سے بہتر ہیں۔ بہر حال سندھ نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کر دیا۔  
علی بخش خان ساماں کو تیس ہزار روپیہ بابت مطالبہ سرکار بخش دیا مفصل حالات ذیل و نوال عندنا  
زبانی کہوں گا سنا صاحب میں فقیر آنا و کیش ہوں۔ دنیا و انیس سکا نہیں جس میں جو صفات دیکھا ہوں  
بیان کرتا ہوں۔

مشفق حالات | اس جشن میں غالب کے نہایت عزیز دوست نواب مصطفیٰ خاں شفیقہ بھی شریک ہوئے  
تھے۔ نیز منشی نوکشور مالک مطیع نوکشور نے اپنی صاحبزادی کی شادی کے سلسلے میں مالی امداد کی  
عرضداشت پیش کر رکھی تھی۔ غالب ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء کے خط میں ہر گوبال تفتہ کو لکھتے ہیں :-  
میں شرکی داد و درختم کا صلہ مانگنے نہیں آیا بھیج مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گروہ سے نہیں کھاتا  
سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قنوت اور نعم کی ہمت۔ نواب صاحب از روئے صورت  
روح مجسم و باعتبار اخلاق ابر حجت ہیں۔ خزانہ فیض کے تولید انہیں جو شخص منترا نزل سے جو کچھ لکھ لایا  
ہے۔ اس کے بیٹے میں دینیس لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیے سال کا غلہ کا محصول معاف کر دیا ایک  
اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا۔ اور میں ہزار روپیہ نقد دیا منشی نوکشور کی عرضی پیش ہوئی۔ غلامہ  
عرضی سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریب شادی حبیبہ تجویز ہوا ہے بمقدار چھ روپے کھلی  
بھائی سے ملے خاں بہ تقریب سندھ نشینی و شمول جشن کئے دلے ہیں اس وقت تک نہیں آتے۔  
وہی کے بعد دہلی سے تفتہ کو لکھتے ہیں :-

۸ جنوری سال (۱۸۶۶ء) دو شنبہ کے دن غضب الہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا اور آبا  
بہن کو بیمار ہو گیا۔ پانچ روز صمد الصمد کے ہاں پڑا انہوں نے بیمار داری اور غمخواری بہت کی۔

جس زمانے میں غالب رام پور میں تھے قاضی عبد الجلیل صاحب بیلوی نے انہیں لکھا تھا  
کہ بریلی میں غماتش ہو رہی ہے یشریف لاسیے اور فائش لی سیر بھی کیجے انہیں لکھتے ہیں :-  
سندھ نشینی کی تنہیت کے واسطے رام پور آیا۔ میں کہاں بریلی کہاں۔ ۱۲ اکتوبر کو میاں ہنچا شیلٹر

حیات و سبب تکسلی جاؤں گا۔ نمائش گاہ میٹلی کی سیرکمان خود اس نمائش گاہ کی سیر سے جہاں  
دنیا کہتے ہیں دل بھر گیا۔ اب عالم بے رنگی کا مشتاق ہوں۔

سفر میرٹھ کے سفر کی تقریب یہ تھی کہ غد میں دوسرے اکابر کے علاوہ مصطفیٰ خاں شیعہ بھی گرفتار  
ہو گئے تھے۔ ان پر مقدمہ چلا اور سات سال قید کی سزا ہوئی۔ بعد ازاں ان کی بے گناہی ثابت  
ہو گئی اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ رہائی کی خبر سن کر غالب ان سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے یہ سفر  
آخر جنوری ۱۸۵۹ء میں ہوا تھا تین روز میرٹھ میں ٹھہرے اور ۲۵ جنوری ۱۸۵۹ء کو مدلی واپس  
آئے۔ ہر کوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو سیل ڈاک میرٹھ گیا تھا تین دن واپس راجپوتانہ سے واپس  
آج تک کوئی خط بھیجایا۔ محرمہ و مہرہ چار شنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء۔  
پھر لکھتے ہیں:-

صاحب میرٹھ سے اگر تم کو خط لکھ چکا ہوں شاید پہنچا ہوں واسطے از رو سے احتیاط لکھتا ہوں  
کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو سیل ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ اور شنبہ کے دن مدلی گیا صبح یک شنبہ  
سی ام جنوری ۱۸۵۹ء

مارچ جانے کا ارادہ | غالب کے اوکسی سفر کا علم نہیں ہو سکا البتہ بعض سفروں کے ارادوں اور بعض دعوتوں کا  
پتہ ان کے خطوط سے چلتا ہے لیکن نظریہ ظاہر یہ ارادے پورے ہوئے اور نہ غالب نے دعوتیں قبول  
کیں۔ مثلاً ایک موقع پر مارہرہ کے ایک صاحب کے طریق تمنا ذکر کیا تھا کہ مارہرہ جانے اور پیٹ بھر کر آم کھا  
کوچی چاہتا ہے۔ صاحب عالم مارہروی نے جو غالب کے بہت متفقہ تھے یہ سنا تو فوراً لکھا کہ بعد مارہرہ جانے  
اور مدلی سے روانگی کا دن لکھیے جواب میں فرماتے ہیں:-

حضرت کو کس راہ سے میرے آنے کا انتظار ہے۔ میں نے مرشد اوسے کے خط میں کب اپنا غم  
لکھا یا کس نے آپ کے میری زبانی کہا کہ آپ روز رو انگی کے تقریبے اطاعت چاہتے ہیں۔ ہاں آپ کی  
قدم بڑی اور انوار الدولہ کے دیوان کی آرزو صد سے زیادہ ہے اور یہاں جانتا ہوں کہ یہ آرزو گوئیں جاؤں گا۔

پھر لکھتے ہیں :-

خداوند مجھے مارہرہ بلائے ہیں اور میرا مقصد مجھے یاد دلانے ہے ان دونوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی شیخ من الدین جم سے بطریق نفاک کیا تھا کبھی یوں چاہتا ہے کہ ریاست میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور سپیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں اور طاقت کہاں سے پاؤں کاپی کا ارادہ | نواب انوار الدولہ تیس کاپی کو لکھتے ہیں :-

میرا دل جانتا ہے کہ آپ کے دیکھنے کا میں کس قدر آرزو مند ہوں میرا ایک بھائی ماسوں کا بیٹا یعنی خواجہ غلام حسین خاں کیدان کبڑا بھی کاپوتا ہے کہ وہ نواب ذوالفقار الدولہ کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا ماوراء سندھین (باندہ) حال کا چچا تھا اور وہ میرا ہمیشہ بھی تھا یعنی میں نے اپنی مانی دوس نے اپنی چچی (عالت کی والدہ) کا دودھ پیا تھا وہ باعث ہوا تھا میرے باندہ بنوید کھنڈے کا میں نے سب ماسوں سے کر لیا۔ ڈاک میں ڈاک مارو پیو دے دیا مقصد یہ تھا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا دہاں سے نواب علی بہادر رئیس باندہ) کے ہاں کی سواری میں باندہ جا کر مقصد بھر رہا کاپی ہوتا ہوا آپ کے قدم کھٹکا ہوا سبیل (ڈاک چلاؤں گا نا کچھ حضور والا) ابو ظفر بہادر شاہ) بیمار ہو گئے۔ مرض نے طوالت لی چچا وہ ارادہ قوت سے فعل میں ملتا آیا اور پھر مرزا اورنگ خاں میرا بھائی مرگیا

لے بسا آرزو کہ خاک شدہ

والہ وہ سفر اگرچہ بھائی کی استدعا سے تھا مگر نتیجہ اس شل کا آپ کے دیدار کو سمجھ ہوتے تھا۔

فتح آباد کا ارادہ | میر احمد حسین خاں میکیش کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہ نواب حسین

لے نواب نجل حسین خاں نیکش خاندان میں سے تھے۔ محمد خاں نیکش سلطنت مغلیہ کے آخری دور کا ایک مشہور سردار اور جنگی تھا اس نے فتح آباد کی ریاست تلمیم کی تھی بلکہ فتح آباد کا قصبہ خود فتح سیر کے نام پر آباد کیا تھا یہ نواب محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا قاسم خاں نیکش ہوا وہ لڑائی میں لیا تو اس نے بھائی قاسم خاں کے بعد ایک اور بھائی احمد خاں نے ریاست سنبھال لی۔ احمد خاں کے بعد اس کا بیٹا متفرج جنگ مسند نشین ہوا مگر جنگ نے ۱۷۵۷ء میں فوج پانی تو اس کا بیٹا ناصر جنگ پھر ناصر جنگ پھر شکر جنگ گدی پر بیٹھا۔ نواب نجل حسین خاں شکر جنگ کے صاحبزادے تھے ۱۷۵۷ء میں فوج پانی چو نکا ایک کوئی اولاد نہ تھی

اس نے ان کے چچا بھائی افضل حسین ریاست پانی لیکر قندھار حسین رفاقت کا الزام لگا رکھا ہے شل جانے کی شرط پر ان کو چھوڑ دیا اور وہ چلا گیا۔

والی سرخ آباد کی دعوت پر فرخ آباد جانے کا قصد کیا تھا فرماتے ہیں:-

دریں فرخندہ ہنگام امیر سلطان شکوہ نصیر الدہ و امین الملک تاج محل حسین خاں بہادر حشمت جنگت دہا  
نشین ایالت فرخ آباد است..... و رودین بہ فرخ آباد آرزو کردہ ہر چند گوشہ نشینی و نامرادی آئین  
است اما بہ شاہدہ مرے کہ ایں دلا جاہ الامن سے ورز و آہنگ آں دارم کہ پائے خرابیدہ را بہ وقت  
آرم و از دہلی بہ فرخ آباد پویم و دشوار با غوثیتین برم بچہ خوش باشد کہ پیوندنافاست شودی کہ نہ بر اندازہ  
ارزش شاست بگسلید و ہم دریں ہفتہ بین پیوندیدہ

ہا کہ سشیوہ بکس خواہ ستاں

غنا گستہ تراز باؤ نو بہار بیا

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب فرخ آباد گئے یا نہیں گئے لیکن یہ بہر حال ان کا قصد ۱۸۴۶ء  
سے پیشتر کا ہے۔ اس لئے کہ ۱۸۴۶ء میں نواب تاج محل حسین خاں کا انتقال ہو چکا تھا غالب  
کی ایک اردو غزل کے آخر میں تاج محل حسین خاں کی مدح میں چند اشعار بہ طور قطعہ موجود ہیں۔  
دیا سہ نطق کو بھی تانا سے نظر نہ لگے، بنا سہ عیش تاج محل حسین خاں کے لئے  
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے مرئی باں کے لئے  
نصیر دولت و دیں اور امین ملت ملک بنا سہ چرخ بریں جس کے آستان کے لئے  
زمانہ عمد میں اس کے ہے جو آرائش نہیں گئے اور تارے اب آسمان کے لئے

گو ایسا کارا ارادہ میر سید علی خان بہادر عرف حضرت جی کے نام کے ایک فارسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ  
گو ایسا راجا جانے کا قصد بھی کیا تھا۔ حضرت جی کو لکھتے ہیں کہ مجھے ولایت سے اپنے مقدمے کے  
متعلق آخری اطلاع ملنے کا انتظار ہے۔ اس کے بعد۔

جہاں مایہ دت کہ بہر بخام ضروریات سفر و ناتواند کہ بہ دہلی نیار امم گئے وہ گویا ہر نام و اگر و مذکان سیتا رہنم ہونم  
غالباً یہ قصد بھی پورا نہ ہوا۔

لے نصیر الدہ و امین الملک حشمت جنگ تاج محل حسین خاں کے اجزائے خطا تھے۔



سورت کی دعوت | غائب کی زندگی کے آخری دنوں میں ذاب میر غلام بابا خاں نہیں سورت بجاتے

تھے اور کہتے تھے کہ ریل کے سفر میں تکلیف نہیں اہوگی۔ غائب ان کے تقاضے کے جواب میں کہتے ہیں

ہ سواری ریل روانہ ہونے کی لہر میں آتی پاؤں سے اپانچ، کانوں سے بہرا، ضعف رات،

دل، ضعف، دل، ضعف، صدمہ اور ان سب پر ضعف طالع کیوں کر قہر سفر کروں، تین چار شاہ روز

قصر میں کس طرح بسر کروں گھنٹہ بھر میں دو بار میٹاب کی حاجت ہوتی ہے۔ ایک ہفتہ دو ہفتہ بعد ملا

توبخ کے دورے کی شدت ہوتی ہے۔ طاقت جسم میں حالت جان میں نہیں۔ تاہم سورت تک کسی

صورت چیز امکان میں نہیں۔

اس سے پہلے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ریل تین چار روز میں سورت پہنچتی تھی۔ غائب کے کمالات نگارش کا یہ ایک نہایت دلچسپ کمرشہ ہے کہ وہ تفصیل کے غرض و ارادہ کے بغیر مختلف ضروری حالات کو ضمناً بیان کر جاتے ہیں۔ مثلاً اپنی پیش کش کے لئے درخواست ولایت بھیجنے کے ضمن میں یہ بیان کر گئے تھے کہ جو پہلے ہفتے میں لندن پہنچتا ہے۔ اور یہاں سورت تک ریل کے سفر کی مدت بیان کر گئے۔

انبالہ کا ارادہ | غائب کا دوبارہ بارہ اوخلعت جب سرکار انگریزی سے بحال ہوئے تو لفٹنٹ گورنر پنجاب نے انہیں کہا تھا کہ گورنر جنرل انبالہ میں دربار کریں گے۔ وہاں جا کر خلعت لے لیجئے۔ اگرچہ غائب نے اس وقت لفٹنٹ گورنر کو یہ جواب دیا تھا کہ انبالہ کہاں جاؤں گا لیکن بعد میں وہ انبالہ جانے کے تیار ہو گئے تھے اس سے قبل ان کے سیدھے ہاتھ پر ایک پھنسی لگی تھی جو پھول بن گئی۔ اس کی وجہ انہیں اپنا یہ ارادہ سفر فتح کرنا پڑا۔

## چھٹا باب پنشن کا مقدمہ

بندہ را بودہ است از سرکار دست مزد شقت سہلاف  
زیر سالانہ برائے دوام وجہ شائستہ بقدر کفایت  
ملزعم کردہ اندھاں بد دروغ حق من خوردہ اندہیں بگزاف  
آہ از اقریائے بے آزر دم داد از حاکمان بے انصاف

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب اپنی خاندانی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں مکلف تھے۔ خواجہ حالی نے اس باب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اتنا بھل ہے کہ کوئی شخص اس سے غالب کے مطالبات کی صحیح کیفیت معلوم نہیں کر سکتا۔ اور جس جھگڑے میں ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ صرف جس کی وجہ سے ان کا دل سلسل میں برس تک ل غم و غش کن توقعات کا مولد و شہد بنا رہا اس کی تفصیلات ظاہر نہیں ہو سکتیں۔ مگر اس قضیہ کا غالب کی نظم و شعر میں جا بجا ذکر ہے اور جب تک اصل قضیہ کے حالات معلوم نہ ہوں نظم و شعر کے وہ حصے ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس لئے میں جو شعر کی ہے کہ اٹلستان کا ایک ایک پہلو سامنے آجائے

خاندانی پنشن کا آغاز ۱۸۵۶ء میں غالب کے چچا میرزا نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہوا۔ وہ لاڈلیکے ماتحت چار سو سو ار کے بریڈ بیر تھے۔ ایک ہزار روپیہ مالانہ ان کا ذاتی مشاہرہ تھا۔ لاکھ ڈیڑھ لاکھ سالانہ کی جاگیر تھی۔ ان کے انتقال کی جاگیر واپس لے لی گئی۔ اور ان کے متعلقین کی پرورش کے دیکھ کر وہ پے سالانہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور جھجر کے ذمے لگا دیے گئے۔

۱۸۵۶ء کے شروع ہونے پر مرحوم نے خدا جانے کس نیا پر ترو سو روپے لکھا ہے (۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) (۷) (۸) (۹) (۱۰)

صاحب کو ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۴ء میں دو جاگیریں بطور استمراری تھیں۔ ایک فیروز پور چھر کا اور ساگر  
کی جاگیر دوسری پرگنہ پونا مانا۔ پھور اور ٹکینہ کی جاگیر اول الذکر کا معاوضہ پانچ ہزار روپے سالانہ اور  
آخر الذکر کا معاوضہ میں ہزار روپے سالانہ تھا یعنی دونوں جاگیروں کے لئے نواب صاحب یک ہزار  
روپے سالانہ سرکار انگریزی کو ادا کرنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے۔ ان جاگیرت کے باشندے  
بڑے سرکش اور امن شکن تھے۔ اور ان کو مطیع رکھنے کے لئے نواب صاحب کو خاص انتظامات کرنے  
پڑتے تھے۔ لہذا لارڈ لیک کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ نواب صاحب کے ساتھ کسی حد تک رعایت ہونی  
چاہیے۔ اسی اثنا میں نصر اللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا۔ لارڈ لیک نے ۱۸۰۳ء کو حکومت کی طرف  
سے ایک شفقہ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے نام بھیجا دیا کہ جو چھپیں ہزار روپے وہ حکومت کو ادا کرتے  
ہیں ان میں سے دس ہزار روپے سالانہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو دیئے جائیں میرزا نے  
مرحوم کے رسالے کے پچاس سوار باقی رہ گئے تھے جن کا افسر خواجہ حاجی نام ایک شخص تھا۔ ان کے  
متعلق انتظام کر لیا جائے اور قیام امن کے لئے حکومت سے کوئی امداد طلب نہ کی جائے ان شرطوں  
پہچیں ہزار روپے کی رقم معاف ہو جائے گی اور جاگیر متعلق نواب صاحب اور ان کے وارثوں کے  
پاس رہے گی۔ یہ شفقہ حکومت کا منظور کردہ تھا۔ اور اس کا مسودہ دفتر میں موجود تھا لیکن معلوم ہوتا  
ہے کہ مارچ ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک اور شفقہ حاصل کر لیا جس پر مضمون  
یہ تھا کہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو صرف پانچ ہزار روپے سالانہ دیئے جائیں اور ان  
متعلقین میں خواجہ حاجی کو بھی شامل کر لیا گیا جو حقیقتہً کسی اعتبار سے بھی میرزا نصر اللہ بیگ خاں کا رشتہ  
نہ تھا اور پانچ ہزار کی تقسیم یہ قرار پائی۔

دو ہزار روپے سالانہ

پندرہ سو روپے سالانہ

پندرہ سو روپے سالانہ

خواجہ حاجی

والدہ و ہمیشہ کان نصر اللہ بیگ خاں

میرزا نوشہ اور میرزا یوسف

برادر زادگان نصر اللہ بیگ خاں

جھانپنے کی ابتدا کیوں کر ہوئی؟ غالبؒ نے اس میں صرف نو برس کے تھے جو کچھ ملتا رہا اس پر غلام رہے۔ جب ہوش سمجھا لا تو معلوم ہوتا ہے کہ اپنی خاندانی جائداد کو بیچ بیچ کر گزارا کرتے رہے۔ نیز نانا کی طرف بھی ان کی کافی امداد ہوتی تھی۔ جب وہ دہلی آ گئے تو غالبؒ نے نواب احمد بخش خاں مرحوم وظیفہ مقرہ کے علاوہ بھی ان کی امداد کرتے رہتے تھے۔ جب نواب الہی بخش خاں کا انتقال ہو گیا، نواب احمد بخش نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ اور نواب شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھر کے رئیس بنے۔ تو اس وقت مقرہ وظیفہ کے سوا کوئی ذریعہ آمد باقی نہ رہا بلکہ سر میر الدین احمد خاں کے بیان کے مطابق شمس الدین وہ بھی بند کر دیا تھا علاوہ بریں غالبؒ کی بیگم صاحبہ کو تیس روپے ماہانہ کا جو وظیفہ نواب احمد بخش خاں کے زمانے سے فیروز پور جھر کے سے ملتا تھا وہ بھی بند ہو گیا۔ اس حالت میں غالبؒ کو اپنی خاندانی پناہ کے سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں پانچ ہزار روپے کے اس شقہ کا غائبہ کوئی علم نہ تھا جو نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۰۶ء کو لارڈ میک سے حاصل کیا تھا۔ اور سمجھ رہے تھے کہ لارڈ میک کی تجویز اور حکومت کی منظوری سے ان کے خاندان کے لئے دس ہزار روپے سالانہ کی جو پنشن مقرہ ہوئی تھی۔ وہی ملنی چاہئے۔ اس پنشن میں سے ان کے خاندان کو صرف تین ہزار روپے ملتے رہے تھے۔ خواجہ حاجی چونکہ نصر اللہ بیگ خاں کے حقیقی متعلقین میں شامل نہ تھا اس لئے اس کے دو ہزار روپے کو بھی وہ اپنی خاندانی پنشن کا جزو نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ انہوں نے مطالبہ پیش کیا کہ اول ان کی دس ہزار کی پنشن بحال ہوئی چاہئے۔ دو مہینے رقم انہیں نہیں ملی وہ مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر کاملاً ملنی چاہئے۔

محبیبوں کا ہجرم اس زمانے میں ان کی مالی حالت بہت فقیرم تھی۔ وہ اپنی آزاد و مشربوں میں کافی رقم اڑا چکے تھے۔ بہت سارے روپیہ قرض لے چکے تھے ایک طرف قرضخواہ انہیں تنگ کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کا بھائی دیوانگی کے عارضہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ وہ خود فرما تے ہیں:

آغا درود پہلی کہ دود باد غفلتے بہ تیج دہم سختے از غریبوں جاوہ کار دانی ہوس گزشت دے راک  
خوامیدہ شد۔ تا سر از منستی بگردانند زان تجوی پائے مضطربہ پایے ہر گزے فرود رفت.....

دیوانی برادر ایک طرف وغرغلتے واپس ٹھہرا ہاں ایک سوا شوبے پر پیدا کر کہ نفس راہ لب ذخاہ روزہ حشم  
فراموش کرد.... با بے از سخن دوختہ و چپے از خویش فرو بستہ جاں جاں شکستگی و عالم عالم غمی با خود کرتدم  
از بیدار و روزگار االان و سینہ بروم تیغ مالان بہ کلکتہ رسیدم۔

ذاب کے ساتھ فیصلہ کی کوشش | معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ جانے سے قبل دہلی کے مختلف دوستوں نے نہیں  
مشورہ دیا تھا کہ خود نواب صاحب ہی سے فیصلہ کر لیا جائے چنانچہ وہ اس عرض کے لئے فیروز پور  
گئے۔ وہ خود دہلی سے نواب علی بخش خاں رنجور کو لکھتے ہیں :-

یک چند بہ امید نواب صاحب ختم دار نواب آتش انتظار کہ ختم نشستہ ام بہ عذاب کہ مجرم بہ زندان  
رے بنیم آنچہ کا فریہ منہ بہ فیروز پور از میراں نیادہ بودم کہ بازم بہ دہلی باید آمد نواب صاحب مرابہ  
ز بانہ فریقند.... تا کجی شکیب و رزم و خود را بہ ہیج شاد ماں دارم از رود و یار شاہ جاں آبا و یابا و  
..... میلام علی را با عرضہ اشت بہ خدمت نواب صاحب فرستادہ ام ز نامار باسن زمانہ سازی و از  
نواب عا با کنید۔ و چنان کنید کہ چوں عرضہ اشت خواندہ شود شہام دران بہن با شیدہ تا عا را ش را با گذر  
نیز دہید..... یا ران سے گفتند کہ تو بہ نواب سے گزائی و درودل باہ سے لئے گئی۔ ورنہ انکجا کہ نواب  
بہ چارہ بر نہ خیزد.... اینما کہ سے کشم از میراں بندی این او انشا سان است خدا رطلح آن انگیند  
کہ میرا ام علی زود و برگرد و دہن پوند و تا دوستان باز را خیر باد گویم و بہ سرو بگے کہ نہ دہم شہ تی گویم

کلکتہ میں کوشش | اب بہر حال غالب جون ۱۸۲۷ء میں دہلی سے روانہ ہو کر فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے  
دو روز آرام کرنے کے بعد نواب اکبر علی خاں سے ملنے کے لئے ہو گئی گئے جن کے نام مولوی  
محمد علی خاں صدر امین باندہ نے ایک سفارشی خط دیا تھا۔ اس کے بعد سائن فریز صاحب سے  
ملے جو اس زمانے میں گورنر جنرل کے دفتر فارسی میں اسٹنٹ سکرٹری کے عہد پر مامور تھے۔ فوراً  
سین فریزر اسٹنٹ سکرٹری اور باقم ملاقات شاستہ ردا و دہ ہتقبال و شایعت و سناٹھ  
و عطائے عطر و پان پیمیاں آمد طر ملاقات ایں ستودہ غم سے خرسند و توانا دم کرد۔ عرضہ اشت گورنر جنرل

ہماورچا نکہ رسم ابن داد گاہ ہست بہ صاحب سکرطری ہماور سپردہ اندوہم دہیں صحبت صاحب سکرطری

ہماورائں را با پائش صاحب سپردتائیں بہ انگریزی نقل کند۔

اس تحریر سے یہ بھی واضح ہو سکتا ہے کہ ۱۸۲۵ء میں انگریز افسر مغرز ہندوستان میں کسٹین پر ملتے تھے جب وہ ملنے کے لئے آتے تھے تو فہرستان کا استقبال کرتے تھے۔ ان سے معاف کرتے تھے۔ عطر اور پان دیتے تھے اور جاتے وقت چند قدم چھوڑنے کے لئے ساتھ جاتے تھے۔

چیف سکرطری سے ملاقات | مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ جو دفتر فارسی کے سکرطری اور پولیس ڈوی پارٹمنٹ کے ڈپٹی سکرطری رہ چکے تھے۔ غالب کا مقصد پیش ہونے کے زمانے میں چیف سکرطری تھے۔ غالب نے ان سے بھی ملاقات کی۔ وہ بڑی اچھی فارسی جانتے تھے۔ غالب کے بیان کے مطابق سخن فہم تھے۔ بڑے حسن اخلاق سے ملے۔ غالب نے ان کی طرح میں بچپن شعر کا ایک فارسی قصیدہ کہا تھا۔ اس کا ایک حصہ سنایا۔ مسٹر اسٹرلنگ بہت خوش ہوئے اور وعدہ کیا کہ پوری امداد فرمائیں گے غالب لکھتے ہیں:-

اندرو اسٹرلنگ کہ قوس عروجی کوئل را نقطہ برایت وقوس نزولی آں ساقط نہایت ہست چوں سزایہ  
علم و آگاہی وارد و سخن راے نمد و بہ اہل بیت سخن داسے رسد و روح دے قصیدہ شمشیر پنجہ و پنج بیت  
کردم دور آخر قصیدہ لکھتے اذ حال خوشن کا ششم از سخن اتفاق یہی کسی ملازمتش بہ روش گزیدہ و ایں  
معنی پسندیدہ ہم داد۔ اعتبار خاکسار یہاں سے سن افزود و عیار امیدوار یہاں سے سن کال برآمد پارہ از قصیدہ  
بر خواندم۔ مخطوط شد۔ و جو بہا کرد و وعدہ یاری گیری داد۔

غالب نے اسٹرلنگ کے قصیدہ میں اپنے متعلق جو کچھ لکھا تھا وہ انہی کی زبان سے سن لیجئے:-

من شکستہ دل بے تو ایچ ہلاں چگونہ دم زدم از دعویٰ ثنا خوانی  
گدا یم و بہ تمنائے داد آئندہ ام بہ در گئے کہ قصیدہ سرشن بر بانی  
ز نالہ ام چہ بجا کہ معدلت کیشی ز گد یہ ام چہ خجالت کہ از گریہ بانی  
نہ ملکات ہم وئے مال ایں قدر خواہم کہ گردن ز رخ بخت غم بغیشانی

۱۷ ڈکٹری آف انڈین باؤگرافی صفحہ ۴۸۳ علیات نثر فارسی صفحہ ۱۶۷۔

مرا لیست زور و شکر کی لبس نہ  
 نہ آرزوئے امیری نہ حسرتِ حانی  
 ز بہت سال فزونی شود کہ سنو  
 نفس چو شستہ شمع ہم بہ بزم حیرانی  
 کجاست جیب کہ چاکے درد تو غم  
 مگر جگر بہ دریدن و ہنم غم  
 نہال دہر دریں روزگار بے روی  
 یہ عید عشرت خوشیم منودہ قربانی  
 سیاہست نہ دار و زکس مجاہد  
 شمرہ بہ پیرن جاں فشاند جا نگشت  
 چناں چلقہ دام کشید تگ کہ سن  
 بہ بند عجز سر و ماندن از پر نشانی  
 غریب نیست بہ درد و دم رسیدن  
 نہ مدعی عربی و نہ من خراسانی  
 بہ داد گاہ رسیدم چنانکہ دستم  
 برس بہ داد و غریباں چنانکہ دانی

کونسل کا طریق کار | اس زمانے میں عام طریقہ یہ تھا کہ جب دو تین مقدمے کونسل میں پیش ہونے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ تو اسٹنٹ سکریٹری صاحب داد و خواہوں کے نام اور حالات مقدمات چیف سکریٹری صاحب کے روبرو پیش کر دیتے تھے چیف صاحب ہر مقدمے کے حالات ملاحظہ کرتے۔ ان پر غور فرماتے جن مقدمات کو کونسل میں پیش کرنے کے قابل سمجھتے رکھ لیتے بقیہ مقدمات کو واپس کر دیتے۔ غالب یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

بارے یہ ہوں شاید نام نہاد و نامورین پذیرفتنی وہ کونسل گذشتہ بنجیدہ شد تا دران بجن چہ پوئے

وہد فرمان فرامداں در بارہ من چہ باشد۔

دہلی میں مقدمہ پیش کرنے کا حکم | عرضداشت کونسل میں پیش ہوئی تو اس پر حکم صادر ہوا کہ ضابطہ کے مطابق یہ معاملہ سب سے پہلے دہلی کے ڈیزڈنٹ کے پاس پیش ہونا چاہئے۔ غالب نے عذر پیش کیا کہ میرے پاس اتنا سا ذوسامان اور تاج تو ان نہیں کہ کلکتہ سے دہلی جاؤں اور وہاں سے دوبارہ چارہ خواہی کے لئے کلکتہ آؤں اس پر کونسل نے حکم دیا کہ خود یہاں انتظار کرو اور کیل کے ذریعہ

لے کلیات شرفی صفحہ ۱۶۸۔

دہلی میں مقدمہ پیش کرادو۔ غالب لکھتے ہیں :-

عصداٹ بہ کونسل گزشتہ۔ و فرمان صادر گشت کہ ضابطہ مقتضی آنہ است کہ غنیمت زعفریہ عظم بہرہ  
ریزیڈنٹ دہلی رسیدہ آئیکہ غنیمت کہ سرور برگ قصاب دتوں معادو غنیمت فرمان یافتہ کہ خود ایں معاد باشد و کائنات  
بر ریڈنسی دہلی گراہیہ۔

اس پر غالب نے کلکتہ سے اپنے ایک دوست کو لکھا۔ ایک فیل کے ذریعہ سے دہلی  
ریزیڈنسی میں مقدمہ پیش کرایا۔ اور تمام ضروری کاغذات اپنے وکیل کے پاس دہلی بھیج دیئے۔  
یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دہلی میں کس شخص نے وکالت کی اور کون سے دوست نے یہ کام اپنے فتنے  
لیا۔ رائے جھیل کے نام کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو وکیل کرنے کے خواہاں تھے۔ ایک خط  
سے پتہ چلتا ہے کہ لالہ ہیر لال ان کے وکیل تھے۔

پیش این توین | مقدمہ تیار ہو چکا تھا لیکن ابھی پیش نہیں ہوا تھا کہ ایڈورڈ کول بروک ریزیڈنٹ دہلی ورنہ  
پر روانہ ہو گئے اس وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ غالب لکھتے ہیں :-

کاغذ فرستادہ من رسیدہ است کار فرما آن را پذیرفت۔ وکالت مار کوئل دا و ہنوز وکالتش از قوتہ  
بفضل نیامدہ یود کہ روشن الدہ کہ سر ایڈورڈ کول بروک فرمانروائے دہلی پہنچا و دورہ بان نہضت کشاد  
ہر آئینہ انتظار بار گذر پیش پیش این و لگ کہ بے خواست و میان آمد بکائنات خویش است۔

ادھر کلکتہ میں ولیم ہلی رکن عظم کونسل برما چلے گئے۔ لارڈ ٹینک گورنر جنرل شکار کے لئے  
مالدہ روانہ ہو گئے۔ مولوی عبدالکریم صاحب میرنشی دفتر فارسی نے آٹھ ماہ کی خدمت لے لی اور وہ  
اپنے وطن لکھنؤ چلے گئے۔

انگریز کونسل کی سفارش | غالب نے ایک فوجی افسر کرنل ہنری اٹاک۔ سے سر ایڈورڈ کول بروک کے مالدار ایک  
سفارشی خط لکھوا دیا تھا۔ نیز نواب اکبر علی خاں ستولی امام باڑہ ہو چکی بندر سے ایک سفارشی خط پیش  
اتفاقت حسین خاں کے لئے حاصل کیا تھا۔ جو غالباً ریزیڈنسی کے میرنشی تھے۔ یہ خط لالہ ہیر لال

لکھنات شرفا سی ہفتہ ۱۶۸۷ ۱۶۹۰ ۱۶۹۱ ۱۶۹۲ ۱۶۹۳ ۱۶۹۴ ۱۶۹۵ ۱۶۹۶ ۱۶۹۷ ۱۶۹۸ ۱۶۹۹ ۱۷۰۰ ۱۷۰۱ ۱۷۰۲ ۱۷۰۳ ۱۷۰۴ ۱۷۰۵ ۱۷۰۶ ۱۷۰۷ ۱۷۰۸ ۱۷۰۹ ۱۷۱۰ ۱۷۱۱ ۱۷۱۲ ۱۷۱۳ ۱۷۱۴ ۱۷۱۵ ۱۷۱۶ ۱۷۱۷ ۱۷۱۸ ۱۷۱۹ ۱۷۲۰ ۱۷۲۱ ۱۷۲۲ ۱۷۲۳ ۱۷۲۴ ۱۷۲۵ ۱۷۲۶ ۱۷۲۷ ۱۷۲۸ ۱۷۲۹ ۱۷۳۰ ۱۷۳۱ ۱۷۳۲ ۱۷۳۳ ۱۷۳۴ ۱۷۳۵ ۱۷۳۶ ۱۷۳۷ ۱۷۳۸ ۱۷۳۹ ۱۷۴۰ ۱۷۴۱ ۱۷۴۲ ۱۷۴۳ ۱۷۴۴ ۱۷۴۵ ۱۷۴۶ ۱۷۴۷ ۱۷۴۸ ۱۷۴۹ ۱۷۵۰ ۱۷۵۱ ۱۷۵۲ ۱۷۵۳ ۱۷۵۴ ۱۷۵۵ ۱۷۵۶ ۱۷۵۷ ۱۷۵۸ ۱۷۵۹ ۱۷۶۰ ۱۷۶۱ ۱۷۶۲ ۱۷۶۳ ۱۷۶۴ ۱۷۶۵ ۱۷۶۶ ۱۷۶۷ ۱۷۶۸ ۱۷۶۹ ۱۷۷۰ ۱۷۷۱ ۱۷۷۲ ۱۷۷۳ ۱۷۷۴ ۱۷۷۵ ۱۷۷۶ ۱۷۷۷ ۱۷۷۸ ۱۷۷۹ ۱۷۸۰ ۱۷۸۱ ۱۷۸۲ ۱۷۸۳ ۱۷۸۴ ۱۷۸۵ ۱۷۸۶ ۱۷۸۷ ۱۷۸۸ ۱۷۸۹ ۱۷۹۰ ۱۷۹۱ ۱۷۹۲ ۱۷۹۳ ۱۷۹۴ ۱۷۹۵ ۱۷۹۶ ۱۷۹۷ ۱۷۹۸ ۱۷۹۹ ۱۸۰۰ ۱۸۰۱ ۱۸۰۲ ۱۸۰۳ ۱۸۰۴ ۱۸۰۵ ۱۸۰۶ ۱۸۰۷ ۱۸۰۸ ۱۸۰۹ ۱۸۱۰ ۱۸۱۱ ۱۸۱۲ ۱۸۱۳ ۱۸۱۴ ۱۸۱۵ ۱۸۱۶ ۱۸۱۷ ۱۸۱۸ ۱۸۱۹ ۱۸۲۰ ۱۸۲۱ ۱۸۲۲ ۱۸۲۳ ۱۸۲۴ ۱۸۲۵ ۱۸۲۶ ۱۸۲۷ ۱۸۲۸ ۱۸۲۹ ۱۸۳۰ ۱۸۳۱ ۱۸۳۲ ۱۸۳۳ ۱۸۳۴ ۱۸۳۵ ۱۸۳۶ ۱۸۳۷ ۱۸۳۸ ۱۸۳۹ ۱۸۴۰ ۱۸۴۱ ۱۸۴۲ ۱۸۴۳ ۱۸۴۴ ۱۸۴۵ ۱۸۴۶ ۱۸۴۷ ۱۸۴۸ ۱۸۴۹ ۱۸۵۰ ۱۸۵۱ ۱۸۵۲ ۱۸۵۳ ۱۸۵۴ ۱۸۵۵ ۱۸۵۶ ۱۸۵۷ ۱۸۵۸ ۱۸۵۹ ۱۸۶۰ ۱۸۶۱ ۱۸۶۲ ۱۸۶۳ ۱۸۶۴ ۱۸۶۵ ۱۸۶۶ ۱۸۶۷ ۱۸۶۸ ۱۸۶۹ ۱۸۷۰ ۱۸۷۱ ۱۸۷۲ ۱۸۷۳ ۱۸۷۴ ۱۸۷۵ ۱۸۷۶ ۱۸۷۷ ۱۸۷۸ ۱۸۷۹ ۱۸۸۰ ۱۸۸۱ ۱۸۸۲ ۱۸۸۳ ۱۸۸۴ ۱۸۸۵ ۱۸۸۶ ۱۸۸۷ ۱۸۸۸ ۱۸۸۹ ۱۸۹۰ ۱۸۹۱ ۱۸۹۲ ۱۸۹۳ ۱۸۹۴ ۱۸۹۵ ۱۸۹۶ ۱۸۹۷ ۱۸۹۸ ۱۸۹۹ ۱۹۰۰ ۱۹۰۱ ۱۹۰۲ ۱۹۰۳ ۱۹۰۴ ۱۹۰۵ ۱۹۰۶ ۱۹۰۷ ۱۹۰۸ ۱۹۰۹ ۱۹۱۰ ۱۹۱۱ ۱۹۱۲ ۱۹۱۳ ۱۹۱۴ ۱۹۱۵ ۱۹۱۶ ۱۹۱۷ ۱۹۱۸ ۱۹۱۹ ۱۹۲۰ ۱۹۲۱ ۱۹۲۲ ۱۹۲۳ ۱۹۲۴ ۱۹۲۵ ۱۹۲۶ ۱۹۲۷ ۱۹۲۸ ۱۹۲۹ ۱۹۳۰ ۱۹۳۱ ۱۹۳۲ ۱۹۳۳ ۱۹۳۴ ۱۹۳۵ ۱۹۳۶ ۱۹۳۷ ۱۹۳۸ ۱۹۳۹ ۱۹۴۰ ۱۹۴۱ ۱۹۴۲ ۱۹۴۳ ۱۹۴۴ ۱۹۴۵ ۱۹۴۶ ۱۹۴۷ ۱۹۴۸ ۱۹۴۹ ۱۹۵۰ ۱۹۵۱ ۱۹۵۲ ۱۹۵۳ ۱۹۵۴ ۱۹۵۵ ۱۹۵۶ ۱۹۵۷ ۱۹۵۸ ۱۹۵۹ ۱۹۶۰ ۱۹۶۱ ۱۹۶۲ ۱۹۶۳ ۱۹۶۴ ۱۹۶۵ ۱۹۶۶ ۱۹۶۷ ۱۹۶۸ ۱۹۶۹ ۱۹۷۰ ۱۹۷۱ ۱۹۷۲ ۱۹۷۳ ۱۹۷۴ ۱۹۷۵ ۱۹۷۶ ۱۹۷۷ ۱۹۷۸ ۱۹۷۹ ۱۹۸۰ ۱۹۸۱ ۱۹۸۲ ۱۹۸۳ ۱۹۸۴ ۱۹۸۵ ۱۹۸۶ ۱۹۸۷ ۱۹۸۸ ۱۹۸۹ ۱۹۹۰ ۱۹۹۱ ۱۹۹۲ ۱۹۹۳ ۱۹۹۴ ۱۹۹۵ ۱۹۹۶ ۱۹۹۷ ۱۹۹۸ ۱۹۹۹ ۲۰۰۰ ۲۰۰۱ ۲۰۰۲ ۲۰۰۳ ۲۰۰۴ ۲۰۰۵ ۲۰۰۶ ۲۰۰۷ ۲۰۰۸ ۲۰۰۹ ۲۰۱۰ ۲۰۱۱ ۲۰۱۲ ۲۰۱۳ ۲۰۱۴ ۲۰۱۵ ۲۰۱۶ ۲۰۱۷ ۲۰۱۸ ۲۰۱۹ ۲۰۲۰ ۲۰۲۱ ۲۰۲۲ ۲۰۲۳ ۲۰۲۴ ۲۰۲۵ ۲۰۲۶ ۲۰۲۷ ۲۰۲۸ ۲۰۲۹ ۲۰۳۰ ۲۰۳۱ ۲۰۳۲ ۲۰۳۳ ۲۰۳۴ ۲۰۳۵ ۲۰۳۶ ۲۰۳۷ ۲۰۳۸ ۲۰۳۹ ۲۰۴۰ ۲۰۴۱ ۲۰۴۲ ۲۰۴۳ ۲۰۴۴ ۲۰۴۵ ۲۰۴۶ ۲۰۴۷ ۲۰۴۸ ۲۰۴۹ ۲۰۵۰ ۲۰۵۱ ۲۰۵۲ ۲۰۵۳ ۲۰۵۴ ۲۰۵۵ ۲۰۵۶ ۲۰۵۷ ۲۰۵۸ ۲۰۵۹ ۲۰۶۰ ۲۰۶۱ ۲۰۶۲ ۲۰۶۳ ۲۰۶۴ ۲۰۶۵ ۲۰۶۶ ۲۰۶۷ ۲۰۶۸ ۲۰۶۹ ۲۰۷۰ ۲۰۷۱ ۲۰۷۲ ۲۰۷۳ ۲۰۷۴ ۲۰۷۵ ۲۰۷۶ ۲۰۷۷ ۲۰۷۸ ۲۰۷۹ ۲۰۸۰ ۲۰۸۱ ۲۰۸۲ ۲۰۸۳ ۲۰۸۴ ۲۰۸۵ ۲۰۸۶ ۲۰۸۷ ۲۰۸۸ ۲۰۸۹ ۲۰۹۰ ۲۰۹۱ ۲۰۹۲ ۲۰۹۳ ۲۰۹۴ ۲۰۹۵ ۲۰۹۶ ۲۰۹۷ ۲۰۹۸ ۲۰۹۹ ۲۱۰۰ ۲۱۰۱ ۲۱۰۲ ۲۱۰۳ ۲۱۰۴ ۲۱۰۵ ۲۱۰۶ ۲۱۰۷ ۲۱۰۸ ۲۱۰۹ ۲۱۱۰ ۲۱۱۱ ۲۱۱۲ ۲۱۱۳ ۲۱۱۴ ۲۱۱۵ ۲۱۱۶ ۲۱۱۷ ۲۱۱۸ ۲۱۱۹ ۲۱۲۰ ۲۱۲۱ ۲۱۲۲ ۲۱۲۳ ۲۱۲۴ ۲۱۲۵ ۲۱۲۶ ۲۱۲۷ ۲۱۲۸ ۲۱۲۹ ۲۱۳۰ ۲۱۳۱ ۲۱۳۲ ۲۱۳۳ ۲۱۳۴ ۲۱۳۵ ۲۱۳۶ ۲۱۳۷ ۲۱۳۸ ۲۱۳۹ ۲۱۴۰ ۲۱۴۱ ۲۱۴۲ ۲۱۴۳ ۲۱۴۴ ۲۱۴۵ ۲۱۴۶ ۲۱۴۷ ۲۱۴۸ ۲۱۴۹ ۲۱۵۰ ۲۱۵۱ ۲۱۵۲ ۲۱۵۳ ۲۱۵۴ ۲۱۵۵ ۲۱۵۶ ۲۱۵۷ ۲۱۵۸ ۲۱۵۹ ۲۱۶۰ ۲۱۶۱ ۲۱۶۲ ۲۱۶۳ ۲۱۶۴ ۲۱۶۵ ۲۱۶۶ ۲۱۶۷ ۲۱۶۸ ۲۱۶۹ ۲۱۷۰ ۲۱۷۱ ۲۱۷۲ ۲۱۷۳ ۲۱۷۴ ۲۱۷۵ ۲۱۷۶ ۲۱۷۷ ۲۱۷۸ ۲۱۷۹ ۲۱۸۰ ۲۱۸۱ ۲۱۸۲ ۲۱۸۳ ۲۱۸۴ ۲۱۸۵ ۲۱۸۶ ۲۱۸۷ ۲۱۸۸ ۲۱۸۹ ۲۱۹۰ ۲۱۹۱ ۲۱۹۲ ۲۱۹۳ ۲۱۹۴ ۲۱۹۵ ۲۱۹۶ ۲۱۹۷ ۲۱۹۸ ۲۱۹۹ ۲۲۰۰ ۲۲۰۱ ۲۲۰۲ ۲۲۰۳ ۲۲۰۴ ۲۲۰۵ ۲۲۰۶ ۲۲۰۷ ۲۲۰۸ ۲۲۰۹ ۲۲۱۰ ۲۲۱۱ ۲۲۱۲ ۲۲۱۳ ۲۲۱۴ ۲۲۱۵ ۲۲۱۶ ۲۲۱۷ ۲۲۱۸ ۲۲۱۹ ۲۲۲۰ ۲۲۲۱ ۲۲۲۲ ۲۲۲۳ ۲۲۲۴ ۲۲۲۵ ۲۲۲۶ ۲۲۲۷ ۲۲۲۸ ۲۲۲۹ ۲۲۳۰ ۲۲۳۱ ۲۲۳۲ ۲۲۳۳ ۲۲۳۴ ۲۲۳۵ ۲۲۳۶ ۲۲۳۷ ۲۲۳۸ ۲۲۳۹ ۲۲۴۰ ۲۲۴۱ ۲۲۴۲ ۲۲۴۳ ۲۲۴۴ ۲۲۴۵ ۲۲۴۶ ۲۲۴۷ ۲۲۴۸ ۲۲۴۹ ۲۲۵۰ ۲۲۵۱ ۲۲۵۲ ۲۲۵۳ ۲۲۵۴ ۲۲۵۵ ۲۲۵۶ ۲۲۵۷ ۲۲۵۸ ۲۲۵۹ ۲۲۶۰ ۲۲۶۱ ۲۲۶۲ ۲۲۶۳ ۲۲۶۴ ۲۲۶۵ ۲۲۶۶ ۲۲۶۷ ۲۲۶۸ ۲۲۶۹ ۲۲۷۰ ۲۲۷۱ ۲۲۷۲ ۲۲۷۳ ۲۲۷۴ ۲۲۷۵ ۲۲۷۶ ۲۲۷۷ ۲۲۷۸ ۲۲۷۹ ۲۲۸۰ ۲۲۸۱ ۲۲۸۲ ۲۲۸۳ ۲۲۸۴ ۲۲۸۵ ۲۲۸۶ ۲۲۸۷ ۲۲۸۸ ۲۲۸۹ ۲۲۹۰ ۲۲۹۱ ۲۲۹۲ ۲۲۹۳ ۲۲۹۴ ۲۲۹۵ ۲۲۹۶ ۲۲۹۷ ۲۲۹۸ ۲۲۹۹ ۲۳۰۰ ۲۳۰۱ ۲۳۰۲ ۲۳۰۳ ۲۳۰۴ ۲۳۰۵ ۲۳۰۶ ۲۳۰۷ ۲۳۰۸ ۲۳۰۹ ۲۳۱۰ ۲۳۱۱ ۲۳۱۲ ۲۳۱۳ ۲۳۱۴ ۲۳۱۵ ۲۳۱۶ ۲۳۱۷ ۲۳۱۸ ۲۳۱۹ ۲۳۲۰ ۲۳۲۱ ۲۳۲۲ ۲۳۲۳ ۲۳۲۴ ۲۳۲۵ ۲۳۲۶ ۲۳۲۷ ۲۳۲۸ ۲۳۲۹ ۲۳۳۰ ۲۳۳۱ ۲۳۳۲ ۲۳۳۳ ۲۳۳۴ ۲۳۳۵ ۲۳۳۶ ۲۳۳۷ ۲۳۳۸ ۲۳۳۹ ۲۳۴۰ ۲۳۴۱ ۲۳۴۲ ۲۳۴۳ ۲۳۴۴ ۲۳۴۵ ۲۳۴۶ ۲۳۴۷ ۲۳۴۸ ۲۳۴۹ ۲۳۵۰ ۲۳۵۱ ۲۳۵۲ ۲۳۵۳ ۲۳۵۴ ۲۳۵۵ ۲۳۵۶ ۲۳۵۷ ۲۳۵۸ ۲۳۵۹ ۲۳۶۰ ۲۳۶۱ ۲۳۶۲ ۲۳۶۳ ۲۳۶۴ ۲۳۶۵ ۲۳۶۶ ۲۳۶۷ ۲۳۶۸ ۲۳۶۹ ۲۳۷۰ ۲۳۷۱ ۲۳۷۲ ۲۳۷۳ ۲۳۷۴ ۲۳۷۵ ۲۳۷۶ ۲۳۷۷ ۲۳۷۸ ۲۳۷۹ ۲۳۸۰ ۲۳۸۱ ۲۳۸۲ ۲۳۸۳ ۲۳۸۴ ۲۳۸۵ ۲۳۸۶ ۲۳۸۷ ۲۳۸۸ ۲۳۸۹ ۲۳۹۰ ۲۳۹۱ ۲۳۹۲ ۲۳۹۳ ۲۳۹۴ ۲۳۹۵ ۲۳۹۶ ۲۳۹۷ ۲۳۹۸ ۲۳۹۹ ۲۴۰۰ ۲۴۰۱ ۲۴۰۲ ۲۴۰۳ ۲۴۰۴ ۲۴۰۵ ۲۴۰۶ ۲۴۰۷ ۲۴۰۸ ۲۴۰۹ ۲۴۱۰ ۲۴۱۱ ۲۴۱۲ ۲۴۱۳ ۲۴۱۴ ۲۴۱۵ ۲۴۱۶ ۲۴۱۷ ۲۴۱۸ ۲۴۱۹ ۲۴۲۰ ۲۴۲۱ ۲۴۲۲ ۲۴۲۳ ۲۴۲۴ ۲۴۲۵ ۲۴۲۶ ۲۴۲۷ ۲۴۲۸ ۲۴۲۹ ۲۴۳۰ ۲۴۳۱ ۲۴۳۲ ۲۴۳۳ ۲۴۳۴ ۲۴۳۵ ۲۴۳۶ ۲۴۳۷ ۲۴۳۸ ۲۴۳۹ ۲۴۴۰ ۲۴۴۱ ۲۴۴۲ ۲۴۴۳ ۲۴۴۴ ۲۴۴۵ ۲۴۴۶ ۲۴۴۷ ۲۴۴۸ ۲۴۴۹ ۲۴۵۰ ۲۴۵۱ ۲۴۵۲ ۲۴۵۳ ۲۴۵۴ ۲۴۵۵ ۲۴۵۶ ۲۴۵۷ ۲۴۵۸ ۲۴۵۹ ۲۴۶۰ ۲۴۶۱ ۲۴۶۲ ۲۴۶۳ ۲۴۶۴ ۲۴۶۵ ۲۴۶۶ ۲۴۶۷ ۲۴۶۸ ۲۴۶۹ ۲۴۷۰ ۲۴۷۱ ۲۴۷۲ ۲۴۷۳ ۲۴۷۴ ۲۴۷۵ ۲۴۷۶ ۲۴۷۷ ۲۴۷۸ ۲۴۷۹ ۲۴۸۰ ۲۴۸۱ ۲۴۸۲ ۲۴۸۳ ۲۴۸۴ ۲۴۸۵ ۲۴۸۶ ۲۴۸۷ ۲۴۸۸ ۲۴۸۹ ۲۴۹۰ ۲۴۹۱ ۲۴۹۲ ۲۴۹۳ ۲۴۹۴ ۲۴۹۵ ۲۴۹۶ ۲۴۹۷ ۲۴۹۸ ۲۴۹۹ ۲۵۰۰ ۲۵۰۱ ۲۵۰۲ ۲۵۰۳ ۲۵۰۴ ۲۵۰۵ ۲۵۰۶ ۲۵۰۷ ۲۵۰۸ ۲۵۰۹ ۲۵۱۰ ۲۵۱۱ ۲۵۱۲ ۲۵۱۳ ۲۵۱۴ ۲۵۱۵ ۲۵۱۶ ۲۵۱۷ ۲۵۱۸ ۲۵۱۹ ۲۵۲۰ ۲۵۲۱ ۲۵۲۲ ۲۵۲۳ ۲۵۲۴ ۲۵۲۵ ۲۵۲۶ ۲۵۲۷ ۲۵۲۸ ۲۵۲۹ ۲۵۳۰ ۲۵۳۱ ۲۵۳۲ ۲۵۳۳ ۲۵۳۴ ۲۵۳۵ ۲۵۳۶ ۲۵۳۷ ۲۵۳۸ ۲۵۳۹ ۲۵۴۰ ۲۵۴۱ ۲۵۴۲ ۲۵۴۳ ۲۵۴۴ ۲۵۴۵ ۲۵۴۶ ۲۵۴۷ ۲۵۴۸ ۲۵۴۹ ۲۵۵۰ ۲۵۵۱ ۲۵۵۲ ۲۵۵۳ ۲۵۵۴ ۲۵۵۵ ۲۵۵۶ ۲۵۵۷ ۲۵۵۸ ۲۵۵۹ ۲۵۶۰ ۲۵۶۱ ۲۵۶۲ ۲۵۶۳ ۲۵۶۴ ۲۵۶۵ ۲۵۶۶ ۲۵۶۷ ۲۵۶۸ ۲۵۶۹ ۲۵۷۰ ۲۵۷۱ ۲۵۷۲ ۲۵۷۳ ۲۵۷۴ ۲۵۷۵ ۲۵۷۶ ۲۵۷۷ ۲۵۷۸ ۲۵۷۹ ۲۵۸۰ ۲۵۸۱ ۲۵۸۲ ۲۵۸۳ ۲۵۸۴ ۲۵۸۵ ۲۵۸۶ ۲۵۸۷ ۲۵۸۸ ۲۵۸۹ ۲۵۹۰ ۲۵۹۱ ۲۵۹۲ ۲۵۹۳ ۲۵۹۴ ۲۵۹۵ ۲۵۹۶ ۲۵۹۷ ۲۵۹۸ ۲۵۹۹ ۲۶۰۰ ۲۶۰۱ ۲۶۰۲ ۲۶۰۳ ۲۶۰۴ ۲۶۰۵ ۲۶۰۶ ۲۶۰۷ ۲۶۰۸ ۲۶۰۹ ۲۶۱۰ ۲۶۱۱ ۲۶۱۲ ۲۶۱۳ ۲۶۱۴ ۲۶۱۵ ۲۶۱۶ ۲۶۱۷ ۲۶۱۸ ۲۶۱۹ ۲۶۲۰ ۲۶۲۱ ۲۶۲۲ ۲۶۲۳ ۲۶۲۴ ۲۶۲۵ ۲۶۲۶ ۲۶۲۷ ۲۶۲۸ ۲۶۲۹ ۲۶۳۰ ۲۶۳۱ ۲۶۳۲ ۲۶۳۳ ۲۶۳۴ ۲۶۳۵ ۲۶۳۶ ۲۶۳۷ ۲۶۳۸ ۲۶۳۹ ۲۶۴۰ ۲۶۴۱ ۲۶۴۲ ۲۶۴۳ ۲۶۴۴ ۲۶۴۵ ۲۶۴۶ ۲۶۴۷ ۲۶۴۸ ۲۶۴۹ ۲۶۵۰ ۲۶۵۱ ۲۶۵۲ ۲۶۵۳ ۲۶۵۴ ۲۶۵۵ ۲۶۵۶ ۲۶۵۷ ۲۶۵۸ ۲۶۵۹ ۲۶۶۰ ۲۶۶۱ ۲۶۶۲ ۲۶۶۳ ۲۶۶۴ ۲۶۶۵ ۲۶۶۶ ۲۶۶۷ ۲۶۶۸ ۲۶۶۹ ۲۶۷۰ ۲۶۷۱ ۲۶۷۲ ۲۶۷۳ ۲۶۷۴ ۲۶۷۵ ۲۶۷۶ ۲۶۷۷ ۲۶۷۸ ۲۶۷۹ ۲۶۸۰ ۲۶۸۱ ۲۶۸۲ ۲۶۸۳ ۲۶۸۴ ۲۶۸۵ ۲۶۸۶ ۲۶۸۷ ۲۶۸۸ ۲۶۸۹ ۲۶۹۰ ۲۶۹۱ ۲۶۹۲ ۲۶۹۳ ۲۶۹۴ ۲۶۹۵ ۲۶۹۶ ۲۶۹۷ ۲۶۹۸ ۲۶۹۹ ۲۷۰۰ ۲۷۰۱ ۲۷۰۲ ۲۷۰۳ ۲۷۰۴ ۲۷۰۵ ۲۷۰۶ ۲۷۰۷ ۲۷۰۸ ۲۷۰۹ ۲۷۱۰ ۲۷۱۱ ۲۷۱۲ ۲۷۱۳ ۲۷۱۴ ۲۷۱۵ ۲۷۱۶ ۲۷۱۷ ۲۷۱۸ ۲۷۱۹ ۲۷۲۰ ۲۷۲۱ ۲۷۲۲ ۲۷۲۳ ۲۷۲۴ ۲۷۲۵ ۲۷۲۶ ۲۷۲۷ ۲۷۲۸ ۲۷۲۹ ۲۷۳۰ ۲۷۳۱ ۲۷۳۲ ۲۷۳۳ ۲۷۳۴ ۲۷۳۵ ۲۷۳۶ ۲۷۳۷ ۲۷۳۸ ۲۷۳۹ ۲۷۴۰ ۲۷۴۱ ۲۷۴۲ ۲۷۴۳ ۲۷۴۴ ۲۷۴۵ ۲۷۴۶ ۲۷۴۷ ۲۷۴۸ ۲۷۴۹ ۲۷۵۰ ۲۷۵۱ ۲۷۵۲ ۲۷۵۳ ۲۷۵۴ ۲۷۵۵ ۲۷۵۶ ۲۷۵۷ ۲۷۵۸ ۲۷۵۹ ۲۷۶۰ ۲۷۶۱ ۲۷۶۲ ۲۷۶۳ ۲۷۶۴ ۲۷۶۵ ۲۷۶۶ ۲۷۶۷ ۲۷۶۸ ۲۷۶۹ ۲۷۷۰ ۲۷۷۱ ۲۷۷۲ ۲۷۷۳ ۲۷۷۴ ۲۷۷۵ ۲۷۷۶ ۲۷۷۷ ۲۷۷۸ ۲۷۷۹ ۲۷۸۰ ۲۷۸۱ ۲۷۸۲ ۲۷۸۳ ۲۷۸۴ ۲۷۸۵ ۲۷۸۶ ۲۷۸۷ ۲۷۸۸ ۲۷۸۹ ۲۷۹۰ ۲۷۹۱ ۲۷۹۲ ۲۷۹۳ ۲۷۹۴ ۲۷۹۵ ۲۷۹۶ ۲۷۹۷ ۲۷۹۸ ۲۷۹۹ ۲۸۰۰ ۲۸۰۱ ۲۸۰۲ ۲۸۰۳ ۲۸۰۴ ۲۸۰۵ ۲۸۰۶ ۲۸۰۷ ۲۸۰۸ ۲۸۰۹ ۲۸۱۰ ۲۸۱۱ ۲۸۱۲ ۲۸۱۳ ۲۸۱۴ ۲۸۱۵ ۲۸۱۶ ۲۸۱۷ ۲۸۱۸ ۲۸۱۹ ۲۸۲۰ ۲۸۲۱ ۲۸۲۲ ۲۸۲۳ ۲۸۲۴ ۲۸۲۵ ۲۸۲۶ ۲۸۲۷ ۲۸۲۸ ۲۸۲۹ ۲۸۳۰ ۲۸۳۱ ۲۸۳۲ ۲۸۳۳ ۲۸۳۴ ۲۸۳۵ ۲۸۳۶ ۲۸۳۷ ۲۸۳۸ ۲۸۳۹ ۲۸۴۰ ۲۸۴۱ ۲۸۴۲ ۲۸۴۳ ۲۸۴۴ ۲۸۴۵ ۲۸۴۶ ۲۸۴۷ ۲۸۴۸ ۲۸۴۹ ۲۸۵۰ ۲۸۵۱ ۲۸۵۲ ۲۸۵۳ ۲۸۵۴ ۲۸۵۵ ۲۸۵۶ ۲۸۵۷ ۲۸۵۸ ۲۸۵۹ ۲۸۶۰ ۲۸۶۱ ۲۸۶۲ ۲۸۶۳ ۲۸۶۴ ۲۸۶۵ ۲۸۶۶ ۲۸۶۷ ۲۸۶۸ ۲۸۶۹ ۲۸۷۰ ۲۸۷۱ ۲۸۷۲ ۲۸۷۳ ۲۸۷۴ ۲۸۷۵ ۲۸۷۶ ۲۸۷۷ ۲۸۷۸ ۲۸۷۹ ۲۸۸۰ ۲۸۸۱ ۲۸۸۲ ۲۸۸۳ ۲۸۸۴ ۲۸۸۵ ۲۸۸۶ ۲۸۸۷ ۲۸۸۸ ۲۸۸۹ ۲۸۹۰ ۲۸۹۱ ۲۸۹۲ ۲۸۹۳ ۲۸۹۴ ۲۸۹۵ ۲۸۹۶ ۲۸۹۷ ۲۸۹۸ ۲۸۹۹ ۲۹۰۰ ۲۹۰۱ ۲۹۰۲ ۲۹۰۳ ۲۹۰۴ ۲۹۰۵ ۲۹۰۶ ۲۹۰۷ ۲۹۰۸ ۲۹۰۹ ۲۹۱۰ ۲۹۱۱ ۲۹۱۲ ۲۹۱۳ ۲۹۱۴ ۲۹۱۵ ۲۹۱۶ ۲۹۱۷ ۲۹۱۸ ۲۹۱۹ ۲۹۲۰ ۲۹۲۱ ۲۹۲۲ ۲۹۲۳ ۲۹۲۴ ۲۹۲۵ ۲۹۲۶ ۲۹۲۷ ۲۹۲۸ ۲۹۲۹ ۲۹۳۰ ۲۹۳۱ ۲۹۳۲ ۲۹۳۳ ۲۹۳۴ ۲۹۳۵ ۲۹۳۶ ۲۹۳۷ ۲۹۳۸ ۲۹۳۹ ۲۹۴۰ ۲۹۴۱ ۲۹۴۲ ۲۹۴۳ ۲۹۴۴ ۲۹۴۵ ۲۹۴۶ ۲۹۴۷ ۲۹۴۸ ۲۹۴۹ ۲۹



دکیل کو بھجوا دیا تھا علی بخش خاں رنجور کو یہ تمام حالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :-

وقت است کہ رپورٹ مقدمہ من از محکمہ سیدنسی دہلی بال روحانی کشا پید لاجرم شام باید بہ  
نشی التفات حسین سرشتہ گفتگو و اکرون - درنگ آن رنجین کہ تقریباً ذکر سفارش نامہ کنیل مہتری کہ  
ہمارہ در بیان آمدند تا گل مدعا شادمانی پذیرد و اورا در ش من بطف و فیہ عاکم تانہ گردد۔

معلوم ہوتا ہے کہ کنیل مہتری الماک کی سفارش پر سرٹڈ و روڈ کول بروک نے اچھی رپورٹ اوپر  
بھیجی تھی اور وہاں سے اچھا جواب حاصل کر لیا تھا لیکن جواب ابھی دہلی پہنچا نہیں تھا کہ صاحب صوف  
دفتر ریڈنسی سے ملحقہ ہوتے اور ان کی جگہ فرانس ہکنس ریڈنٹ مقرر ہو گئے جن کے ساتھ  
دلی فیروز پور جھکے بہت گہرے تعلقات پیدا کر لئے تھے۔ انہوں نے از سر نو خالص کے خلاف  
رپورٹ لکھی تھی۔ غالب فرماتے ہیں :-

کول بروک بہ توسط کنیل مہتری الماک برین مہمان شود و رپورٹے کہ خوشتر از ان نتوان اندیشید بہ  
صدر فرستد و جوابے کہ سودمند تر از ان نتوان سنجید از صدر حال نماید۔ ہنوز ان جواب در راہ باشد کہ  
کول بروک مغول گردد و ہکنس بجائے کول بروک نشیند آنچہ بہم زدوں ہنگامہ سلطنت را بس باشد  
از بہرین بہ صدر رسید۔

مزید سفارش کی سی کلکتہ کے ایک دوست میزرا ابوالقاسم خاں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کنیل مہتری  
سے فرانس ہکنس کے نام بھی سفارشی خطا حال کہیں گے لیکن کنیل مہتری الماک بیمار ہو گئے۔  
اور اسی بیماری میں وفات پا گئے۔

میزرا ابوالقاسم خاں وعدہ دادند کہ چون کنیل مہتری الماک را در جام رنجوری بریزد و سپا شہراماز  
وے بنام ہکنس صاحب بکف آزند و بہن رسانند ہم دیریں روزا یکے از شرکان فرنگ بہن  
گفت کہ کنیل مہتری الماک از جاں رفت و اسے بروز بخار من کو دیں دیا رہے فرمانوا سرنگ  
سے زخم و جاں بہ ناکامی سے وہم عود جاہ مند و الدار و من تہی دست و تنہا۔

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ فرانسس ہکنس کے ریزیدنٹ مقرر ہو کر غالب کے مقدمہ کے متعلق رپورٹ پیش کرنے تک غالب کلکتہ سے واپس آچکے تھے وہ کلکتہ میں کم و بیش دو برس ٹھہرے اس دوران میں چونکہ دہلی ریزیدنسی سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا اور ویسٹمنسٹنگ گورنر جنرل اس پر دہلی وغیرہ پر آنے والے تھے اس لئے غالب بھی وہاں سے چلے آئے تاکہ جلد سے جلد ریزیدنسی سے رپورٹ پیش کر کے گورنر جنرل کے دور سے ہی میں اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرالیں۔ ریزیدنٹ سے بے پروائی فرانسس ہکنس نے غالب کے خلاف رپورٹ لکھ دی تو ریزیدنسی کے دفتر میں جو لوگ غالب کے ہمدرد تھے اور رپورٹ کے راز سے آگاہ تھے۔ وہ ہر چند غالب سے کہتے رہے کہ ابھی وقت ہے کچھ چارہ کر لیجئے۔ ہکنس صاحب کیل کر اپنے حالات خود انہیں سنالیجے لیکن غالب کے دل میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ وہ مسٹر اینڈریو اسٹرنگ چیف سکرٹری سے مل چکے ہیں اور ان سے امداد و اعانت کا وعدہ لے چکے ہیں۔ اس لئے انہیں ریزیدنٹ کی مخالفت رپورٹ کی چنداں پروا نہ تھی وہ خود لکھتے ہیں:-

اگر بار امیدم را استواری تحریر یا یہ صدر بنو سے پیش دستان این عکس در ریزیدنسی (رخنہ در دنیا دورا)  
انگندہ بودند و حاکم ابرمن دگرگوں ساختہ۔

مسٹر اسٹرنگ کا انتقال لیکن سو اتفاق دیکھئے کہ ادھر ریزیدنسی میں غالب کے خلاف رپورٹ تیار ہوئی اور کلکتہ میں مسٹر اینڈریو اسٹرنگ کا انتقال ہو گیا اور غالب کی یہ امید گاہ بھی جاتی رہی۔ مسٹر اینڈریو اسٹرنگ کا انتقال ۲۳ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوا غالب لکھتے ہیں:-

فرماندہ این خراب آباد کہ فرانسس ہکنس بہادرش نامند با والی فیروز پور بیان یک دلی بست۔ در پور  
چنانکہ فرست بہ صدر فرشتا۔ ہر چند پروہ داران در پردہ بدم دادند و سختے از اس راز بہ من باز گفتند مرا  
دل از جانے نہ رفت گفتم اسٹرنگ حق پرست و حق شناس کسے ہست کہ سر شرتہ ہر کار بہ دست  
بچارہ گری خواہد ہست قضا بہن خندیدہ طبع آں انگندہ کر پیش از انکہ رپورٹ بہ صدر رسد امید گاہ  
جل فرو مید و چشم جان بنش فرو بستہ شد۔

پھر فرماتے ہیں :-

جیرتے دہشتم کہ بہ مرگ ناگاہ و درگزشن امیر و جان دولت و جوان سال یعنی مشراندر و اسٹرننگ  
ستودہ خصال برائے حییت۔ و کارپردازان قضا از بس ساختہ سرنگ کہ نام فخریہ منظور و ازندہ؛ حالیا حالی شد  
کہ بر سیلاب قنادا دن بنار آمد واری غالب رسیدہ بخت مے خواہند۔

ایک دو خط میں فرماتے ہیں :-

مشراندر و اسٹرننگ مرد و از گیتی جز نام نیکو باخو و نبرد..... اکنوں امید غوری اند کہ باید مہ دہ  
دول را بہ خیال گردش جنیم ترسکین باید مہ داد۔ پورے ٹے کہ فرانس ہاکس بہادر و رخصوس داد غوری  
من بہ صدر فرستادہ است چہ گویم کہ چہ مایہ امید گاہ و اندوہ فرا بردہ است نگیر بکار سازی اُس  
چاہک خرام بیدائے قنادا شتم اکنوں ارشش سونلک بہ کام دشمن است۔  
غالب نے اینڈریو اسٹرننگ کی وفات پر ایک قطعہ لکھا تھا جو ان کے فارسی کلیات میں  
ہے۔ اس میں صاحب موصوف کے اوصاف حسنہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

بہ صد نشاط سی و پنج سال از دنیا	جریدہ رفت جو نال خاں ندچیں
بہ روز بست و نسوم از سی بہ ہنگا	کہ بود خسرو انجم بہ برج ثور کیں،
بہر از ہشت صد سی نمہ علی بو	کہ حبت برقی جاں آیں الم کیں

بہم است نہ تنہا ز بان پیا	بہم است نہ تنہا جگر شکاف گیس
لباس نیلی و رخت سیاہ پوشیدہ	پہریاں بہ سپہ روز مینیاں نہ ہیں
دگر زباں نہ بنائے کہ غیم بہ دین	دگر امید و فائے کہ بخشہ تم سکیں

نہ رفتہ نقش خیال مے و نہ خواہد رفت ز خاطر سدا شدہ داد خواہ حزیں

رپورٹ مسٹر اینڈریو اسٹرننگ کے انتقال سے صرف اُنیس روز قبل یعنی مہ مہرتی ۱۸۳۳ء کو دہلی

سے روانہ ہوئی تھی۔ غالب خود فرماتے ہیں :-

ہر روز چارم آدمی کہ چار شنبہ بود و یا ز دم فوی قعدہ تھان دشت پرورٹ مقدسین ازیں داویچا  
ہر صدمہ داں شد۔ ہے سو چر پرورٹ و کو مقدمہ۔ پرورٹے چل سوئے زنگیاں خم اندر خم، پرورٹے چل  
حال دل بستگان در ہم پرورٹے فتوائے خون یک جان آندو پرورٹے فرمان ریزش آبرو۔

غالب نے ہکنس کی پرورٹ کے متعلق ایک قطع بھی لکھا ہے :-

ایا ستم زدہ غالب ہکنس کمال منہ بہ منہ یکینہ ز شکایت داغ  
اگر بصد خلاف تو کردہ است پرورٹ و گر خصم بہ قتل تو بستہ است جفاغ  
قضا بنا رخزانی نکلند و ہم ز سخت ندیدم کہ ہاں عکس غالب است بلاغ

نئے چیف سکریٹری کے پاس کوشش | اینڈریو اسٹرنگ کی جگہ جارج سنوٹن چیف سکریٹری مقرر ہوئے

غالب نے ان کے پاس سفارش پہنچانے کے لئے مولوی سراج الدین احمد کو لکھا :-

بعد اگر جارج سنوٹن مہربان گرد و در و دروغی حقیقی کوشد۔ بہ کام دل رسیدن آسان است۔  
اگر کا خود را کار شلئے و انتم چکو نہی، از سترگ و در بیان سے نہا دم۔

اس باب میں غالب کو رازداری کبھی بہت خیال تھا مولوی سراج الدین کو جارج سنوٹن کی  
سفارش پہنچانے کی تحریک کے بعد لکھتے ہیں :-

ہر نامہ کہ از من سے رسیدہ باشد۔ بد خواندن و بد مولانا نمودن سے ویرہ و بہ آب و آتش نکلند۔  
ہر کوشش نا کام | لیکن تھوڑی مدت کے بعد جارج سنوٹن صاحب ولایت چلے گئے۔ غالب ایک  
میں اپنی ناکامی کی داستان و رد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

سبحان اللہ مغرول نہ گرد نہ کول برک، بہ مرگ ناگاہ نہ میرد مگر سترنگ بلایت نہ دو مگر جارج  
سنوٹن، در خود صدمہ داسے جاں کاہ نہ باشد مگر اسدا شد و خواہ کنوں مصحت دیں سے بنیم کناہیں  
داوری قطع نظر فرامید و کالت نامہ من کہ ز روشنی نصر اللہ صاحب است، یا ز ستا مند و از ہم زندہ بگرہ  
اللہ بس، اما سوا ہوں۔

یہ غالب کے مقدمہ کلکتہ کے وہ حالات ہیں جو ان کے اپنے سکاڑھے مانو دیں :-

غالب کے دعوے کی بنیاد پر عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب حکومت کے اس شقہ کی بنیاد پر دس ہزار روپے سالانہ کے طلبگار تھے۔ جو لارڈ میک کی تجویز کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد ان کے متعلقین کی پرورش کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں کے نام ہم سہ ماہی۱۸۵۷ء کو جاری ہوا تھا۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم لارڈ میک کے مرحوم شہداء کے شقہ پر عمل پیرا تھے جس کے مطابق ان پر صرف پانچ ہزار روپے سالانہ واجب تھا۔ اور ان پانچ ہزار میں سے دو ہزار خواجہ حاجی کے لئے تھے اور بقیہ تین ہزار نصر اللہ بیگ کے متعلقین یعنی والدہ، ہمیشہ رگان اور برادر زادگان کے لئے مقرر تھے۔ غالب کو اس آخری شقہ کی صحت کا انکار تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ اس کا کوئی مسودہ سرکاری ریکارڈوں میں موجود نہ تھا۔ نہ اس کی نسبت یہ دعوے کیا جاسکتا تھا کہ وہ ہم سہ ماہی۱۸۵۷ء کے شقہ کی طرح حکومت کی منظوری سے صادر ہوا تھا اس لئے اسے ہم سہ ماہی۱۸۵۷ء کے شقہ اور تجاویز کا نسخہ نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ غالب کے دعوے کی حقیقی بنیاد یہی تھی۔

خواجہ حالی کا بیان | خواجہ حالی فرماتے ہیں :-

اسٹرننگ صاحب سکرٹری گورنمنٹ ہند نے .... وعدہ کیا تھا کہ تم اراحت ضرور تم کو ملے گا۔ کول برک صاحب جو اس وقت دلی میں رزیڈنٹ تھے انہوں نے دلی ہی میں میرزا غالب سے وعدہ رپورٹ کرنے کا اقرار کر لیا تھا۔ ان امیدوں کے دھکے میں وہ پورے دو برس کلکتہ میں رہے مگر آخر نتیجہ ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوا۔ گورنمنٹ نے سر جان سلیم گورنمنٹ سے جو لارڈ میک کے سکرٹری رہ چکے تھے۔ اور انہیں کے رد ہوا جاگیروں اور پنشنوں کی سندیں لوگوں کو ملی تھیں مرزا کے مسائل کی بابت استفسار کیا انہوں نے مرزا کے دعوے کو غلط بتایا۔ اور جس قدر پشن فیروز پور سے ملنی تزار پاتی تھی اس کی مفصل کیفیت جو مرزا کے دعوے کے باطل پر خلاف تھی گورنمنٹ میں بھیج دی۔

لیکن میری رائے میں خواجہ مرحوم کی یہ تحریر بعض غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ اینڈریو اسٹرننگ کا وعدہ امداد باطل درست ہے لیکن یہ دعوے صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ کول برک نے کلکتہ جانے سے

قبل دہلی میں غالب کے مفید مطلب رپورٹ کا وعدہ کر لیا تھا۔ غالب کی جو تحریریں اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ کلکتہ میں مقدمہ پیش کرنے کے وقت تک انہیں یہ خیال ہی نہیں تھا کہ ضابطہ کے مطابق مقدمہ پہلے ریزیدنسی میں پیش ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ کلکتہ جا کر اور ضابطہ کا یہ حکم نہ اپنی بچاؤ کی پرزور نہ دیتے اور کلکتہ میں بیٹھ کر وکیل کے ذریعہ سے ریزیدنسی میں مقدمہ پیش کرنے کے بجائے خود دہلی میں فیصلہ کرا کے کلکتہ جاتے۔ دوسرے کلکتہ سے کنٹرل ہنری اٹاک کا سفارش نام کوئل بروک صاحب کے نام نہ بھیجواتے۔ نیز ذاب اکبر علی خاں طباطبائی سے منشی التفتاح حسین کے نام خط نہ لکھواتے۔

سرجان میکیم نے کیا کہا تھا؟ یہ بالکل درست ہے کہ سرجان میکیم صاحب کے پاس والی فیروز پور کا پانچ ہزار والا شفق اس غرض سے پیش کیا گیا تھا کہ اس کی ہمدردی و ستھظ دیکھ کر بتائیں کہ وہ لارڈ لیک کا یا نہیں لیکن دہلی ریزیدنسی کے پرانے ریکارڈوں میں غالب کی منشن کے متعلق جو کاغذات ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سرجان میکیم نے صرف اس امر کی تصدیق کی تھی کہ والی فیروز پور کے پیش کردہ شفق پر ٹھہرا لارڈ لیک کی ہے اور دستخط بھی انہی کے ہیں۔ باقی امور کے متعلق یا غالب کے دعوے کے متعلق کچھ نہیں کہا تھا۔ غالب اس شفق کے متعلق اپنے ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

فرزندہ دہلی وکیل مرزا بن سیاہات (نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور) جو کہ راز و خدو  
و کاغذ گزاردندہ و سے برسے باز و ادو گفت کہ جعلی است۔ ہر دستخط این کاغذ ثابت نہ شدہ و دسر جان  
میکیم بہادریں را بہ دیدہ وری پذیرفت اکنوں مرا گر ہے چند بہ سرشت خیال اقا و یکے از دیگرے  
سخت تر و محکم تر بخت اینکہ کہ سرجان میکیم چنانکہ نامہ فارسی بے نام و نشان را با وداشت و پڑ  
انگریزی را کہ بگر گوشہ دفتر سرکاری است نیز غلط و انمودہ است یا نہ؟ دوم اینکہ ہر گاہ اس خط فارسی  
نے تو انکہ رپورٹ انگریزی را نسخہ اقتدہ میں زدوی چرا با نام؟ یا بیستہ کہ مقابلہ میں ہر دو تحریر یہ بیان  
آمدے تاکار یک سو شدے ہوسم اس کہ ہر گاہ خط فارسی بہ دعا علیہ کہ اس نقش تازہ بر رویے کا و آؤ

اوست باز دادند مدعی چراغہ گفتند کہ زرمند رہی اس را باید سند دہ دیگر نباید خود شید۔

غالب کا دعوئے مسترد ہو گیا | اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار دالاشقہ والی فیروز پور نے مقدمہ کے آغاز میں پیش نہیں کیا تھا بلکہ مقدمہ کے آخری دو میں پیش کیا تھا۔ جارج سنوٹن کے ایکٹ سے جو ریڈیسی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے۔ اسنا ظاہر ہوتا ہے کہ سر جان میکلم کی تصدیق کے بعد وہ پانچ ہزار دالاشقہ کی صحت کے منکر نہیں ہے تھے تاہم ان کی سائے یہ تھی کہ اس شقہ سے حکومت کے نقطہ شقہ کی تفسیح نہیں ہو سکتی۔ لیکن پانچ ہزار دالاشقہ ہی صحیح سمجھا گیا اور غالب کا دعوئے مسترد ہو گیا۔ غالب کے دل پر اس استدلال سے جو اثر پڑا اس کا اندازہ ذیل کے الفاظ سے ہو سکتا ہے۔

کار سن بہ داد گاہ دہلی چنانکہ دانستہ باشد تباہی گزید۔ حالیا برآں رسم کہ اگر مرگ امان دہد باز دہاں  
دکلکتہ رسم و در دول بدان زمزمہ فروزیم کہ مرغان ہوا و ماہیاں دریا را بر خود بگیا نام بہیاست اگر  
معاش من ہیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم دیں تفریق از روسے دفتر سرکار کہ سادہ لوحان اس راست  
آخار گویند ثابت شدہ ہو دیا لیتے کہ صا جان صدر مرا از پیش راندندے و گفتندے کہ ہرزہ مخروش  
آچہ قبا ز یافت و انمودہ یعنی از اس فزوں تر نیست۔ تمام داندہیر جان است۔ لاجرم دیوانہ بود  
اگر دیں کشور باز آمدے و بایک قبیلہ کہ خوشیاں و برادران من اندہ بہ تیرہ برخاستے وہ ہل ہیری  
نام برآوردے۔

گورنر جنرل کے پاس پہلے | لیکن غالب اس پر خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے پھر براہ راست گورنر جنرل کے پاس پہل کر دی۔ وہ اس سلسلے میں دوبارہ کلکتہ جانے کے آرزو مند تھے لیکن زاد راہ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے شاہ اودھ کی طرح میں ایک قصیدہ بھیجا تھا جس کے سلسلے کے متوقع تھے۔ اور اس سلسلہ کو سفر خرچ کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے وہ منشی محمد حسن کے نام کے خط میں شاہ اودھ کے قصیدہ کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :-

بوکہ موابہ جائزہ باد خوانی وصالہ مرح گستری ایں مایہ سامان فرازا پد کہ خود را گرداودہ بہ کلکتہ تو اہم  
برو۔ و کارے تو اہم کرو وقت از دست سے رود و ہنگامہ کا برسے گزرد۔

سفر کا سامان میسر نہ آسکا اور وہ اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ گورنر جنرل پہلے سلاہ دورہ دینی  
توان سے آخری جواب کے لئے تقاضا کیا جائے گا۔

چار سال سے گزرو کہ مقدمہ من بہ اجلاس کونسل دپٹی اہست۔ دو ولم از تقریر امید و سیم پیش کیجے  
کہ قطع خدمت تو اندک و بر نیامدہ و ہنگام بہ پایان رسیدن تیرہ شب نا امیدی ورنیامدہ حایا بل  
سرم کہ چون جزو نظم کونسل اشرف الامر لارڈ و سیم کوئٹس بینک بہادر بدیں دیار و راید بہ دپٹی  
و رآ ویزم داد و خواہم و استدعائے حکم انیر کرئم۔

لارڈ صاحب کا دامن تھام کر غالب نے داد و خواہی پر براہم کیا یا نہیں کیا۔ اس سے متعلق کچھ معلوم  
نہیں ہو سکا۔ اتنا معلوم ہو سکا کہ لارڈ صاحب نے ان کے کاغذات منگائے۔ غالب فرماتے ہیں:-

فرجام داد و خواہی من خرابی قدریت کر لارڈ کوئٹس بینک بہادر کو مقدمہ مراد و قز و ملی  
با خود برد کا رپرورانان دفتر گورنری سے گفتند کہ داد نامائے پیشین از دفتر کلکتہ نیز طلب فرمودہ است

”تا بہ مشاہدہ آن مجمع حکم انیر تو ائم داد۔“

یاد رہی لیکن ان کا دل مایوس تھا۔ انہیں اس بات پر بے حد قلق تھا کہ ایک غیر منظورہ تحریر کی بنا  
پر حکومت کی منظورہ تحریر منسوخ کر دی گئی۔ وہ لکھتے ہیں:-

نظر یہ تقریر کہ در توہین حکومت رحے دادہ دہ حکم کشائے کہ در سرشتہ کا من افتادہ اگر فی النسل  
دربارہ من حکم نقل حاد و گرد و بید نے دائم داگر بالفرض ایک نیمہ انجا کیے فلا سے پس بخندہ نشود شکفت  
نے پندام۔ چون عدل حقیقی نیست ہر چہ باشد گو باشد۔

پہلے مسترد ہوئی آخر کار غالب کے خلاف فیصلہ صادر ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:-

چیرا سی سرشتہ یعنی دہلی رسید و نامہ ہری ولیم فریزر بہادر بہ سن داد و چون بہ میزان نظر بنیدم کہ لڑائی  
اٹاں بود کہ آں را ایک نامہ تو اں انکاشت بارے اہم کہ شود دم و دیم کہ نامہ ہری ولیم جے بہ بینان

لے مرولیم جے گماناں ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک لارڈ ولیم بینک کے سکریٹری تھے اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۴ء

تک حکومت ہند میں پولیس ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے۔ (دکشنری آف انڈین بائیوگرافی صفحہ ۲۶۶)



صاحب بہادر دروڑو آنہست بمضمونش اینکہ کو اندہ منتظرہ مثل مقدمہ از نظر ذابہ ایستے انقاب ریز  
جنرل) مکرگوششت و فرمان صادر شد کہ تجویز بالکنس صاحب منظور و ہر دو مستحق کا غذا گزراؤ  
مر زبان سیوات (ذالی فیروز پور چھر کہ) اعلیٰ و بندوبست مندرجہ دفتر سرکارناصح و نامکمل نقطہ شد  
درین قال ع

در خاندان کسرے ایں عدل داد باشد

گورنر جنرل سے ملاقات بمقامی کی غالب اس کے بعد اس درجہ مایوس ہوئے تھے کہ گورنر جنرل دہلی آئے تو ان سے  
ملنے بھی نہ گئے۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

لارڈ کوئٹس مٹنگ بہادر سوہین دوست بہ دہلی نزول اجلال فرمودہ نوید باردا و دروڑو اناں  
مشاہرہ خواراں، بزرگان و والد اران شہر رفتند و نشستند و عطر و این یافتند۔ غالب مستند کرک تہ  
صورت معقولہ اعمال خود اہست دریں ہنگامہ جاگرم نہ کرو۔ وہ بارگاہ نہ رسید جو چشم بہ راہ پیدا ملان ایر  
رحمت از جانب محیطہ کہ اشارہ پرورد و ذاب گورنر جنرل عبیدہ است -

یعنی غالب سمجھ رہے تھے کہ لارڈ کوئٹس تو ان کے ساتھ انصاف نہ کر سکے شاید جدید گورنر  
جنرل یعنی لارڈ آکلینڈ ان کی حق رسی پر توجہ ہوں۔ اس لئے لارڈ آکلینڈ کے دروڑو کو برحمت قرار  
دیتے تھے جس کی آمد کے انتظار میں وہ بیٹھے تھے۔

ولیم فریزر قتل ڈیرس الدین | اس دوران میں ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا جس میں نواب شمس الدین خاں  
خاں کو پھانسی کی سزا، مانجوڑ ہوئے۔ ان کی ریاست سرکارانگیزی نے اپنے قبضے میں لے لی۔  
ولیم فریزر ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو قتل ہوئے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں تقریباً ایک ماہ بعد  
گرفتار ہوئے اور انہیں اکتوبر ۱۸۳۵ء میں پھانسی دی گئی۔ ان کی ذاتی جائداد فروخت ہو گئی۔  
جس میں ہاتھی، گھوڑے، سانڈیاں، گائیں، بیل، میش بہا پارچات کے تھان، گھمیاں اور  
بہت سادوسر ساز و سامان تھا۔ دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کی رقم نواب صاحب نے پرمیسیوں  
کی صورت میں حکومت انگلشیہ کے پاس جمع کر رکھی تھی جس میں سے دھائی لاکھ روپے پھانسی سے

دو یاتین روز قبل ایک وصیت نامہ کے برصے انہوں نے اپنی بڑی سگیم کے مہر میں ان کے نام کر دیئے تھے۔ نواب صاحب کے ذمے مختلف ساہوکاروں کے قرضے بھی تھے۔ ان کی ریاست سے جن لوگوں کو پیشین ملتی تھیں۔ ان کے بقائے بھی واجب الادا تھے۔ نواب کی سگیم صاحب نے یہ درخواست پیش کر دی تھی کہ ریاست نواب کی صاحبزادیوں احمد الدہا سگیم اور شمس الدہا سگیم کے نام نقل کی جائے۔ ویل یہ دی کہ ریاست نواب احمد بخش خاں کو استمرار ملے تھی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے کسی ذاتی فعل کی بنا پر ان کی اولاد کو آبائی ریاست سے محروم کرنا خلاف انصاف ہے۔

غالب کی تازہ درخواست | اس زمانے میں ہلی کا علاقہ آگرہ والدہ آبادی بھٹ گورنری سے متعلق تھا غالب نے بھی اس موقع پر اپنے پرانے مطالبات کے متعلق ایک مفصل درخواست مرتب کر کے بھٹ گورنر آگرہ والدہ آباد کے پاس بھیج دی۔ یہ درخواست دہلی بیڑی لسنی کے پرانے ریکارڈوں میں موجود ہے اصل درخواست انگریزی زبان میں ہے۔ آخر میں غالب کی مہر ثبت ہے۔ اور ہر کے پاس غالب کے دستخط ہیں۔ یہ درخواست ۳۰ جون ۱۸۳۵ء کو یعنی نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری سے تین دنوں بعد بھیجی گئی تھی۔ اس میں غالب نے ۷ جون ۱۸۳۵ء کے شق پر جو غالب کے دعوے کے تہنہ کی بنا تھا مفصل بحث کی ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) کوئی پردانہ یا شقہ جاری نہیں ہو سکتا جس کا سودہ ریکارڈ میں موجود نہ ہو۔ لہذا لارڈ لیگ کا شقہ

والی فیروزپور کی طرف سے پیش ہوا وہ چلی ہے اس لئے کہ اس کا کوئی سودہ سرکاری دفتر میں نہیں

(۲) اصل شقہ میں گورنر جنرل کے نام کے ساتھ نواب کا لفظ موجود نہیں۔ اور یہ عام سرکاری دستور کے

خلاف ہے۔ لہذا یہ شقہ کسی ایسے شخص کا لکھا ہوا ہے جو قراعدہ گرفتاری سے نابالغ تھا۔

(۳) اس شقہ میں خواجہ حاجی کو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ہل خاندان میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ

خواجہ حاجی اس خاندان کا فرد تھا اور نہ اس خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی۔

(۴) اصل شقہ میں پانچ ہزار روپیہ کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تصریح نہیں کی گئی کہ آیا یہ پانچ ہزار کی رقم ہے یا ہزار

کی اس رقم کے علاوہ ہوگی جو نواب احمد بخش خاں کے ذمے لکھی گئی تھی یا اس رقم میں ہوگی۔

لے بلاس قبیلے کے ایک اور ترک چرن بیگ پڑشاں سے ہندوستان آئے تھے ان کے بیٹے محمد کریم بیگ کی شادی غالب کی

(۵) اگر پانچ ہزار کی رقم کو دس ہزار کی اس رقم کا حصہ قرار دیا جائے جو ہر سنی مسلمان کو لارڈ ایک کی تجویز و حکومت کی منظوری کے مطابق میرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کے لئے مقرر ہوئی تھی تو سوال یہ ہے کہ لارڈ ایک ایک ماہ کے اندر انہیں اس رقم میں سے نصف حصہ کیوں کر حصہ کر سکتے تھے؟ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس باب میں گورنر جنرل سے منظوری نہیں لی گئی اور نہ اس کے متعلق کوئی خط و کتابت موجود ہے۔ لارڈ ایک گورنر جنرل کی منظوری کی رقم میں پانچ خود مختصیف کے حقدار نہ تھے۔

اس کے بعد غالب نے لکھا ہے کہ بے شک دلی فیروز پور جھگڑے کے پیش کردہ شقہ کی مہر و دستخطوں کی سر جان میکیم نے تصدیق کر دی۔ اور یہ ثابت ہو گیا کہ شقہ لارڈ ایک کی مہر و دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ ایک کے عملہ کو رشوت دے کر وہ شقہ لکھوایا! دوسرے بہت سے کاغذات میں رکھو اگر اس پر لارڈ ایک کے دستخط لے لئے۔

دولاکھ تین ہزار کا مطالبہ [آخر میں غالب نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ فیروز پور جھگڑے کی ریاست و آخر اپریل ۱۸۳۵ء تک نواب شمس الدین احمد خاں کے پاس رہی۔ لہذا اسی شقہ سے لے کر اپریل ۱۸۳۵ء تک سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے جو دولاکھ تین ہزار روپے کی رقم بنتی ہے وہ اس رقم میں سے دلائی جائے جو نواب شمس الدین احمد خاں نے سرکار انگریزی میں جمع کرا رکھی ہے۔ اور خواجہ حاجی کو جو دو ہزار سالانہ ملتے رہے ہیں وہ اس پندرہ ہزار کی رقم میں محسوب ہوں جو نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کی پرورش والے دس ہزار روپوں کے علاوہ

۱۵ سلا تا آزادنے "آب حیات" میں نواب ضیا مالدین احمد خاں کے بیان کی بنا پر تحریر فرمایا کہ سر جان میکیم نے غالب کے دعوے کے متعلق یہ لکھا تھا کہ "نواب احمد بخش خاں انگریزوں کا قدیمی دوست اور استیاد امیر خاں اس پر اتمام ضد سے لگا یا کیا ہے" میں نہیں کہہ سکتا کہ نواب صاحب کا یہ بیان صحیح ہے یا نہیں ہے لیکن غالب کے دعوے کی بنا محض یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نے عملہ کو رشوت دے کر شقہ پر دستخط لے لئے بلکہ حقیقی بنیاد یہ تھی کہ لارڈ ایک خود حکومت کی کسی منظوری کے بغیر کو مستحق کر کے حقدار نہ تھے۔

والی فیروزپور کے ذمے واجب الادا تھی۔

اس وقت تک نواب شمس الدین احمد خاں کے مقدمے کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور ان کی ریاست اگرچہ سرکار انگریزی کی تحویل میں تھی لیکن ضابطی کے آخری احکام صادر نہیں ہوئے تھے نہ غالب نے اپنی درخواست میں لکھا کہ اس باب میں تین صورتیں پیش آسکتی ہیں۔ اول یہ کہ ریاست نواب شمس الدین احمد خاں کو یا ان کے وارثوں کو واپس مل جائے۔ اس صورت میں پچیس ہزار سالانہ کی مقررہ رقم حکومت کو ملے یعنی چاہتے جس میں سے دس ہزار روپے سالانہ مجھے (غالب) ملیں اور پندرہ ہزار روپے سرکار انگریزی کے خزانے میں جمع ہوں۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ریاست کو حکومت خود سمجھالی لے اور نواب کے متعلقین کا گزارہ مقرر کرے۔ اس صورت میں بھی دس ہزار مجھے (غالب) ملنے چاہئیں اور پندرہ ہزار روپے حکومت خود رکھے تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت ریاست کو سمجھالی لے اور نواب کے متعلقین کو گزارہ بھی نہ دے بلکہ ان میں بھی دس ہزار مجھے ملنے چاہئیں اور خواجہ حاجی کے وظیفہ کو ہر حال میں ختم کر دینا چاہئے۔ اس درخواست کے آخر میں غالب نے اپنے قلم سے پانچ ہزار روادادہ فارسی شقہ نقل کر دیا جو والی فیروزپور جھڑ کے جواب دعوے کی بنا پر تھا۔

مقدمہ از سر نو ملیں | اس درخواست کے جواب میں لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ ٹی ٹی شکاف ریزنڈنٹ کے متعلق رپورٹ پیش کریں۔ غالب کو اس حکم کا علم ہوا تو انہوں نے پھر ۱۶ دسمبر ۱۸۳۵ء کو ایک درخواست لفٹنٹ گورنر کے پاس بھیجی جس میں لکھا کہ شکاف صاحب کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ علم سے تمام مقدمات کا خلاصہ تیار کر لیتے ہیں اور ان خلاصوں کی بنا پر اپنی رائیں لکھتے ہیں۔ علمہ والے رشوت کے عادی ہیں۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس لئے میں انہیں خوش نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں اگر باب میں محض خلاصہ مقدمہ ترکیب نہ کیا جائے۔ بلکہ اصل کا غذا دیکھے جائیں۔

غالب کو جوشن مل رہی تھی اس میں سے بھی کچھ رقم واجب الوصول تھی۔ لہذا انہوں نے قریباً درخواست پیش کر دی کہ اول نواب فیروزپور کا جو ڈھائی لاکھ روپیہ سرکار میں ہے اس میں دو لاکھ

تین ہزار روپیہ سلسلہ بقایا دیا جائے اور تین ہزار روپے جوئشن کے بقایا میں ہیں وہ ادا کئے جائیں  
 جزوی بقائے کا معاملہ الگ چلتا رہا لیکن اصل دعوے کے جواب میں لفٹنٹ گورنر کا حکم آیا کہ مقدمہ  
 سوپریم کورٹ میں پیش ہو چکا ہے۔ اس لئے لفٹنٹ گورنر اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کر سکتا  
 سارے کاغذات گورنر جنرل کے پاس بھیجے جائیں۔

گورنر جنرل کے پاس درخواست ۲۲ اپریل ۱۸۳۶ء کو غائب لارڈ آکلینڈ کے پاس دو درخواستیں بھیجیں۔  
 ان میں اپنے مقدمے کی روداد تحریر کر دی۔ نیز لکھا کہ سکرٹری اور ریڈیٹنٹ نے میرا مقدمہ خراب  
 کر دیا اور میرے ساتھ جرح بے انصافی کی۔ آپ خود انگریزی انصاف کے اصول پر میرے مقدمے کا  
 فیصلہ کریں تمام ضروری کاغذات سرکاری دفتر میں موجود ہیں۔ اگر دہلی کے حکام میرے مطالبات کے  
 سلسلے میں شبہات پیدا کریں تو میں انہیں دور کر سکتا ہوں انہی درخواستوں میں سے ایک پر غالب بنے  
 اپنے قلم سے حکومت کا وہ فارسی شہدہ لفظاً لفظاً نقل کر دیا تھا جو لارڈ لیک کی تجویز اور حکومت کی منظوری  
 کے مطابق انصافدہ بیگ خاں کے متعلقین کے لئے دس ہزار روپیہ سالانہ کے حکم پیش تھا۔ ان درخواستوں  
 کی رسید کی استدعا بھی کی تھی۔

بقیہ حالات مقدمہ اس کے بعد غائب کی تحریرات سے تفصیلی حالات معلوم نہیں ہوتے۔ وہ مولوی علی الدین  
 خاں بہادر کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ لارڈ ہینٹنگ کے عہد میں سچائی بر رویے کا رنہ آئی۔ اور  
 دشمن کا میاب ہو گیا۔ لارڈ آکلینڈ کے ہندوستان آنے تک زمانے کے حالات بدل گئے۔ والی  
 فیروز پور کو پھانسی کی سزا مل گئی۔ ان کی ریاست سرکار انگریزی کے قبضے میں آگئی۔ میں نے سرکار  
 انگریزی کو مدعا علیہ اور کورٹ آف ڈائریکٹرز کو حج توار دیا اور مقدمہ ولایت بھیجا۔ لارڈ آکلینڈ کا زمانہ  
 ختم ہو گیا۔ لندن سے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ لارڈ ایلن براگوز جنرل سب نے تو میں نے اپنی مظلومیت کی نشان  
 ان کے سامنے پیش کی۔ اور ایک انگریزی عرضداشت ملکہ وکٹوریہ کے نام لکھ کر خواہش کی کہ اسے لندن  
 بھیج دیا جائے۔ اس کا جواب چیف سکرٹری صاحب نے آداب کے مقام سے بھیجا کہ عرضداشت دوسرے  
 کاغذات کے ہمراہ ولایت بھیج دی جائے گی۔

میر سید علی خاں عرف حضرت جی کو ایک فارسی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ مدت تک فرماندہ  
حکومت کی انجمن میں بیچ و تاب کھاتا رہا اب دو سال سے میرا مقدمہ ولایت گیا ہوا ہے۔  
اُدو کے ایک مکتوب میں خواجہ غلام غوث خاں پنجگیر کو لکھتے ہیں :-

۱۷ دسمبر ۱۸۵۷ء کا لکھا ہوا حکم وزیراعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ اس قصیدے کے صلہ  
اور جائزہ کے واسطے جو ترمسلا لارڈ ایلن برائین برائین کے بھجوا یا ہے خطاب اور خلعت اور نشن کی تجویز  
ضرور ہے جو حکم صادر ہو گا سائل کو ترمسلا کو زینت اس کی طاعت دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۱۸۵۷ء  
آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں ملنے پایا فروری ۱۱ اپریل غوثی اور توقع میں گزرے مئی ۱۸۵۷ء  
میں فلک نے یقیناً اٹھایا (یعنی غدر برپا ہو گیا)

لارڈ ایلن برائین ۱۵ جون ۱۸۵۷ء تک گورنر جنرل تھے قصیدہ اور عرضداشت بہر حال اس  
قبل بھیجے گئے ہوں گے لیکن بارہ برس کے بعد جواب ملا کہ سائل کو خطاب اور خلعت اور نشن ملے گی۔  
بہر حال ۱۸۵۷ء تک غالب نشن کے مقدمے میں مبتلا تھے۔ اور غالباً اسی سلسلے میں ملکہ وکٹوریہ  
کا قصیدہ لکھا گیا تھا جس نے بعد ازاں ایک مستقل نشن اور خطاب کی توقع پیدا کر دی لیکن ۱۸۵۷ء  
میں غدر برپا ہو گیا۔ اور غالب کی ساری توقعات ختم ہو گئیں۔ بلکہ تین برس تک وہ نشن بھی بندھی  
جسے غالب اپنے حق سے بہت کمتر سمجھ رہے تھے دہلی ریزیڈنسی کے پرانے کاغذات سے معلوم  
ہوتا ہے کہ ۱۸۳۷ء والی درخواست کے بعد غالب نے ۳ جنوری ۱۸۴۷ء کو پھر ایک درخواست  
لارڈ اکلینڈ کے پاس بھیجی تھی جس کا جواب ۳۱ جنوری ۱۸۴۷ء کو یہ آیا کہ سابقہ فیصلوں میں ترمسلا  
نہیں ہو سکتی۔ ولایت جو عرضداشت بھیجی گئی تھی وہ گورنر جنرل کے اس حکم کے بعد بھیجی ہو گی۔  
غالب کے انگریز بعد [غالب کے فارسی کلیات نظم میں متعدد انگریزوں کے مدحیہ قصائد و قطعات  
میں ان میں سے زیادہ تر صحاب کی وجہ اسی کم نعت نشن کے مقدمہ کے سلسلے میں کی گئی تھی  
مثلاً مسٹر اینڈریو اسٹرلنگ کے قصیدے بعض اشعار اور نقل ہو چکے ہیں۔ وہ حقیقت سکرٹری تھے اور  
۱۷ کلیات نظر فارسی صفحہ ۱۸۳۔

غالب کا مقدمان کے پاس پیش ہوا تھا۔ ایک قطعہ ولیم میکنان کی تعریف میں ہے وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکرٹری اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک پولیس کمیٹی پارک کے سکرٹری تھے جس میں ٹامسن جو بعد ازاں صوبیات متحدہ آگرہ و اودھ کے ٹرنٹ گورنر مقرر ہوئے اور جن کی تعریف میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ موجود ہے وہ ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک گورنر کے سکرٹری اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک فارن سکرٹری تھے۔ چارلس مہکاف صاحب جن کی طرح میں ایک قصیدہ موجود ہے ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک سوپریم کونسل کے ممبر تھے۔ پرنس صاحب جن کی طرح میں ایک قصیدہ موجود ہے ۱۸۳۳ء میں چیف سکرٹری تھے اور ۱۸۳۳ء سے ۱۸۳۳ء تک سوپریم کونسل کے ممبر رہے۔ ٹامسن ماڈک صاحب جن کی طرح میں ایک قصیدہ موجود ہے۔ گورنٹ کے سکرٹری تھے بعد ازاں ڈپٹی گورنر بن گئے۔ کارل صاحب جن کی طرح میں ایک قصیدہ موجود ہے۔ لارڈ اکلینڈ کے پرائیویٹ سکرٹری تھے۔ بعد ازاں صوبیات متحدہ کے ٹرنٹ گورنر بنے۔ ایڈمنسٹریٹو صاحب جن کی طرح میں ایک قطعہ اور ایک قصیدہ موجود ہے۔ گورنٹ کے فارن سکرٹری تھے۔ گورنر جنرل کی طرح کا سلسلہ بھی پٹن ہی کے ضمن میں شروع ہوا تھا مثلاً لارڈ ولیم مینٹن کے زمانے میں پٹن کا مقدیشی ہوان کی طرح میں یا اسکے پیشتر کے گورنر جنرل کی طرح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں صرف ایک قطعہ لارڈ مینٹن کے ورود دی کے متعلق موجود ہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل کی طرح میں ایک ایک قصیدہ موجود ہے۔ لارڈ مینٹن کی طرح میں قصیدے غالب نے حکومت ہند کے مختلف عہدیداروں اور گورنر جنرل کے قصیدوں یا قطعوں کے سلسلے میں پٹن کے مقدمہ کے متعلق یا اپنی ذات کے متعلق جو کچھ لکھا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی یہاں پیش کر دیا جائے۔

میکنان صاحب | میکنان کے قطعے میں لکھتے ہیں :-

ہاچین سجھے کہ سن دارم کہ سن خوشی سن راسخ لطف مہاں دیدہ ام  
دہم ستولیت برین دیں چارنود کہ سن خود چہ نو میدی زگر و شہاے دوران دیدہ ام

Ms. Hanif Fatima Rizvi (Maghara)  
 19 Dec. 1951

یک دو چہشتش دارم و ازل گوہر بار تو آرزو تہنہ کام پاسخ آں دیدہ ام  
سرچاپس شکاف | چارلس شکاف کے قصیدے میں فرماتے ہیں :-

یاد باد آنکہ انہیں مرحلہ تکلیف  
کردہ ام طے بہ امید توره دور و دراز  
گرد اندیشہ بہ عدل تو قوی دل گشتہ  
ناقہ سعی من از راہ نہ گردیدے باز  
نالہ و این از شدت جویش کا ست  
ندردیوانگی و غیہ سرگی و شوخی و آرز  
برنج من در بندے کہ کشاید و اور  
حیث باشد کہ کند خصم بد اندیش فرزند  
ہفت سال است کہ بایک لڑکہ و غیہ کم  
من غاصب جو سر شہ شمع و دم کار  
اوز غوغا رگی خویش در انداز غصب  
من ز بیچارگی خویش بہ آداب نیا

.....

خود توانی کہ ازین مخلص رستن تو راں  
جز بہ تائید تو اسے خسرو و درویش نواں  
بوکہ اندازہ و راید بہ درستی جز سل  
بوکہ اندیشہ گر اید حقیقت ز مجاز  
طاقت نیست بجا کہ کف پائے تو تم  
زانکہ غم حوصلہ سوز است و بلا نہ رہد گذر  
چوں چرخ روزیادم بہ گزر گاہ فنا  
داور از دور تر از ہر جہ بہ عالم پرواز

پانچ مطالبات | ہفت سال سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ غالباً ۸۳۳ھ میں لکھا گیا تھا  
میں اپنے مطالبات سے متعلق لکھتے ہیں :-

پنج مطلب ز تو ام ہست و بہ صد گوئہ امید  
خواہم آں پنج علی العزم حسود و غاف  
اول این است کہ در با مینا شے کہ مرآت  
کنی اندیشہ کم بہ طریق ایجاز  
ہر جہ در دفتر سرکار بود نقش پذیر  
ہم بہ اندازہ آں نقش شوی مادہ رنہ  
دوم آں کہ اثر عدل تو اسے سحر عہد  
غیر باندہ دریں وجہ نباشد انباز  
سوم آں است کہ دیگر غم دست طلب  
پیش فرماندہ میوات بدریوزہ دراز  
ہم بگنجینہ سرکار برائے خواہم  
داوہ انصاف بدس یا فنگی اذن جواز



چارم آن است کہ باقی ز چندین سالہ بے نزاع مبدل و جد بہ من گرو باز  
 پنجم آن کہ پس ایل فتح کہ باید روئے دہی ام مژدہ اکرام و نوید ہمسراز  
 بخشی ام تازہ خطایہ و برال افزائی خلعتے و رخورایں دولت جاوید طراز  
 غالب کی قادیانکلامی کے کمالات کا یہ عجیب کرشمہ ہے کہ وہ نہایت خشک مطالب  
 کو بے تکلفی کے ساتھ شعروں میں لکھتے جاتے ہیں اور شعریت میں بال برابر فرق نہیں آنے دیتے۔  
 اوپر کے اشعار میں ملا خطہ فرمایہ کہ اپنے پانچ مطالبات کس خوبی سے نظم کئے ہیں کہ اول مجھے  
 پنشن سرکار کی منظوری کے مطابق ملے۔ دوم میری ٹپشن و دوسرے متعلقین سے علیحدہ کر دی جائے۔  
 سوم مجھے والی فیروز پور جگر کے روبرو دست طلب دراز نہ کرنا پڑے بلکہ ٹپشن سرکاری خزانہ سے  
 متعلق ہو جائے۔ چارم ہتھنار و سپاہ تک وصول نہیں ہو ادا مل جائے پنجم مجھے نیا خطاب  
 اور خلعت دیا جائے۔

مقدمہ ولایت جاری ہے | جس زمانے میں مقدمہ ولایت جاری تھا اس مائیں حکومت ہند کے کسی کن کو نکھا

بہ صدر مے رو دایں باز پر بسبم اللہ ہمیں مراد من بہت خیراں مراد غم نیست  
 تو کردی و تو کنی کارم اعتقاد این است بہ کار سازی بخت خود اعتقاد غم نیست  
 رسیدے وہ پائے تو سودے سر عجز بضاعت سفر و شد گاہ زاد غم نیست  
 مفید مطلب من بہر تہا سبب کہ بود توجہ کن کہ بسا ز انبیانہ یاد غم نیست  
 امید لطف تو دل مے وہد بین شادام و گرد نہ تاب صدور ی ازین زیاد غم نیست  
 بہ ذوق تہرب زمان مراد بے تابم و گرد نہ شورش بھیل در نہاد غم نیست  
 نہ نیم روز نہ لندن رساندے ذوق دے چہ چارہ کہ فرماں بربا غم نیست

لارڈ کلینٹن لارڈ کلینٹن کے قصیدے میں لکھتے ہیں

از تو رسیدم بہ نوش ورنہ لب غم نہا سرکہ ز صبا چشید زہر ز شکر گرفت  
 از تو توانا شدم ورنہ مراد نہا چارہ نہا مائی صورت ابر گرفت

خوست دل اور در خیال زخم جاہ و فتن  
از پے آل نخبیہ مارا زتن لائے گرفت

.....

ہم زد دم گرم خویش خشک نمودم برق صدرہ اگر نالہ غم از شرہ حر گرفت  
باتو چہ گویم ز جو رکاوید از انصاف تو خاضہ ظالم بہ سوخت ستم تم گرفت  
آخری شعریں ذاب شمس الدین خاں کی پھانسی اور ریاست فیروپور جگر کہ کی ضلعی کی  
اشارہ ہے۔

لارڈ ایلن براؤن ایلن براؤن کے قصیدے میں فرماتے ہیں

یہ گفتار تم تو نگہ کر بہ سیم و تہیہ ستم زمین کلبہ من شد گلستاں بعد ویرانی  
بر رسم نکتہ سبھاں در سخن نامم بود غائب بدیں نام از ازل آورده ام غم سبھاں  
مراد دوست اندر دل کہ جان فرسائی آزا ندام چارہ اما میں قدر و انم کہے دانی

.....

کرم سے کرد گر لارڈ ایلن از راہ غمخواری تو نیز از راہ غمخواری کرم کن کرد کربانی  
ازاں وز نامہ تلخ تو آرم بر زبانش کہ با من دہشت گونا گوں نواز سبھاں پہنانی  
گراور رشتہ تلخ سخنور گو بہر آمو دے ترا باید کہ بر فقر سخنور گو بہر افشانی  
دوسرے قصیدے میں فرماتے ہیں

رفت آل غم از ہاں دو بدیں شاد و سیتن و انم کہ مردہ زندہ شد اندر زمان تو  
درا جرائیکہ کوشش من ناگاہ رفت خواہم زحق جیسا کہ ابدرا گمان تو

دکنورج | و کٹوریہ کے قصیدے میں غالب نے یہ سلسلہ دعا لکھا تھا۔

آں باد و در نیست کہ گفتار من مرا سیمائے عز و جاہ بریں آستان دہد  
آں باد و زود باد کہ کلک دیر خاص آوازہ نوازش من در جہاں دہد  
آں باد و در غور است کہ فرمانہی کنم بر یک دودہ کہ گنگت ہندوستان دہد

اُس مادہ خوش بود کہ شہنشاہ مجسٹریٹ انجام خواہش اس سدا اللہ خاں دہلوی  
میر خیال ہے کہ غالب کی اقتصادی و مالی حالت کی تخریب میں اس فنش کے مقدمہ کا بڑا  
حصہ تھا۔ انہوں نے اس پر کافی روپیہ صرف کیا۔ اور مدت مدید تک انہیں یہ توقع لگی رہی کہ فیصلہ ملے  
جس میں ہو جائے گا۔ اس بنا پر وہ بلا تکلف قرض لیتے رہے اور انہیں قرض ملتا رہا، ایک وقت  
میں انہیں یہ اُمید ہو گئی تھی کہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ یک مشت مل جائے گا اور اتنی بڑی رقم کے  
یک مشت مل جانے کی اُمید پر غالب کو قرض کا بڑے سے بڑا بوجھ اٹھالینے میں بھی کیا تامل ہو سکتا تھا۔  
اور سود خوار مارجینوں کے لئے اپنی ٹوٹی مگر عاقبت نااندیش اسامی کو زیادہ سے زیادہ قرض دینے میں تذبذب  
کی کون سی وجہ تھی۔ بہر حال غالب ۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۸ء تک اس قضیہ میں اُبھے رہے۔  
اور اسی ضمن میں نئی فنش، نئے خطاب اور نئے اعزاز کی توقع پیدا ہوئی جو ۱۸۶۵ء تک خدا جانے  
کشائش و فراغت بال کے کیسے کیسے خیالی متظران کے سامنے پیش کرتی رہی۔ یہ دلچسپ کن مناظر  
اس وقت سرب ثابت ہوئے جب بنین حیات کی اسٹیم سافٹیں طے ہو چکی تھیں اور شہر خرمشاہ کا  
سودا بالکل سامنے آ گیا تھا۔

احقر سلطان جوہر  
Blunder

جلال اللہ  
جلال اللہ

# ساتواں باب

## ابتلا پر اسیری

چرخ یک مرد گر انبیا یہ بزندان  
یوسف از قید زنجبار آمد گوی

۱۲۶۴ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں غالب پر اسیری کی ابتلا نازل ہوئی مجھے غالب کی شہداء تصانیف میں اس واقعہ کے متعلق کوئی سوا ونیس لکھنؤ کا واقعہ حالی مرحوم فرماتے ہیں کہ غالب ایک فارسی خط میں اس واقعہ کو اختصاراً لکھا ہے۔ میری نظر سے یہ خط نہیں گزرا۔ خواجہ مرحوم سے اس خط کا جو اقتباس یاد نگار میں دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو چرسرا و شطرنج کھیلنے کا ست شوق تھا۔ چو سر جب کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلتے تھے۔ کہ تو ال دشمن تھا، اسے مار بادی کا مقدمہ بنا دیا مجسٹریٹ غالب کی حیثیت، مرتبہ اور ذاتی حالات سے ناواقف تھا اس لیے ماہ کی قید کی سزا دی۔ سیشن جج میں اپیل کیا گیا جج اگرچہ غالب کا دوست تھا۔ اور اکثر صحبتوں میں مختلف ملتا تھا لیکن اس نے بھی تداخل اختیار کیا۔ اور سزائے قید بحال رکھی۔ صدر میں اپیل کیا گیا۔ سن دہاں بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی تین ماہ کے انقضا کے بعد مجسٹریٹ نے خود ہی رٹائی کی رپورٹ دے دی۔ اور غالب تین ماہ کے بعد رہا ہو گئے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ قید میں ان کی طبیعت بے نظربندی تھی۔ کھانا کپڑا اور دوسری ضروریات ان کو گھر سے پہنچتی تھیں۔ دوست ان سے تلف ملتے تھے لیکن اس زمانے کے حالات اور نوعیت جرم کے اعتبار سے یہ واقعہ غالب نظر میں سخت ذلت فہم تھا اور اسے انہوں نے نہ سمجھا نہ محسوس کیا۔ خواجہ حالی کے بیان کے بق وہ خود فرماتے ہیں :-

اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا جو کچھ گزرا اس کے بھگت آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر ہنسی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں مذہبوں اور اگر ہوں تو مذہب و ستان میں مذہبوں مصر ہے، ایران ہے، ہندو ہے۔ پٹنہ جیسے دوغوب کبہ زادوں کی جاسے پناہ اور آستانہ رتنہ للعالمین دلاؤں کی نگاہ کا ہے دیکھئے وہ وقت کب آئے گا کہ دراندگی کی قید سے جو اس گزری قیدی سے زیادہ جانفرواسے نجات پاؤں اور بنیراس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں سر بھر اٹل جاؤں۔

اُردوئے معنی میں تفتہ کے نام ایک خط ہے جس پر ۱۸ ستمبر ۱۸۵۲ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس

میں یہ الفاظ بھی ہیں :-

سرکار انگریزی میں بڑا پیار رکھتا تھا۔ بیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔

شاید ان الفاظ میں بھی قیدی کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

دہلی میں قمار بازی کی دبا | خواجہ حسن نظامی نے دہلی کا آخری سائنس کے نام سے "حسن الاخبار" کے ان فارسی مضامین کا ترجمہ شائع کیا ہے جو دہلی یا دربار شاہی کے حالات پر مشتمل تھے۔ یہ کتاب نومبر ۱۸۳۳ء سے لے کر مارچ ۱۸۳۸ء تک حالات دہلی کا ایک نہایت عمدہ مرقع ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں حکام کی توجہ قمار بازی کے اشداد کی طرف بطور خاص مبذول تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ وہاں پہلے گئی تھی۔ مثلاً ۲۰ جون ۱۸۳۵ء کے حالات میں مرقوم ہے :-

کو نال شہر نے سولہ آدمیوں کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا تو آدمیوں کو چھڑنے کی قید اور پچاس روپے جرمانہ اور پانچ آدمیوں کو تین مہینے کی قید اور پچیس روپے جرمانہ اور دو آدمیوں کو ایک مہینے کی قید اور چار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم ہوا کہ وہ سب لوگوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر شہر کو لے کر قید کی تعبیر دہی کا کام لیا جائے۔

سہ یادگار غالب صفحہ ۲۷ و ۲۸ دہلی کا آخری سائنس صفحہ ۱۶۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں قمار بازی کا برائے نام آزاد کباب بھی محکم کی نظروں میں بہت سنگین جرم بن گیا ہوگا۔

غالب کے خلاف مقدمہ | اس کتاب میں غالب کی گرفتاری اور مقدمہ کا ذکر سب سے پہلی مرتبہ ۲۵ جون ۱۸۴۷ء کے حالات میں آیا ہے تحریر یہ نظر ہے :-

مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا  
مظفر الدولہ بہادر (ریزیڈنٹ) کے نام سفارشی ٹیٹی بہادر شاہ کی طرف سے لکھی گئی کہان کو رد کیا جائے  
یہ مغزین مٹھر میں سے ہیں۔ یہ جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پر داری کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری  
سے ذواب صاحب کلاں بہادر (ریزیڈنٹ) نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت  
میں قانون سفارشی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب ۲۵ جون ۱۸۴۷ء کو یا اس سے چند روز قبل گرفتار ہوئے  
بہادر شاہ بادشاہ اور ان کے درباریوں کی رائے بھی یہی تھی کہ یہ گرفتاری محض حاسدوں کی فتنہ پر داری  
سے عمل میں آئی ہے۔ اور غالب قمار بازی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ریزیڈنٹ کو سفارشی ٹیٹی  
لکھی گئی لیکن ریزیڈنٹ نے جواب میں یہ لکھا کہ مقدمہ عدالت میں جا چکا ہے۔ اور اس حالت میں  
قانون قبول سفارشی کی اجازت نہیں دیتا۔

۲۷ جولائی ۱۸۴۷ء کے حالات میں پھر غالب کے اس مقدمے کا ذکر آیا ہے۔ تحریر یہ ہے :-

مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا  
صاحب کو چھ مہینے کی قید با مشقت اور دوسروں پر جرم کی سزا ہوئی۔ اگر دوسروں پر جرمانہ ادا نہ  
کریں تو چھ ماہ قید میں اور فائدہ ہو جائے گا بمقررہ جرمانہ کے علاوہ اگر چاس روپے زیادہ ادا کئے نہ کیا  
تو مشقت معاف ہو جائے گی جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصہ سے تیل بہتے  
ہیں۔ میرا سے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے۔ تو کتنا بڑا ہے کہ اس قدر مشقت اور

مصیبت کا بداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے یاہر ہے۔ بلکہ طاقت کا اندیشہ ہے اُمید مانی ہے  
 ہے کہ اگر کشن جی کی عدالت میں پل کی جائے۔ اور اس مقدمہ پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہوگا  
 بلکہ عدالت نو جداری سے مقدمہ اٹھایا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے پائل خلاف ہے کہ ایسے  
 باکمال رئیس کو جس کی عزت و شہمت کا دیدہ لوگوں کے دلوں پر چٹھیا ہو اسے بھولی جرم میں اتنی سزا دی جائے  
 جس سے جان جائے کا قوی احتمال ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کو چھ ماہ قید با مشقت کے علاوہ دو سو روپے جرمانے کی  
 سزا بھی دی گئی تھی اور بصورت عدم ادائے جرمانہ مزید چھ ماہ کی قید کا حکم سنایا گیا تھا۔ البتہ یہ کہ وہ یا  
 بپا تھا کہ وہ پچاس روپے کی رقم دے کر مشقت معاف کر سکتے ہیں

اقتباس کا آخری حصہ احسن الاخبار کے ایڈیٹر یا اس کے نامہ نگار کا تبصرہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے  
 (۱) غالب کی صحت اس زمانے میں اچھی نہ تھی۔ اور وہ پرہیزی غذا کھاتے تھے۔

(۲) عام خیال تھا کہ سزا بہت سخت دی گئی ہے۔

(۳) وہ بڑے باکمال رئیس سمجھے جاتے تھے جن کی عزت و شہمت کا دیدہ لوگوں کے دلوں پر چٹھیا ہوا تھا۔

(۴) اندیشہ تھا کہ وہ اسیری کی تاب نہ لاسکیں گے۔

میر خیاں ہے کہ مشقت پچاس روپے دے کر معاف کر لی ہوگی اور دو سو روپیہ جرمانہ بھی  
 یقیناً ادا کر دیا ہوگا۔

غالب کا مصیبت قید کی حالت میں غالب نے چوراسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند لکھا تھا جو ان کی بہتر  
 نظموں میں سے ہے لیکن غالب کے عزیزوں اور دوستوں نے اسے کلیات نظم میں شامل نہ ہوتے  
 دیا۔ غالب اس خیال سے کہ اس نظم کی اشاعت سے غالب کی قید کا واقعہ ہمیشہ کے لئے منظر عام پر  
 آجائے گا۔ انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ شاعر کی زندگی محض شعر بونی ہے۔ دنیا کو اس کے حالات کی  
 اچھائی یا برائی سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ محض اس چیز سے واسطہ ہوتا ہے کہ مختلف

واقعات نے اس کے ساز سخن میں سے کون کون سے ترانے پیدا کئے۔ غالب کے دوستوں اور عزیزوں کی غلط اندیشی قہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قید کے واقعہ کو چھپانے کے اہتمام میں غالب کی ایک بہترین نظم کو صانع کرنا پسند کیا۔ کلیات نظم فارسی کے چھپ جانے کے بعد غالب ”سیدیں“ کے نام سے اپنے بعد کے کلام کا جو مختصر سا مجموعہ شائع کیا تھا اس میں یہ ترکیب بند بھی شامل کر دیا تھا افسوس کہ ”سیدیں“ والا کلام کلیات کے بعد کے ایڈیشنوں میں شامل نہ ہو سکا اور اب ”سیدیں“ بے حد کیا ہے ہیں اس ترکیب بند کو تمارا درج کرتا ہوں شاید اس طرح یہ زیادہ محفوظ ہو جائے اور اباب فوق اس سے مستفید ہو سکیں۔

قید کی حالت | خواجه حالی مرحوم کا جو بیان اوپر درج ہو چکا ہے اس میں صاف مرقوم ہے کہ قید میں غالب کی حیثیت محض نظر بند کی تھی۔ کھانا، کپڑا اور دوسری ضروریات ان کو گھر سے پہنچی تھیں۔ دوست ان سے بلا تکلف ملتے تھے۔ عام ترانے بھی اسی بیان کے موید ہیں لیکن خود غالب نے جتنیں لکھا ہے وہ

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم

از کف ٹخنہ رسد جامہ و نامم در بند

میری رائے میں محض سخن گسری ہے۔ انکار واقعہ نہیں ہے۔

غالب کے غیر مطبوعہ اردو کلام کے سلسلے میں مختلف اصحاب نے یہ شعر بھی نقل کیا ہے

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتار بلا ہیں

کپڑوں میں جوئیں بچنے کے ناکوں سلو ہیں

جناب نظامی بدایونی اس شعر کی شان نزول کے باب میں فرماتے ہیں کہ غالب اتفاقاً قید میں

تھے۔ وہاں کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ ان کو چٹن رہے تھے۔ کہ ایک رئیس نے جا کر پش مزاجی کی

غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔



مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ یہ شعر غالب کا ہے یا نہیں لیکن اس کی شان نزول کو درست تسلیم کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ "حسن الاخبار" کے بیان سے ظاہر ہے کہ پچاس روپے ادا کر پر مشقت معاف ہو جانے کا موقع حاصل تھا۔ اور یہ امر قرین قیاس نہیں کہ غالب نے یا ان کے دوستوں نے فوراً پچاس روپے ادا نہ کر دیئے ہوں اور مشقت معاف نہ کر لی ہو مہندہ غالب بہت بکریٹس تھے۔ جسے کہ خود پادشاہ وقت نے ان کی رہائی کی سفارش کی تھی بہ ظاہر یہ صورت قابل فہم نہیں کہ ان کی ہر ایک ہفتی اس حد تک پہنچ گئی ہوگی کہ انہیں اپنے کپڑوں میں سے جوئیں چھنے کی ضرورت پیش آتی۔ جسبہ سے ظاہر ہے کہ اس ابتلا میں نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ نے اعانت و غمخواری اور دوستی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے غالب نے نواب صاحب مرحوم کا خاص طور پر ذکر کیا بلکہ یہ بھی لکھ دیا کہ ایسا غمخوار دوست غزاداری کے لئے موجود ہو تو مرے کا بھی غم نہیں۔ نیز علیہ العطر قیدیں گزاری تھی اور اگرچہ ماد کی مدت جیل میں پوری ہوتی تو عید منی بھی قیدی ہی میں آتی۔

آخر میں میں جسبہ پچاس باب کو ختم کرتا ہوں۔

خواہم از بندہ زنداں سخن آغاز کنم	غم دل پرودہ دری کرد و فغاں ساز کنم
ہو نوائے کہ ز مضرب چکاند و نواب	خوشین را بہ سخن زمرہ پروا ز کنم
در خرابی بہ جاں سیکہ بنیاد کنم	در سیری بہ سخن دعویٰ اعجاز کنم
بے مشقت نبود قید، بشمر آویزم	روز کے چند رسن تابانی آواز کنم
چوں سراپا سخن انصاف ز مجرم خواہم	چوں نوسیم غزل اندیشہ ز غماز کنم
تا چہ افسوس بہ خود از مہبت صیاد دہم	تا چہ غول و جبکہ از حسرت پروا دہم
یار ویرینہ دم رنجہ مفسد کاہینجا	آں نہ گنجہ کہ تو در کوبی دمن باز کنم
ہائے ناسازی طالع کہ بہ من گرد و باز	با خروشکہ گرد طالع ناساز کنم
اہل زنداں بہ سر و چشم خود مبادا دند	تا بدیں صدر نشینی چہ قدر ناز کنم
بہ زندان گرفتار و فانیست بہ شمر	خوشین را بہ شما ہدم و ہمارا کنم

من گزقارم و این دایره دوزخ تن تن  
در سخن پیروی شیوہ ایجب رکشم  
گرچه توقع گرفتاری جاوید نم نیست  
لیکن از دهر و گزخشی ای امید نم نیست

شمع هر چند هم سوزا و یہ آساں سوزد  
خوشتر آن است که بر قطع در ایوان سوزد  
عوین ہر زہ سوزید و گزخشی است  
بگزارید کہ در مجلس ساطاں سوزد  
خانہ ام ز آتش بیداد و سوخت و دین  
سوخن دہشت ز شمع کہ شبتاں سوزد  
منم آن خستہ کہ گزخشم جگر بنایم  
برین از مہر دل گسر و مسلمان سوزد  
منم آن قیس کہ گرسوئے من آید لیلے  
محل از شعلہ آد از جسدی خواں سوزد  
تا چہ نام گزرد روز بہ شبہا در یاب  
از چرخے کہ عس بر در زنداں سوزد  
تنم از بندہ در انبوه قیساں لرزد  
دلہ از درد و برآمدہ اسیراں سوزد  
از غم دیدہ من فتنہ طوفاں خیزد  
از قف نالہ من چو ہمہ کیواں سوزد  
آہ زین خانہ کہ روشن نشود در شب تار  
جز بد آن خواب کہ در چشم نگہباں سوزد  
آہ زین خانہ کہ دروئے نتوان یافت ہوا  
جز سموئے کہ خس و خاشا بیاں سوزد

اے کہ در زادیہ شہا بہ چراغ غم شیری

دلہ از سینہ بڑل آہ کہ دغم شیری

پاسباں ہم آئید کہ من مے آیم  
در زنداں بجشائید کہ من مے آیم  
ہر کہ دیدے بہ در خویش سپاسم گفتے  
خیر مقدم بہ سر آئید کہ من مے آیم  
جادہ نشناسم و ز انبوه شام مے ترسم  
راہم از دور نہائید کہ من مے آیم  
رہر و جادہ تسلیم در شتی بکنند  
سخت گیرندہ چرا آئید کہ من مے آیم  
خست تن در رہ و تغذیب ضرورت است اینجا  
نمک آید و بہر آئید کہ من مے آیم  
عارض خاک بہ پاشیدن خون تازہ کنید  
رونق خانہ فر آئید کہ من مے آیم

چول من ایم ہم شمسکوہ گردون رو است      زیر پس از غایت کہ من سے ایم  
 ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید      بخت خود را بہ تائید کہ من سے ایم  
 "تا بہ دروازہ زنداں سپے آوردن من      قدمے بربہ نہایت کہ من سے ایم  
 چول من منجی فرزانی آئین من است      بہرہ از من بہرہ بایند کہ من سے ایم  
 بخود از شوق بہ بالید کہ خود باز روید      بہ من از سر گردید کہ من سے ایم

بسکہ خوشیاں شدہ بیگانہ زندانی من

غیر شگفت خوردگر غم ناکای من

آنچہ دوست ہم امر و در آمد گوی      آفتاب از بہت قبیلہ برآمد گوی  
 دل و دوستے کہ مراد و فرماں داز کا      شب روزیکہ مراد و سر آمد گوی  
 سرگزشت ہم سرخ و الم آرد گفتی      سر نوشت ہم خوف و خطر آمد گوی  
 بہرہ ال جہاں چوں ز جہاں دو غم بہت      بہرہ من ز جہاں بیشتر آمد گوی  
 خشن و بستن من عدس نیست بڑ      بر من اینہا ز قضا و قدر آمد گوی  
 ہنرم را تو اں کرد بہ خشن ضائع      خشکی غارتہ موسے ہم آمد گوی  
 غم دل و شتم اینک غم جانم دادند      زخم را زخم و گدگر بر اثر آمد گوی  
 چرخ یک مر و گر انما یہ بہ زنداں خواہد      یوسف از قید زلیخا بد آمد گوی  
 شرہ امشب ز کجا ایں ہمہ غناب آورد      ایں جنہیں گرم ز زخم جگر آمد گوی  
 خود چرخوں خودم از غم کہ بہ غناری من      رحمت حق بہ لباس بشر آمد گوی  
 خواجہ بہت دریں شکر کاوشش وے      پایہ خویش شتم در غم آمد گوی

مصطفیٰ اٹال کہ دریں واقعہ غور میں است

گر بہ میرم چہ غم از مرگ غرادر میں است

۱۵ مصطفیٰ اٹال شفیق نے ایسے زمانے میں مستی کا قیام کیا تھا۔ یہ تینوں شعرزات سبکی ہی اور غصا نہ ہندی کا شیعہ ہیں۔

خواجه دامنم که بے روزنه دامنم در بند  
 یک دانی که شب و روز ندامتم در بند  
 نپسندم که کس آید نتوانم که روم  
 جانب در چپ حسرت نگرانم در بند  
 خسته ام خسته من دعوی تمکین حاشا  
 بند سخت است پسیدن نتوانم در بند  
 شادم اذ بند که از بسند رعاش آزادم  
 از کفت شخته رسد جامه و نامم در بند  
 آه و چاهه بیاید و بکل نبوسید  
 خواب از بخت هستم و ام ستانم در بند  
 یارب این گوهر معنی که نشانم ز کجاست  
 بند در تن بود و نیست زبانم در بند  
 هر کس از بسد گران نال و ناکس که کنم  
 نالم از خویشش که بر خویش گرانم در بند  
 خوشم خوش بهر مصیبت زده بخ و گر هست  
 رنجبه از ویدن رنج و گر انم در بند  
 رفته در بازه من حکم که باد و در رنج  
 ششش مرا از عمر گرامی گرانم در بند  
 اگر این است خود آن است که عید خجی  
 گردنم ز عید و عید و عید در بند  
 مدت قید اگر نظر هم هست چرا  
 خون دل از مرده بے حرفه چکانم در بند  
 نیستم طفل که در بند دانی باشم

هم زودق است که در سلسلهائی باشم

من نه آنم که ازین سلسله ننگم نبود  
 چه کنم چون به قضا زهره جنگم نبود  
 زین دورنگ آمده صد رنگ خرابی نبود  
 گمانیت که از بخت دوزنم نبود  
 راز و نامم رسوائی جاوید بلاست  
 بهر آزار غم از قید ننگم نبود  
 لرزم از خوف دیل حجره که از نشت و گل است  
 و در دل خطر از کلام ننگم نبود  
 زین دورنگ که پویند هم می ترسم  
 شبی از شیر و هراس زینم نبود  
 منم آینه و این حادثه رنگ است و نه  
 تاب بدنامی آتش زنگم نبود  
 آه از آنم که سر ایند زندان آمد  
 اندرین دانه گیرم که در ننگم نبود  
 بعد ما دارم امیس دانی در بند  
 دهن از بعد دانی تیر سنگم نبود

جور اعدا و کاذب دل به رمانی بسکن طعن احباب کم از زخم خدنگم نبود  
 حاش شد که درین سلسله باشم خوشنود چه کنم چو سراسر رشته بپسنگم نبود  
 چه سیر قلم خویش بودستی من  
 اندرین بندگراں بین و سبک دوستی من

همای دروالم از دیده نهانید همه غالب غم زده را روح دوآیند همه  
 شد کج که در عیش و نشاطید همه شد الشکر که باشوکت شایند همه  
 هم و آئین نظر سحر طرازید همه هم و تسلیم سخن شاه نشانید همه  
 چشم بدور که فرخنده لقائید همه شاد باشید که نسج گهر انید همه  
 سود پینا و فادیده و نورید همه زنده مانید صفا قالب جانید همه  
 من بچو خفته و بستم همه بنید همه من بگر خسته و دانه همه بنید همه  
 در میان ضابطه مر و وفائے بود است من بر نیم که هر یکنه برانید همه  
 روزی از فکر کفایت فلائی چون است بارے از لطف بگویند چنانید همه  
 گر نباشم به جبال خار و خنجر گم گسید اے که سر و سمن باغ جهانید همه  
 چاره گزین تو اں کرد و معائے کافی است دل اگر نیست خداوند زبانیید همه  
 هفت بند است که در بند رقم ساختیم بنویسید و به بیسند و بخوانید همه

آل نه باشم که به هر زم زمین یاد آرید  
 وارم امید که در بزم سخن یاد آرید



## آٹھواں باب

### مالی حالات، مدح گوئی اور حیلہ بازی

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت  
مے توان گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

غالب کی زندگی مالی مشکلات کے جس ہجوم اور پریشان حالی و دراندگی کے جس الم زائیں گزری  
اس کا صحیح نقشہ اوپر کا شعر پیش کر رہا ہے۔ اسی مضمون کو وہ اردو میں یوں لکھتے ہیں ۵

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب  
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ بڑے خوشحال اور دولت مند گھرانے میں پیدا ہوئے تھے باپ اور چچا کا سا کھیتی باڑی میں  
ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ فطرتاً لالہ بالی تھے نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت کی سستیوں و فراغ البالی کی ہر چیز  
اور بے پروائیوں نے انہیں حد درجہ سرف اور غیر محتاط بنا دیا۔ جب دولت و ثروت کے جمع شدہ ذخائر  
ختم ہو گئے تو وہ اپنی روش کو بدلنے کے بجائے اپنے بڑے ہوتے مصارف کے لئے بلا تکلف قرض  
لینے لگے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ اسراف ان کی فطرت کا جزو بن گیا۔ شراب کی عادت ایسی پڑی کہ  
آخری دم تک نہ چھوٹی۔ ان کی ذاتی آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے لیکن جمع شدہ دولت نے  
ابتداء میں ان کی قلت کی طرف متوجہ ہونے کی ہمت نہ دی جب وہ تنگ ہوئے تو فحش پوری نہ لے  
کی جانب خیال منتقل ہوا۔ اور انہوں نے مقدمہ کا سلسلہ جاری کیا جو ۱۸۶۲ء سے شروع ہوا اور غالب  
تک جاری رہا اس کے دوران میں انہیں سلسلہ یہ امید لگی رہی کہ روپیہ جلد مل جائے گا۔ اسی ضمن میں  
انگلشیہ کی طرف سے نئے صلی کی توقع پیدا ہو گئی جس میں وہ غدر تک اُبھرتے رہے۔ یہ ہر حال مختلف اتفاقات

کی بنا پر وہ قرض لیتے رہے۔ اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ سود میں ضائع کرتے رہے دوسری مصیبت یہ پیدا ہوئی کہ ان کے روزگار میں کشائش کے جتنے وسیلے سامنے آتے رہے یا تو ان میں ناکامی ہوئی یا اگر کامیابی ہوئی تو وہ وسیلے زیادہ ویرانہ قائم نہ رہ سکے اس لئے اپنی زندگی کے متعلق غائبانہ نظریہ میں روشنی اور امید کی کوئی جھلک باقی نہیں رہی تھی۔

اس کی تیرگی اصحاب عالم ماہر دی کے نام ایک خط میں انہوں نے اپنے مختلف وسائل امداد لکھا ہے۔ خاندانی ٹپن اور اس کے مقدمے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مدینہ مقرر کیا۔ اس کے وسیعہ نے چار سو روپے سال دہلی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے واپس علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے پھیلج گتھی پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ بچے یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی۔ اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دہلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس تک کو روٹی دے کر گڑبڑی۔ ایسے طالع مری کش اور من سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب میں جو والی دکن کی طرف بچ کر دوں یا درہے یا متوسط مر جائے گا یا مغزول ہو جائے گا۔ یہ دونوں امرواق نہ ہوتے تو کوشش اس کی دکانوں جاتے گی۔ اور والی شہر چھ کو کچھ نہ دے گا اور اچانا اگر اس نے کچھ ساو کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ اور ملک میں گدھے کے ہل بچھ جائیں گے۔

غائب کی کم نصیبی غائب کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے وظیفہ یا فتوح کرنے لئے ہر اس مقام پر کوشش کی جہاں سے انہیں کامیابی کی کچھ بھی امید دلائی گئی۔ انہوں نے ایسے لوگوں کے قصیدے لکھے۔ جو اگرچہ وایان ریاست تھے یا بڑے بڑے سرکاری عہدے دار تھے لیکن غائب جیسے نادور روزگار شاعر کے فکر و خیال کے لئے صحیح اور موزون موضوع نہ تھے۔ ان قصیدوں کے صحیح طلب سیر محمود، اکبر، جہانگیر، شاہ جہان اور خانناں جیسے لوگ تھے لیکن سخنوروں کی پایہ شناسی اور خود دینی کا یہ ذیل دور غائب سے بہت پہلے گزر چکا تھا۔ خانناں اور ذوالفقار خاں کی جگہ آکھنڈ، امین براء، بادشاہ اور کینٹنٹ نے لی تھی۔ اور غائب کو اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لئے انہی کا رخ کرنا پڑا۔

لیکن ان فرومایہ شیعوں سے ان کی پیاس کیا بجھ سکتی تھی۔ وہ زندگی میں جس سکون اور ضروریات سے جس فراغ کے طلبگار تھے۔ وہ میسر نہ آیا۔ ان کے رہواز فکر نے اپنے عہد کے تقریباً ہر قابل فکر میدان میں مدتِ عمر تک وود کی لیکن ان کا مقصد پورا نہ ہوا۔ انہوں نے اپنے زمانے کی ششما پایہ نادانی اور مرتبہ ناہمی کے متعلق جو درد انگیز خیالات جا بجا ظاہر کئے ہیں۔ ان کو محض شعراء تحیل قرار نہیں دینا چاہئے بلکہ وہ واقعات ہیں حقایق ہیں۔ روزگار کی ستم پوشی اور بھارتی اس بڑھ کر کیا ہوگی۔ کہ جو شخص قصاید میں غری کا ہم پایہ اور غزل میں نظیری کا ہم پایہ تھا۔ جو ششما میں فلسفی کے بہترین مثنوی نگاروں سے ٹکڑے کھاتا تھا۔ جو رباعیات میں عمر خیام اور سحابی استر آبادی سے کم نہ تھا۔ اور نثر میں ابوالفضل اور ظہور کی بہتر تھا۔ اسے تہتر برس کی عمر میں ایک خانخاناں اور ایک اکبر بھی نہ ملا۔ مغلیہ سلطنت نے ذوق کو خاقانی ہند بنا دیا۔ اور ان کے لئے ایک معقول تنخواہ اور جاگیر مقرر کر دی لیکن غالب کو وہ سلطنت صرف پچاس روپے ماہوار دے سکی اور وہ بھی تین چھ ماہ کی تنخواہ تھی جس سے زیادہ قیمت آج غالب کا ایک غیر مطبوعہ اردو خط پاسکتا ہے۔ اور جس سے چار گنا قیمت پر ہمارے زمانے میں غالب کے اردو دیوان کے ایک مصور ایڈیشن کا ایک ایک نسخہ بک چکا ہے۔

مشہور ہے کہ عرتی نے خانخاناں کی بیچ میں ترسٹھ شعرا قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ تھا

اے داشتہ در سایہ ہم تنغ و ظلم را

وے ساختہ آرایش ہم فصل و کرم را

در یاد دل اور قدر شناس خانخاناں نے ترسٹھ ہزار روپیہ دیا۔ غالب نے اسی زمین میں دوزلہ

بہادر والی ٹونک کی بیچ میں اُنتر شعرا قصیدہ لکھا۔ جو غری کے قصیدے سے کسی حالت میں

بھی کم پائیں لیکن غالب کو ٹونک سے غالباً اُنتر سو روپے بھی نہ ملے مشہور ہے کہ ناصر علی

سرہندی نے دو فقار خاں کی خدمت میں سات شعرا کی ایک مدحیہ غزل پیش کی تھی جس کا پہلا

شعر یہ تھا



اے شان جیدری زمین تو آشکار

نام تو در بزرگد کار ذو الفقار

ذو الفقار خاں نے صرف مطلع سن کر ناصر علی کو روک دیا اور کہا کہ مجھ میں مزید اشارہ کا صلہ ہے

کی بہت نہیں، ناصر علی کو جو کچھ ملا وہیں فقرا میں بانٹ دیا اور اپنی غزل کا قطع پڑھ کر چلا آیا ہے

ناصر علی تراز تو خواہد ترا دو بوس

اے ابرئیس برہمہ عالم گھر مبار

غائب نے اس زمین میں راجہ شیو دھیان سنگھ دلی الوریٰ محل میں چالیس شعر کا قصیدہ لکھا۔

الوریٰ ریاست کی خدمت میں غائب کے والد نے اپنی جان قربان کی تھی، اور راجہ شیو دھیان سنگھ

غائب کے قدروان بھی تھے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ الوریٰ سے غائب کو اس کامیو ال حصہ بھی ملا جتنا

ذو الفقار خاں نے ایک شعر کے صلہ میں ناصر علی کو دے ڈالا تھا ناصر علی صلہ لے کر فقرا میں بانٹتے

ہوئے گھر چلا آیا لیکن غائب کی زبان کو اس شکوے سے فراغ نصیب نہ ہوا کہ

نہ بخندہ شاسہ کہ با دم دہد بہر بار ز پل با دم دہد

کہ تاپلی انجا برا نگیرے زرش بگدایاں فرور پڑے

یہ ہر حال غائب کی مالی مشکلات کی داستان بڑی ہی درد انگیز ہے، اور غائب جیسے

نازک دل اور نازک دماغ شاعر پران مشکلات میں جو قیامت گزرتی ہوگی اس کا صحیح اندازہ آج

کون کر سکتا ہے۔

دلی کی ابتدائی زندگی غائب جب دلی میں آئے ہیں تو اس وقت ان کی مالی حالت غالباً اچھی

تھی۔ خاندانی پیش کے علاوہ بھی ادھر ادھر سے روپیہ مل جاتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس

زمانے میں بھی قرض لیتے تھے۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

بھائی! دین الدین احمد خاں دلی (لاہور) سے کہنا صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر تھوڑا

سے قرض لیا، ادھر دیاری مل کو جا مارا، ادھر خوب چنبچیں سٹی کی کوٹھی لونی، ہر ایک کے پاس



اس کی مقدار سات سو پچاس روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ تھی۔ یہ پیشینہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۶۰ء تک بند رہی تھی۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کو غدر شروع ہو گیا تھا۔ اور دہلی میں انگریزی حکومت کا کوئی ادارہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ستمبر میں غدر کا خاتمہ ہو گیا۔ نوغالب پر باغیوں کی اعانت اور چالپوسی کا الزام عاید ہو گیا تھا۔ تین برس کے بعد وہ اس الزام سے ہبرا ثابت ہوئے جو جمع شدہ روپیہ یک مشت لے گیا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غائب کی وفات کے بعد ان کی سگیم صاحبہ کو بھی اس پیشینہ میں سے گزارے کے لئے کچھ ملتا رہا یا نہیں۔

فد کی ملازمت | شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کی سفارش پر ۱۸۵۷ء میں غائب کے تیموری خاندانی کی تاریخ لکھنے کے لئے مقرر کیا تھا۔ اور نجم الدولہ، دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی۔ یہ تنخواہ آغاز جون ۱۸۵۷ء سے لے کر آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک ملتی رہی۔ یکم حسن اللہ خاں جمع و تحقیق سولہ پنج پر ماور تھے۔ وہ حالات لکھ کر غائب کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور غائب ان حالات کو اپنی بہار آفریں شہر کا جامہ پہنا دیتے تھے۔ غالباً ۱۸۵۷ء تک تاریخ کا پہلا حصہ جو ابتدائے آفریںش سے لے کر ہمایوں پادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا مکمل ہوا۔ اس کا نام مہر نیر فز گھٹا۔ دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی۔ اس کا نام غائب نے ”انیم ماہ“ رکھا تھا۔ لیکن اس حصے کو وہ ابھی شروع بھی نہیں کر سکے تھے کہ غدر کی آگ مشتعل ہو گئی جس کی وجہ سے تیموری خاندان کا رخت وجود ہی را کھ بن کر رہ گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ اس لئے میرزا خیال ہے کہ قلعہ سے غائب کو جو آخری تنخواہ ایصال ہوئی ہوگی وہ اپریل ۱۸۵۷ء کی ہوگی۔ گویا اس سلسلے میں غائب کو کل چاہنہ ایک سو پچاس روپے ملے۔

ملازمت سے ہٹ کر قلعہ | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ملازمت سے قبل بھی غائب قلعہ میں آئے جاتے تھے مختلف تقریبات پر بادشاہ کی خدمت میں قصیدے گزارتے تھے۔ اور خلعت پاتے تھے جو

مرحوم کے اس ارشاد کی تائید غالب کے کلیات سے بھی ہوتی ہے کلیات میں ایک قصیدہ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے جن کا انتقال ۱۸۳۷ء میں یعنی قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے سے تیرہ برس قبل ہوا۔ بہادر شاہ ثانی کی مدح میں غالب کے فارسی کلام میں دو مثنویاں، ایک ترکیبہ اور پندرہ قصیدے ہیں۔ نیز اردو میں دو قصیدے اور چند چھوٹے بڑے قطعات ہیں۔ ان سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قلعہ کے ساتھ غالب کا تعلق ملازمت سے پہلے بھی قائم تھا۔ لیکن یہ عرض کرنا مشکل ہے کہ ان قصاید کے صلہ میں کیا کچھ ملتا رہا اور خلعت کی حیثیت کیا ہوتی تھی۔

شش ماہ تنخواہ کا حکم قلعہ والی تنخواہ میں غالب کے لئے صرف ایک تہہ ناگوار صورت حالات پیدا ہوئی تھی یعنی حکم ہو گیا تھا کہ ملازمین قلعہ کو ماہ بہ ماہ تنخواہ ملنے کے بجائے چھ ماہ کی اکٹھی تنخواہ ملا کر غالب کی پوری زندگی مختلف النوع مالی احتیاجات میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے کسی ذریعہ آمد میں ایک لمحہ کا توقف بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے انہیں ششماہی والا حکم پر پُر تنگی نظر آیا۔ انہوں نے اس حکم سے ستھنے کئے جانے کے متعلق اردو میں ایک قطعہ لکھ کر بادشاہ کی بارگاہ میں گزارنا جس میں اپنی ضروریات و مشکلات کو نہایت موثر انداز میں بیان کیا تھا اور اس سے

مری تنخواہ جو مقرر ہے	اس کے ملنے کا ہر عجب نتیجہ
رسم ہر مردے کی چھ ماہی	خلق کا ہر اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں اقیہیت	اور چھ ماہی ہو سال میں بآ
بسکہ لیتا ہوں ہر عینہ ترنگہ	اور ہر تہی ہے سود کی نگرار
مری تنخواہ میں تہائی کا	ہو گیا ہے شرکیت سا ہو کا

آخر میں لکھتے ہیں :-

مری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ تانہ ہو مجھ کو زندگی و دشوار

اس پر غالب کے لئے ماہ بہ ماہ تنخواہ کا حکم جاری ہو گیا۔ بادشاہ کی طرف سے پچاس روپے ماہانہ کے علاوہ شہزادہ فتح الملک کی طرف سے بھی چار سو روپے سالانہ تنخواہ ملتی تھی لیکن شہزادہ کی وفات

کے بعد یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ وہ اس فتح سے دو برس سے زیادہ فتنہ اند  
 رہا ہو سکے۔

رام پور کا وظیفہ غالب کی زندگی کے آخری دس برس میں انہیں رام پور سے سو روپے ماہانہ مستقل طور  
 پر ملتے رہے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم فرما کر اسے رام پور اپنی صاحبزادی کے زمانے میں  
 تعلیم کے لئے دی گئی تھی۔ وہ غالب کے ساتھ نہایت گہرے دوستانہ روابط پیدا ہو گئے تھے۔  
 وہ مفتی صدر الدین آذرودہ سے عربی اور غالب سے فارسی پڑھتے تھے۔ غالب کے کہ اس طالب علمی کے  
 زمانے میں بھی غالب کے کچھ سلوک کرتے رہے ہوں۔ اس لئے کہ غالب عام معلم و مدرس تھے  
 نہ انہوں نے کوئی درسگاہ جاری کر رکھی تھی۔ اور نہ امیر زادوں کا یہ دستور تھا کہ کسی سے پڑھیں  
 اور اس کے ساتھ سلوک نہ کریں ۱۸۵۵ء میں نواب صاحب اردو شاعری میں غالب کے شاگرد  
 بنے۔ ان کے لئے ناظم تخلص تجویز کیا گیا۔ غالب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد ہونے کے بعد  
 وہ وقتاً فوقتاً کچھ روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ فرماتے ہیں :-

۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کے یہاں تھے قدیم ہیں میرے شاگرد ہو  
 ناظم ان کو تخلص دیا گیا میں کہیں نہیں اردو کی بھیجتے ہیں اسلحہ دے کر بھیج دیتا۔ گاہ گاہ کچھ

روپیہ دھرے آتا رہتا قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی فیشن کھلا ہوا۔ ان کے عطا یا یعنی نواب  
 نے عطا یا فخر گئے جاتے تھے۔ جب یہ دونوں تنخواہیں جاتی ہیں تو زندگی کا مدار ان کے عطیہ پر ہے۔

مستقل تنخواہ کا مطالبہ اندر کے بعد جب قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی۔ اور خاندانی فیشن بند ہو گئی تو غالب  
 نے ایک فارسی قصیدہ نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا جس میں گہرے دوستانہ روابط کا ذکر  
 کرتے ہوئے نواب صاحب کے تغافل کا شکوہ کیا گیا تھا۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے اس قصیدہ  
 کے چند اشعار یہاں درج کیے جاتے ہیں :-

چون نیست مرا شربت آبے ز تو حاصل دائم کہ تو در نیائی و من سبزہ حاصل

لے اردو سے ملے صفحہ ۱۱۔

در باد یہ برگو غم سرباں زچہ سوزد      آن شمع نرسد زان کہ بود و ز محفل  
زان خسرو خواباں چہ قدر حشیم و فابود      صد حیف کہ شد نقش امید ہمہ بطل  
افمانہ غم کبریا تم بنو عیب      بادوست کہ پیوستہ ہمہ بر غم از دل  
مے گویم و بہم دندم طعنہ کہ تن زن      چوں مے نہ بداد و ز نرسد یاد چہ حال

یارب چہ شد اینک کہ گیر خبر از من      بر بستہ برو نیم در بار سال بر سال

چون است کہ گاہے ز کنی روئے بدیں سحر      چون است کہ ہرگز نہ وہی گد یہ بہ سال  
گر جاں دہم از غصہ تو دانی کہ بہ گیتی،      حرف غلط از صفحہ ہستی شدہ زائل  
خواہی کہ مرا بس گری از دور بہ فرما      تا نزد تو آرند یکے طائر بسمل  
غالب بہن نام سن آمد ازل آورد      دانی کہ دریں شیوہ نیم عالمی جاں  
درفن سخن دم مزان از عرفی و طالب      ایں آئیہ خاص است کہ بر سن شدہ نازل  
من گنج و گردوں بہ گل اندودہ درم را      مے میں در گنج ارچہ کشودن شدہ مشکل  
خود و ز غور ویرانہ بود گنج گراں سند      غم نیست گراں بادی دہلی شدہ زائل  
ماروت فسون نفس گر چہ داند      اعجاز ز دہلی بود و حسرت ز بابل

اس کے بعد نواب صاحب کو توقع بریلی کی مبارکباد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نفی  
یا قاضی یا شخنے یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ماہ بہ ماہ  
پہنچتا رہے۔

اس قصیدے پر نواب یوسف علی خاں مرحوم نے سوروسپے ماہوار کا وظیفہ غالب کے  
مقرر فرمادیا جو ماہ بہ ماہ نواب صاحب خود غالب کو بھیج دیتے تھے۔ نواب یوسف علی خاں کی وفات  
کے بعد ان کے ہنرماس اور پایہ ہنرم جانشین نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی یہ وظیفہ بہر طور ادا

متفرق تھا یا اس مقررہ وظیفہ کے علاوہ بھی نواب یوسف علی خاں وقتاً فوقتاً متفرق زمیں بھیجتے رہتے تھے۔ غالب ۱۸۶۵ء کے ایک مکتوب میں سیف الحق بریاں دو خاں صاحب سراج کو لکھتے ہیں:

ایک قرن سے فروس مکاں نواب یوسف علی خاں والی رام پور اپنے اشعار میں پاس بھیجتے تھے۔ اور سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ سپیل ہندوی بھیجتے تھے۔ اس مغفور کی اندازہ والی دیکھئے کہ کبھی مجھ سے اس روپے کی رسید نہ لی۔ اپنے خط میں ہندوی بھیجا کرتے تھے میں خط کا جواب لکھ بھیجتا اس ماہانہ کے علاوہ بھی کبھی دوسو کھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد غدر کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود، انگریزی فٹن سردور۔ یہ بزرگوار دو چمقوری ماہ بہ ماہ اور فتح گاہ گاہ بھیجتا رہا تب میری اور میرے سوتیلوں کی زیست ہوئی۔

شاید کسی صاحب کے دل میں آخری لفظوں سے یہ شبہ پیدا ہو کہ نواب یوسف علی خاں شاگردی کے آغاز ہی سے سو روپیہ ماہانہ مستقل بھیجتے رہے۔ یہ شبہ صحیح نہیں۔ غالب نے خود میرزا آقہ کے نام کے خط میں تصریح کی ہے کہ مستقل وظیفہ جولائی ۱۸۵۹ء سے شروع ہوا۔ فرماتے ہیں :-

نواب یوسف علی خاں تیس برس کے میرے دوست۔ اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں آگے گاہ گاہ بھیج دیا کرتے تھے۔ اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینہ ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ سب سے رہتے تھے۔ اب میں لکھا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرط حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ سو روپیہ مہینہ ماہانہ رہوں یا دواں رہوں خدا کے اہل سے میرا مقرر ہے۔

نواب کلب علی خاں عہد اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی یہ وظیفہ جاری رکھا تھا۔ غالب لکھتے ہیں :-

ریس حال (نواب کلب علی خاں) کو خدا بہ دولت و اقبال ابداً موبہ سلامت رکھے۔ دو چمقوری

کی ہندوی ہر مہینے حسب دستور قدیم اپنے خط میں بھیجے جاتا ہے فتوح کی رسم دیکھئے جاری رہا نہیں

قاطع برٹن کی طرہ امت میں لداوا معلوم ہوتا ہے کہ غالب خود بھی خاص ضروریات کے سلسلے میں روپیہ طلب کر لیتے تھے مثلاً قاطع برٹن کی چھپائی کے لئے دو سو منگائے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

میرے پاس روپیہ کہاں جو "قاطع بران" کو دوبارہ چھپوانوں پہلے بھی نواب مغفور (نواب یوسف علی خاں) نے دوسروں سے بچھ دے پتے تھے۔ تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقررہ کے ساتھ دوسروں سے بچھیں گے۔ وہ (نواب صاحب) آخر اپریل ۱۸۶۵ء میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ نہیں حال سے میں نے پایا۔ بہرہف کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ مگر اس مرحوم (نواب یوسف علی خاں) کا سرشتہ دفتر سے نہ تھا جو ادر سے دفاتر کی اپنی اصلاح اشعار سے معذرت | غالب نے ایک مرتبہ اصلاح اشعار سے بھی معذرت لکھ بھیجی تھی۔ لیکن نواب صاحب کی طرف سے مقررہ وظیفہ بہ دستور پہنچا رہا۔ غالب میرزا آقہ کو لکھتے ہیں :-

رئیس رام پور سورویہ مینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ ان کو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم جو اس کا کام ہے اور میں اپنے میں جو اس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں جو کچھ مجھے سرکار سے ملتا ہے۔ عرض خدمات سابقہ میں شمار کیجئے۔ تو میں کہ لبرری ورنہ خیرت خود بھی۔ اور اگر یہ عطیہ بہ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے ان کا کلام نہیں آتا۔ فتح مقررہ نومبر تک آئی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ آج تک نواب صاحب اذراہ جو آمدی دئے جاتے ہیں۔

بعض اصلاح اشعار کی خدمت ہی معاف تھی۔ بلکہ رام پور جانے کی بھی پابندی نہ تھی۔ غالب خود فرماتے ہیں :-

حق تعالیٰ والی رام پور کو صدوسی سال سلامت رکھے۔ ان کا عطیہ ماہ بہ ماہ مجھ کو پہنچا ہے۔ گرم ستری اور آٹا پرووی کر رہے ہیں۔ میرے بچہ سفر اٹھانے اور رام پور جانے کی حاجت نہیں۔ رام پور میں قیام کے کرنے کی تمنا ہے | غالب صرف دو مرتبہ رام پور گئے۔ پہلی مرتبہ نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں جنوری ۱۸۶۶ء میں۔ دوسری مرتبہ نواب کل علی خاں کی مسند نشینی کی تقریب میں اکتوبر ۱۸۶۶ء میں رام پور میں ان کو مقررہ وظیفہ کے علاوہ سورویہ بنام دعوت ملتا تھا۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مینا ہے سورویہ۔ مجھے ماہ بہ ماہ بھیجتے



ہیں۔ اب جو میں دہاں گیا تو سوروپے میں بنا نام دعوت اور دیا یعنی ررام پور میں رہوں تو سوروپے

میں پاؤں اور دہاں میں رہوں تو سوروپے۔

اودھ کے ساتھ تعلقات سلطنت اودھ کے ساتھ غالب کے تعلقات و روابط کے متعلق ایک اقتباس  
ادیش کیا جا چکا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ واجد علی شاہ کی سرکار سے انہیں پہلے ملج گسٹری  
پانسورپے سالانہ مقرر ہوئے۔ لیکن واجد علی شاہ کی سلطنت اس وظیفہ کے تقرر کے بعد دوسرے  
سے زیادہ قائم نہ رہی۔ اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ پانسورپے سالانہ کا یہ وظیفہ ۱۸۵۳ء کے  
اواخر یا ۱۸۵۴ء کے اوائل میں مقرر ہوا تھا۔ ہم غالب کے سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھنؤ میں ٹھہرنے  
کے حالات بیان کر چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ لکھنؤ کے ساتھ غالب نے غازی الدین حیدر  
زمانے میں ۱۸۲۱ء میں تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ خواجہ حالی غالب کے قیام لکھنؤ کے  
متعلق لکھتے ہیں :-

اس زمانے میں نصیر الدین حیدر قمرانزاد اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے۔ اہل لکھنؤ نے  
کی عمدہ پردہ رات کی اور روشن الدولہ کے ہاں یہ عنوان شائستہ ان کی تقریب کی گئی مرسلے  
اس پر شانی کے عالم میں قصیدہ تو سراغ نام نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدحیہ نثر صنعت قیاس میں جو ان کے مسودات  
میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔

خواجہ حالی مرحوم کا سہ ماہم غالب کے لکھنؤ جانے کی تاریخ نہیں کر چکے ہیں۔ غازی الدین حیدر نے ۱۸  
ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو اس دنیا سے کوچ کیا۔ غالب اس سے قبل  
لکھنؤ سے گزر چکے تھے۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش خاں مرحوم والی فیروز پور چھڑکنا تھا  
ہو غالب کو یہ اطلاع کلکتہ کے راستے میں ملی تھی۔ اور اس وقت وہ محض لکھنؤ ہی نہیں بلکہ باندہ  
بھی آگے چل چکے تھے۔ لہذا یہ صحیح نہیں کہ وہ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لکھنؤ گئے۔

اس زمانے میں روشن الدولہ کے نائب السلطنت ہونے کا بیان تو اس درجہ حیرت انگیز

لے تاریخ اودھ حصہ چارم صفحہ ۲۰۴۔

کہ دل میں خیال پیدا ہوتا ہے خواجہ حاتمی نے غالب کے کلیات شرفا سی کو بالائے تیغاب دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ صنعتِ قِطیل والی جس نشر کا خواجہ حاتمی نے ذکر فرمایا ہے وہ کلیات کے صفحہ ۶۵ اور ۶۶ پر موجود ہے۔ اس نشر کی ترتیب کی داستان غالب خود ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے دوستوں نے رفتہ رفتہ میرا ذکر سید آغا میر کی بزم میں پہنچایا۔ جو معتمد الدولہ کے خطاب سے مشرف تھے ”وہ ترخانہ فرما کر دوائے آل کشور و مدار المہامی آل سلطنت اشتهار و اشتہار“ پھر لکھنؤ کے حالات رائے جمل کو لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ہرچہ وراں بلاد از کرم پٹنگی وین رسائی این گدا طبعی سلطان صورت یعنی معتمد الدولہ آغا میر شنیدہ سے شد بخدا کہ حال یکس است۔

اگر خواجہ حاتمی مرحوم کی نظر سے کلیات شرفا سی کے یہ حصے گزر چکے ہوتے یا ”یادگار“ لکھتے وقت یہ حصے انہیں متحضر ہوتے تو وہ کبھی یہ نہ فرماتے کہ غالب کے لکھنؤ جانے کے زمانے میں وہاں نائب سلطنت تھے یا صنعتِ قِطیل میں جوثر لکھی گئی تھی یہ روشن الدولہ کے لئے لکھی گئی تھی یا نائب کی تقریب یہ عنوان شائستہ روشن الدولہ کی بزم میں ہوئی تھی۔

یہ معلوم ہے کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں اور نصیر الدین حیدر کے ابتدائی دو برس میں وہاں نائب سلطنت نہیں بلکہ معتمد الدولہ آغا میر ہی نائب سلطنت اور مدار المہام تھے۔ سارے اختیارات کی باگ انہی کے ہاتھ میں تھی۔ معتمد الدولہ کی مغزولی کے بعد اعتماد الدولہ فیض علی مدار المہام و نائب سلطنت مقرر ہوئے انہی کے داماد نواب محمد علی خاں تھے جو کچھ مدت کے لئے بہادر شاہ پادشاہ کے بھی وزیر بنے تھے اور غالب کے ایک عزیز و دوست تھے۔ ان کے بعد حماد علی شاہی ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء میں نائب سلطنت کو منظم الدولہ حکیم ممد علی خاں نیابت و مدار المہامی پر مامور ہوئے۔ اس سے کم و بیش گیارہ ماہ قابلِ غاں کلکتہ ہو کر دروہاں دو برس رد کر دیے۔ چکے تھے۔ گرت ۱۸۳۲ء میں حکیم ممد علی خاں معزول ہوئے۔ اور نومبر ۱۸۳۲ء میں روشن الدولہ کو وزارت کا منصب عطا ہوا۔ غالب کے لکھنؤ جانے سے سواہل میں

۱۔ کلیات شرفا سی صفحہ ۶۵ ۲۔ کلیات شرفا سی صفحہ ۶۵ ۳۔ تاریخ دوہ صد چارم صفحہ ۲۵۵ ۴۔ تاریخ دوہ صد چارم صفحہ ۲۵۵ ۵۔ تاریخ دوہ صد چارم

جو شخص نیابت سلطنت اور مدارالمہامی کے منصب پر فائز ہوا اس کی نسبت یہ دعویٰ کیوں کر قبول کر جاسکتا ہے کہ غالب کے لکھنؤ جانے کے وقت نائب سلطنت تھا؟ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے میراجیل ہی ہے کہ خواجہ حالی نے نہ غالب کی تمام تحریرات بالامتیاعاب ملاحظہ فرمائیں۔ نہ ان اشخاص کے حالات کی تحقیق کی طرف توجہ فرمائی جن کا ذکر غالب کی تحریرات میں آچکا اور روشن کا نام انہوں نے غالباً اس بنا پر بلا تعلق لکھ دیا کہ نصیر الدین حیدر واسے قصیدے کے آخر میں روشن الدولہ کی مدح میں بھی چند اشعار موجود ہیں۔ حالانکہ فیضیہ غالب کے لکھنؤ جانے سے کم از کم پانچ برس بعد لکھا گیا ہوگا۔

سالمین اودھ کے قصائد | غالب کے کلیات نظم فارسی میں شایان اودھ کے لئے پانچ قصیدے ہیں اور ایک قطعہ ہے قصیدوں میں سے پہلا نصیر الدین حیدر کی مدح میں ہے چونکہ اس میں روشن الدولہ کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ بہر حال نومبر ۱۸۳۳ء کے بعد لکھا گیا ہوگا۔ دوسرا قصیدہ امجد علی شاہ کی مدح میں ہے تیسرا بھی امجد علی شاہ ہی کی مدح میں لکھا گیا تھا۔ لیکن غالب کی ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعد ازاں امجد علی شاہ کے بجائے واجد علی شاہ کا نام دخل کر دیا گیا تھا۔ بہر حال وہ واجد علی شاہ ہی کی بارگاہ میں پیش ہوا۔ بقیہ دونوں قصیدے واجد علی شاہ کی مدح میں ہیں قطعہ نصیر الدین حیدر کی شادی کی تقریب میں لکھا گیا تھا جس سے ۱۲۴۴ھ متخرج نکلتی ہے۔ میری تحقیق کے مطابق اودھ کے شاہی خاندان کے ساتھ غالب کے روابط کی پہلی کڑی یہی قطعہ ہے۔ غالباً یہی قطعہ ہے جس کے متعلق کلکتہ میں بیٹھے ہوئے مولوی کریم حسین صاحب سفیر شاہ اودھ مقیم کلکتہ کو لکھتے ہیں:-

آنچمن دریا بکارش ایں قطعہ دست مزوخیل سے نغمہ روشناسی خسروست۔ تشریف قبول  
دونہا التفات و عطیہ فتوح۔ اما کنش ظلم اس مدعا و گروان است کہ پا یہ مقام تاش گربہ  
حضرت مدوح شہرہ سے شہوتا بہ اندازہ ادزش دے عطا تواند کرد۔ ورنہ پیداست کہ جائزہ یاد خوانا

ناچہ قدرت۔

اس کے بنصرہ الدین حیدر کی طرح میں قصیدہ بھیجئے تاکہ غالب کی طرف سے اودھ کے ر  
رابطہ پیدا کرنے کی غالباً کوئی کوشش نہیں ہوئی

بنصرہ الدین حیدر کا قصیدہ | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قصیدہ نومبر ۱۸۳۲ء کے بعد لکھا گیا۔ اس نے

کہ اس میں روشن الدولہ کا بھی ذکر ہے جو نومبر ۱۸۳۲ء میں وزیر اعظم ہوئے۔

روشن الدولہ بہادر کہ بہار و عطا  
برکبند ہر یکیاں ہر سر زرشک  
چو شاخاں شناسش برآناں رفتم

پادشاہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔

توسلیمانی و آل آصف دمن و ضعیف  
راہ نسبت طلبی ہیں کہ چو شاخاں رفتم  
بدیم پسو بنویس براقم بروے  
تا بد انم کہ بہ آصف ز سلیمان رفتم  
سبحان علی خاں قوم کے کہناس زمانے میں ایک نہایت فاضل اور دانشمند شخص تھے جو  
مستند الدولہ آغا تیس کے مشیر خاص رہ چکے تھے اور روشن الدولہ نے بھی اپنے زمانے میں انہیں  
اپنا مشیر خاص بنالیا تھا۔ غالب اسی قصیدہ کے متعلق سبحان علی خاں کو لکھتے ہیں:-

ایں عرضہ شہت بہ فروغ نگاہ قبول آصف ثانی در روشن الدولہ مشرقاں گرد و اقصیہ  
بہ زم زمیو شمال سلیمانی (بنصرہ الدین حیدر) خوانہ شود تا مرا کہ سخن ہیوندت نش نگارم بہ جائزہ  
خسروی رخ امتیاز فروزش پذیر و، و انکحہ صلہ بدال گونا گئی کہ ہم ہم ہر بند نامی و ہم و ظفر  
خویش گرامی کند۔

سبحان علی خاں کے نام غالب کے مکاتیب فارسی میں دو اور خط ہیں جن میں سے ایک  
میں لکھتے ہیں کہ قصیدہ اور عرضہ شہت مدت سے آپ کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ یہ بھی سن چکا ہوں  
کہ وزیر اعظم نے اس قصیدے کو بہت پسند کیا، لیکن یہ معلوم نہ ہوا کہ قصیدہ بارگاہ شایان پنجاب  
لے گیا یا نہ لے گیا۔

لے گیا یا نہ لے گیا۔

نشی محمد بن خاں صاحب کو بھی اسی قصیدے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ اگر صلہ مل جائے  
تو میں قصیدہ کی پیروی کے لئے دوبارہ کلکتہ جانے کا سامان کروں گا۔

پانچ ہزار کا صلہ متوسط کھا گئے اردو کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدہ پر پانچ ہزار روپے  
لے تھے لیکن تین ہزار روپے روشن الدولہ نے ہضم کر لئے جسے غالب ایشار و عطایں حاتم  
کہنا بھی اس کے پایہ سے فروتر سمجھتے تھے اور جس کی جو دو سخا کی داستان برکیوں کو سنائے  
انہوں نے زہر کھالیا تھا۔ دو ہزار نشی محمد بن کو دیئے اور کہا کہ ان میں سے جو کچھ مناسب سمجھیں  
غالب کو بھیج دو لیکن غالب کو ایک جہ بھی نہ ملا۔ وہ لکھتے ہیں :-

یہ قصیدہ نشی محمد بن کی معرفت روشن الدولہ کے پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین  
کے پاس گزرا جس دن گزرا اسی دن پانچ ہزار روپے بھیجنے کا حکم ہوا متوسط یعنی نشی محمد بن نے  
مجھ کو اطلاع دی منظر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے انہوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا۔ اور کہا خدا  
واسطے نشی محمد بن کو سبیل نام نہ لکھا۔ ناچار میں نے امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے  
لکھو کہ میرے قصیدہ پر کیا گزری۔ انہوں نے جواب لکھا کہ پانچ ہزار روپے لے تین ہزار روپے  
روشن الدولہ نے کھائے دو ہزار نشی محمد بن کو دیئے اور فرمایا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو  
غالب کو بھیج دو۔ کیا اس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپے بھی نہیں ملے  
اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو اس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے پادشاہ  
کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر نہیں جانا  
کہ اس کا صلہ کیا مرحمت ہوا میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا خط پادشاہ کو بڑھوا کر ان کا روشن الدولہ  
دفترہ کا کھایا ہوا روپیہ ان کے حق سے منہاں کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی! یہ خط لکھ کر میں نے  
ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا تیسرے دن شہر میں خبر آئی کہ نصیر الدین مر گیا۔ اب کہو

لے کا بیات نشر فارسی صفحہ ۱۷۶ منظر الدولہ سیف الدین خاں رتلف اکبر نواب حسام الدین حیدر خاں ببادشاہ  
جو غدار کے بعد اوردے پہنچے آئے تھے اور گورکھ نوازہ میں گولی سے مارے گئے تھے۔

میں کیا کروں اور نتائج کیا کرے۔

یہ اس نامور لوجو شخص، آخری دو کے سب سے شاعر، پرانی طرزوں کے خاتم اور نئی طرز کے موجد اول کی حالت تھی۔ کہ اس کا جو قصیدہ فارسی زبان کے بہترین شعرا کے بہترین قصائد کے مقابل میں بلا تامل پیش کیا جاسکتا ہے اس پر شاہ اودھ پانچ ہزار انعام دیتا ہے لیکن سارا روپیہ تھوڑے ہضم کر جاتے ہیں اور اس غریب کو پلوں پیسے بھی نہیں ملتے۔ بلکہ صلہ یا بی کی اطلاع بھی دوسرے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔

امجد علی شاہ کا قصیدہ نصیر الدین حیدر نے ۱۸۳۳ء میں وفات پائی اور محمد علی شاہ پادشاہ ہوئے لیکن غالب نے ان کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا نہ کیا۔ امجد علی شاہ کا زمانہ آیا تو پھر انہوں نے ایک قصیدہ لکھا جس کی بیت اس میں ہے

امجد علی شاہ آنکہ یہ ذوق دعائے او

صدرہ نماز صبح تضرع کر دروڑ نگار

اس قصیدہ کے سلسلے میں بھی عجیب واقعہ پیش آیا۔ غالب جس زمانے میں آگرہ میں تھے ایک صاحب ان سے ملے تھے۔ جو بڑے زبان آور اور چالاک تھے۔ وہ کہیں تحصیلدار رہ چکے تھے۔ آگرہ میں ملازمت کی جستجو کی لیکن کوئی صورت نہ بنی اور وہاں سے چلے گئے۔ غالب مدلی میں آ رہے۔ کافی مدت کے بعد امجد علی شاہ کے زمانے میں لکھنؤ سے ان کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ وزیر سے ملاہوں بہت عنایت کرتے ہیں۔ پادشاہ کی ملازمت انہیں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے، خان اور بہادر کا خطاب ملا ہے۔ مصاحبوں میں نام درج ہوا ہے۔ وزیر آپ کا بہت مداح ہے۔ اگر آپ قصیدہ اور عرضداشت بھیجیں تو پادشاہ آپ کو بلائیں غالب لکھتے ہیں کہ قصیدہ تیار تھا لیکن

مسترد تھا کس کی معرفت بھیجوں تو کلت علی امجد اس شخص کے پاس بھیج دیا یہ سیدھی رو

بعد ایک خط آیا کہ قصیدہ وزیر یک پہنچا۔ وزیر پڑھ کر بہت خوش ہوا، یہ آئین شائستہ پیش کرنے کا وعدہ کیا میں متوقع ہوں کہ یہاں بدرالدین نمرکن سے میری نثر خطابی کھدوا کر بھیج دیجئے۔ چاندی کا گینتہ میں اور قلم حلی فیکسے سر انجام کر کے بھیج دیا۔ رسید آئی اور قصیدہ کی بادشاہ تک گزرنے کی نوید پس پھر دو مہینے تک ادھر سے کوئی خط نہ آیا میں نے جو خط بھیجا اُس پھر آیا۔ ڈاک کا پتہ قریح کہ مکتوب الیہ یہاں نہیں۔ ایک مدت کے بعد حال معلوم ہوا کہ اس بزرگ کا وزیر یک پہنچا اور حاضر دہناج۔ بادشاہ کی ملازمت اور خطاب ملنا غلط ہوا درسی کی نثر تم سے حاصل کر کے مرشد آباد کو چلا گیا۔ چلتے وقت وزیر نے دو سو روپے دیئے تھے۔

گویا قصیدہ بھی بے صلہ رہا۔

واجد علی شاہ سے تعلق | واجد علی شاہ کے زمانے میں غالب نے پھر سلسلہ جنیانی کی شاہ موصوف کے مصاحبوں میں اس وقت ڈدموں کا بڑا زور تھا اور انہیں بڑے بڑے خطاب ملے ہوئے تھے مثلاً رضی الدولہ، نجیب الدولہ، قطب الدولہ، ولج الدولہ، غالب نے قطب الدولہ کی دستا سے قصیدہ واجد علی شاہ کی بارگاہ میں بھیجا۔ مولانا ضمیر نے قصیدہ بارگاہ میں پڑھا حکم ہوا کہ اس کے صلہ کا سناہ دوسرے وقت میں پیش کیا جائے لیکن ابھی صلہ کی نسبت کچھ طے نہیں ہوا تھا کہ قطب الدولہ اور دوسرے تمام ڈوم واجد علی شاہ کی مصاحبی سے نکالے گئے۔ ان کے اخراج کا واقعہ ۲ جون ۱۸۵۷ء کو پیش آیا۔ لیکن یہ امر قابل ذکر ہے کہ قطب الدولہ نے اپنے اخراج پر قصیدہ مع عرضداشت بجنہ غالب کے پاس بھیج دیا۔ نواب محمد علی خاں عرف میرزا حیدر کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قصیدہ مع عرضداشت دوبارہ ان کی وساطت سے بھیجا گیا تھا۔

میرزا علی | یوسف میرزا کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو واجد علی شاہ کے دربار سے خلعت مجتہد العصر کی وساطت سے ملا تھا وہ فرماتے ہیں:-

میں چودہ پارچے کا خلعت ایک بار اور ملبوس خاص در و مال دو و شالہ ایک بار پہنچا

لے تاریخ اودھ ص ۱۶۷ صفحہ ۲۰۷ کلیات شرفا سی صفحہ ۲۲۰ کلیات شرفا سی صفحہ ۲۲۰۔

حضرت سلطان عالم سے پا چکا ہوں مگر یہ بھی جانتے ہو وہ غفلت مجھ کو دوبار کس کے ذریعہ  
 دیا ہے؟ یعنی جناب قبلہ و کعبہ بنجد العصر منظر اللہ العالی۔ اب آدمیت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ  
 بنے ان کے توسط کے مدح گسٹری کروں۔ چنانچہ قصیدہ لکھ کر اور جیسا کہ میراد سطور ہے کاغذ کو بڑا  
 حضرت پروردگار کی خدمت میں بھیج دیا ہے یقین ہے کہ حضرت نے وہاں بھیج دیا ہوگا۔ اور میں  
 تم کو بھی لکھ چکا ہوں کہ میں نے قصیدہ لکھ کر بھیج دیا ہے۔

یہ خطہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کا ہے۔ اور یوسف میرزا اس زمانے میں کلکتہ میں تھے۔ واجد علی شاہ  
 ۱۸۵۶ء میں سلطنت علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت اودھ کے  
 ختم ہو جانے کے بعد بھی واجد علی شاہ کے ساتھ غالب کا تعلق قائم رہا۔ یوسف میرزا کے نام  
 کے ایک اور خط سے بھی جو ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء کا مرقوم ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے اس میں ہیں  
 ہر تہائی علی پہلے سے نیست میں ہے کہ جوشہ اودھ سے لٹھ آئے حصہ برادرانہ کروں نصف  
 حسین میرزا اور تم اور سجاد نصف میں نفیسوں کا مدار حیات۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کلکتہ سے واجد علی شاہ نے کبھی کوئی رقم بھیجی یا نہ بھیجی۔

حیدر آباد سے تفتی | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ صاحب عالم مارہروی نے عذر کے بعد لکھا تھا کہ گول  
 حیدر آباد سے رواج پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ لیکن غالب نے اپنے طالع کی ناسازی  
 اور ناکامیوں کی داستان بیان کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی تھی کہ حیدر آباد میں کوشش  
 کی جائے گی تو یا تو متوسط مر جائے گا یا مغزول ہو جائے گا یا مقصد میں ناکامی ہوگی بالضرر  
 اگر کچھ مقرر ہوگا تو ریاست بر باد ہو جائے گی۔

شمس الامرا کا قصیدہ | لیکن غالب نے کوشش کی۔ اس کی تقریب یہ ہوئی کہ مدنیہ منورہ کے ایک  
 صاحب جن کا نام عبدالرزاق تھا حیدر آباد ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ انہوں نے بیان کیا کہ وہ  
 شمس الامرا بہادر والی پائیگاہ کی محفل میں غالب کا ذکر آیا تھا بس یہی امر غالب کے لئے تعلقات  
 پیدا کرنے کا محرک بن گیا۔ چنانچہ انہوں نے ۷ شعرا کا ایک قصیدہ شمس الامرا کی مدح میں لکھا



ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی حیدرآباد بھیج دیا۔ مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ابتدا میں اردو شعر کہتا تھا۔ اور ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ اب تیس برس سے صرف فارسی شعر لکھتا ہوں قصیدہ کے متعلق فرماتے ہیں :-

چہ قصیدہ از سینہ کتاب غم وراں آفتن افروخت نیم سوختہ آسپے و از خرمنے کہ ہوتا آن  
پاک سوخت دو واندہ گیا سہ۔ فرخا بخت عریضہ نگار کہ در تہا یہ چہ ہدایت قبول روزے چند  
دل بہ شادمانی ہند و دیں تنہائی واد ہدی خوش و ہدے

بہ اتفاقات نیزم در آرزو چہ نزل  
نشاط خاطر نفس زکیمیا طلبی است

اس فارسی قصیدہ کے صرف دو شعر مکتوب میں درج ہیں نہ یہ غالب کے کلیات نظم فارسی ہیں  
موجود ہے نہ سبچیں میں ہے۔ اور نہ کسی اور جگہ شائع ہوا ہے۔ نہ یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ کیسے  
ضائع ہوا و شعر یہ ہیں :-

انے بھل در ازل آثار کرم منت بہ سر لوح زاسم تو قلم را

شمس الامرا کثر شرف نسبت نامش خور قبلہ بد اورنگ نشینان عجم را

مکن ہے خاندان شمس الامرا کے پرانے کاغذات میں سے غالب کا قصیدہ مل جائے  
اگر کوئی صاحب اسے تلاش کر سکیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ شمس الامرا کی طرف سے قصیدہ کا کوئی صلہ ملا یا نہ ملا۔

سربلار جنگ کا قصیدہ اس کے بعد غالب نے نواب فتحار الملک سربلار جنگ اول کی مدح میں قصیدہ

لکھا۔ فارسی مکتوب میں ایک عرضداشت نواب صاحب حوم کے نام موجود ہے جس میں لکھتے ہیں :-

قصیدہ جیہ فرستادہ باشم و نہ دانستہ باشم کہ بنظر گاہ خدا نکاح گزشت یا خود عریضہ در عرض

راہ غفلت گشت۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کب یہ قصیدہ نواب فتحار الملک کی خدمت میں بھیجا؟ غالب کے جس

مکتوب یا عرضداشت کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ اس پر تاریخ ثبت نہیں لیکن مکتوب کے آخر میں تحریر  
 تاجرخ کشد محمل بر جیس بقا باد  
 نواب فلک محمل بر جیس شیم را

یہ نواب وزیرالدولہ والی ٹونک کے قصیدہ کا دعائیہ شعر ہے۔ اور تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا  
 ہے کہ قصیدہ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں نواب وزیرالدولہ کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ لہذا  
 سمجھنا چاہئے کہ نواب مختارالملک کا قصیدہ نواب وزیرالدولہ کے قصیدے کے بعد لکھا گیا۔

اسی زمانے میں ایک مکتوب منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو بھیجا گیا تھا جو نواب  
 مختارالملک بہادر کے میرنشی تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غائب اپنے اردو دیوان کا ایک  
 نسخہ موم جامہ میں لپیٹ کر نواب مختارالملک بہادر کو بھیجا تھا۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا نے اس کی  
 رسید بھی اود فارسی کلام طلب کیا۔ غائب کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ فارسی کلام غالباً نواب صاحب کے  
 ایسا سے طلب کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا کلام غدی میں ضائع ہو گیا۔ میرے ایک عزیز نے بہ ندرت  
 پنجاہ جزو کے قریب حج کیا میں اب اسے چھپوانے کی فکر میں ہوں لیکن چھپائی کے مصارف  
 نہیں کر سکتا۔ اسی خط کے آخر میں فرماتے ہیں :-

آں خواہم کہ رسیدن و فارسی دیوان اردو بازداغ و وزیر بدائتم کہ طلب کلیات فارسی چنانکہ  
 گمان بروہ ام بہ فرمان حضرت نواب صاحب القاب است یا میں انجانب جناب صیغہ طراد  
 ہر دو صورت فرمان پذیری آئین خواہد بود و ہمسام با لوف الاخرام شنبہ یازدہم ربیع الاول ۱۲۶۵ھ

اردو دیوان کے دو ایڈیشن غدر سے پہلے چھپ چکے تھے۔ تیسرا ایڈیشن محرم ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں نواب  
 مطیع احمد نے چھپا تھا۔ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں اور غلط نامہ ساتھ شامل کرنا پڑا تھا۔ اسی ایڈیشن کی تصحیح کے لیے  
 چوتھی بار مطیع نظامی کانپور میں چھپوایا گیا۔ اور دوسری مرتبہ میں چھپ کر ضائع ہوا۔ منشی حبیب اللہ خاں ذکا میرنشی نواب مختارالملک  
 اردو دیوان کے پارسل کی رسید بھیجتے ہوئے فارسی کلام طلب کیا تھا جس کے جواب میں غائب ۱۲۶۵ھ ربیع الاول ۱۲۶۵ھ مطابق  
 کہ فارسی کلام چھپنے کی فکر میں چھپ جانے کے بعد بھیج دوں گا۔ اس خط کے بعد نواب مختارالملک کو احمدی مطیع والا دیوان بھیجا گیا۔

نبی کی اپنی داستان | نواب مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ لکھا گیا۔ اس میں غالب اپنے متعلق  
 قلم ہیں ۛ

روشن دل آتشیں زباں تم	از دود و دود ماں نگو تم
در نظم لب لباب زبدم	والا فی حنا ندان نگو تم
عشق است تلمیذ و آذری را	از سبب وادار سلاں نگو تم
والا گرا سپہر جاہا	اینہا از رہ گمان نگو تم
تنگ است دل از هجوم اندو	میرم اگر آنچنان نگو تم
کس نیست متلع را خریدار	با آنکہ بسا گراں نگو تم
زماں رو کہ خرد و ران گیتی	رنجند چو تندرداں نگو تم
ناچار متلع غرضہ دارم	بے رونقی دکان نگو تم
سرمایہ ز دوست رفتہ و انگاہ	کجا ہے سخن از زیاں نگو تم

حسن طلب ملاحظہ فرمائیے ۛ

امید کہ جس نہ سوال نبود	حسے کہ دیں میاں نگو تم
تنگم ز سوال نیست اما	با کلم سبب زباں نگو تم
گردا یہ رسد بہن ز سوت	با غالب خستہ جاں نگو تم
کماں خود ز من بہت نا نواز	باوے سخن از توان نگو تم

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نواب مختار الملک بہادر نے غالب کے ساتھ کچھ سلوک کیا یا نہیں کیا۔

ذیلہ دولہ والی ٹونک کی مدح | غالب کے دو قصیدے نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کی مدح میں ہیں۔

تاریخ ٹونک معلوم ہوتا ہے کہ پہلا قصیدہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس وقت

غالب کی عمر پچھٹپنٹھ برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے بڑھاپے کا ذکر قصیدے میں بھی کیا ہے

فرماتے ہیں ۛ

ہر چند پیری شدہ دل سرور مہستی  
 از سروی موسم چہ زیاں گر می نام  
 دارم نفس گرم در اندر وہانی  
 از بہمن دوسے تب نرو و شیراجم را  
 بر نانی اگر رفت نہ آنست کہ بر من  
 حقے بنود پرورش آموز ہوسم را  
 فتح دم پیری کہ کند در نظر مہوار  
 خوبان متطلعت و ناہنیکم را  
 پشتہ سوئے سجدہ زخم راہ نماید  
 بارست گراں منت غواری ختم را  
 با پشت خم آسودہ توان ریت گیتی  
 اما کچہ نسیم کج روی بخت و ظم را  
 جادو دو جہاں آنقدر نمیت کہ وقتے  
 بیرون نسیم از وارہ یاس قدم را

اس قصیدے میں ایک غزل بھی کہی ہے جس کے چند اشعار برج ذیل ہیں :-  
 در ہند تنک مایہ جو زند نکوایاں  
 یارب بچہ تسلیم برم فوق ستم را  
 شیرینی جاں پر لب من موج زد اما  
 ایں شہد شہر و از دہنم تلخی ستم را  
 آسودہ دلاں چوں شنوند آہ و فغانم  
 دانند کہ من مرد نیم رخ و الم را  
 غافل کہ ہم از ہول نگوناری بخت است  
 ایں شہد شہر و از دہنم تلخی ستم را  
 غم خست و درون من و فغانا بآں ختم  
 فریادگر از لب جہدار باب ہسم را  
 در سرمہ فروختہ گدایانہ جزو شیت  
 بچشم روا داشت بروں داون ختم را  
 در سر مہ فروختہ گدایانہ جزو شیت  
 پیش آمدہ روز سیبہ حرف رقم را

آخر میں فرماتے ہیں :-

گفتہ کہ گدا تم ز گدایاں نہ شماری  
 در ہم نفساں نیز بوی نفس تو ہم را  
 ہر چند بہ دریوزہ عزت ز عزیزاں  
 با خود بہ شفاعت توال بر دہتم را  
 سو گند غورم کہ پسند و غ گرویش  
 فیض از دم سو گند رسد صبح دوم را  
 من دایہ ز شہ جویم و شہ معرفت از من  
 بیخ جا کشیکول من است انسر جم را  
 ہنگام گدائی فتدا ز شرم سوا الم  
 لعل گسار از لڑنہ ز دوست ال کرم را

تایخ نوٹنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصیدے کے صلیب میں تاخیر ہو گئی، تو غالب

قطعہ بھیجا جسے خواجہ حالی مرحوم نے "یادگار" میں ہجو بیچ کی مثال کے طور پر نقل فرمایا ہے۔ اور جو غائب کے مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں لیکن "سب حین" میں موجود ہے میری رائے میں قطعہ محض "ن" طلب کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ نوٹا کے معلوم ہوتا ہے کہ اس قطعہ کے بعد غائب کو سالہ بھیجا گیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کس قدر بھیجا گیا تھا۔

غائب کے کلیات میں نواب وزیرالدولہ بہادر کی مدح میں ایک اور قصیدہ بھی ہے۔ عجمیہ نسخہ کی تقریب میں بھیجا گیا تھا۔ اس قصیدے کے دعائیہ اشعار کا انداز بہت اچھا اور دلکش ہے فرماتے ہیں ۵

چند چیز است کہ در شگاہ اہل تہیز	بہ گرانگاہی آرایش گہاں آمد
آں درخندہ درفشے کہ بفرمائیے عرب	وز زمان عمر آؤشکر ایراں آمد
آں فرورندہ و فیروز دول افروز نگین	کہ روانی وہ منبر ان سلیمان آمد
دیگر آں جامہاں ہیں کہ بہ روشن روشنی	عالم منور و نراز مہر و خشاں آمد
دیگر آں تخت سبک ہے کہ از تیز روی	ہمد م باد چوبوئے گل و ریحاں آمد
ہفت گنجینہ پرویز کہ در ہفت تسلیم	بہ نموداری ہفت خستہ تاباں آمد
فہم ہر نکتہ غامض کہ ہمیشہ فرمود	فیض ہر آیت رحمت کہ بہ قرآن آمد
یار بایں ما بہ تو بخشد و برآں منراہند	و م آہے کہ ز سر چشمہ حیاں آمد

نجل حسین خاں الی فرخ آباد مسلمان ریاستوں میں اس زمانے میں ریاست فرخ آباد بھی خاص اہمیت رکھتی تھی یہ ریاست بلش خاندان فرخ سیر کے عہد میں قائم کی گئی اور غدر میں بر باد ہوئی۔ اس کے والی نواب نجل حسین خاں کے ساتھ غائب کے روابط بہت اچھے تھے۔ اردو کی ایک نزل کے آخر میں نواب صاحب مدح کی مدح میں ایک قطعہ موجود ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ۵

یادگار غالب صفحہ ۸۳۵ بہ حوالہ رسالہ "روان" بابت جون ۱۹۳۵ء۔

دیا ہے غن کو بھی تا اسے نظر نہ لگے  
بنا ہے عیشِ تحملِ حسینِ خاں کے لئے

تجمل حسین خاں نے ایک مرتبہ غالب کو فخر آباد بھی بلا یا تھا۔ فارسی سکاتیب میں ایک مکتوب میر محمد حسین خاں میکیش کے نام ہے جس میں لکھتے ہیں کہ امیر سلطان شکوہ نصیر الدین ملک تجمل حسین خاں بہادر شمت جنگ فخر آباد بلا رہے ہیں میں نے ان کی محبت کے تقاضے سے جانا منظور کیا ہے اور تمہیں بھی میکیش کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ لہذا پاٹودی سلسی ہفتے دہلی پہنچ جاؤ۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ غالب فخر آباد گئے یا نہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً فخر آباد سے کچھ نہ کچھ ضرور ملتا رہا ہوگا۔

الور کے ساتھ روابط ایاست الور کے ساتھ غالب کے روابط بہت دیرینہ تھے۔ خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب کے والد کی ناگہانی شہادت پر راجہ بختاورد سنگھ نے دو گنا قسیر حاصل اور کسی قدر روزِ غالب اور اس کے بھائی کے لئے فکر کر دیا تھا جو مدت دراز تک جاری رہا۔ لیکن کسی دوسرے ذریعہ سے اس معاش کی تصدیق نہیں ہوئی۔ اور غالب نے کہیں اس معاش کا صراحتاً ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اپنی ہر چھوٹی بڑی آمدنی کا بلا تخلف ذکر کرتے رہے۔ نہ اس معاش کی بندش کی وجہ خواجہ حالی نے بیان فرمائی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو ابتدا سے ورود دہلی میں وقتاً فوقتاً اور سے کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ وہ خود فرماتے ہیں :-

صاحب وہ زمانہ نہیں کہ ادھر تنہا اس سے قرض لیا ..... اس سے بڑھ کر یہ

کہ روٹی کا قرض خرچ کے سہاویں ہمہ بھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلا دیا

گل کیوڑہ کا عطیہ | مہاراجہ راؤ بھنی سنگھ سے نام غالب کے فارسی سکاتیب میں ایک مکتوب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ نے کیوڑہ کے پھول غالب کو تحفہ بھیجے تھے۔ غالب نے ان کی تعریف

لے لیا تا شرفادسی صفحہ ۲۱۱ء یادگار غالب صفحہ ۱۱۱ء اردو کے معتد صفحہ ۳۳۹ء مہاراجہ راؤ بھنی

۱۸۱۵ء سے ۱۸۵۶ء تک الور کے رئیس رہے ۱۲۔

میں ایک منشی لکھی جو محلہ بالا مکتوب میں برج ہے اور ان کے کلیات نظم میں نہیں آئی فرمائیے

خوشا کا دیوی دبوئے جاں پرورش	زخو کا ہر پرواز بوشپرش
شمیم رواں پرورش داود اند	وگر صورت شمشیر داود اند
ازاں دوست کایں گل نیش شمیم	نذیباست منت پرست نسیم
تو گئی بہار ان سرخندہ خوئے	کہ رستم زنگ است و قسام جو
پے تازہ گلہائے اُردی بہشت	برات رواں بخشی بو نوشت
شمسے کزاں تازہ گرد و داغ	فزون آمد او طرٹ گلہائے باغ
نگہداشت آں مایہ دلفروز	یہ کاوی بہ بخشید اندر تموز
تموز از دمش نو بہاراں شدہ	شرف نامہ روزگار اں شدہ
اگر عور را رخت شادی ہوو	ز اکسوں گلہائے کاوی شود
شمال و صبا پیشکارش بہ باغ	گل از شبنم آئینہ دارش بہ باغ
بدیں ارغوانے کہ فرخ دم است	چنین تازہ برگے دین جاگم است
بدانساں کہ جاں رہست از تن سپاس	فرستندہ را باد از من سپاس
بود تاکہ زیب بساط سپہر	ز سرین ماہ گل سرخ ہر
ہر آں گل کہ آرد بہ گلزار باد	مہاراجہ را وقف و ستار باد

گل کیوڑہ کا تحفہ بھیجنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے ساتھ غالب کے روابط میں

دوستی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔

الور کے مسلمان دیوان انشی میں اللہ خاں دیوان الور کے بھائی منشی فضل اللہ خاں کے نام لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ان کی طرف سے کیا تھا کہ ان کی طرف سے کوئی عرضداشت مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوئی حالانکہ غالب نے کوئی عرضداشت نہیں بھیجی تھی منشی فضل اللہ خاں کو لکھتے ہیں کہ بھائی پوچھ کر لکھو یہ عرضداشت کون لایا تھا تیسرا خط میرزا اسفندیار بیگ دیوان الور کے نام ہے جس میں میرزا صاحب کے دیوان

بننے پر ہمارا کیا ہوئی گئی ہے۔ نیز ان کے حسن انتظام کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-  
 ترانگاں راہہ بینی بشارت و تہدستان را بچہ پیش صلا - دادگری را در بازار خواہم بود  
 فردوسی را گری ہنگامہ بیابان ہانگستان را خواہد شد و من ہاچمن ہا - مرا کہ گوشہ نشینم و چون چشمم  
 ازاں فرخ انجن دور با کشور و اہل کشور چہ کار و روز آبادی ملک دادا و گی خلق چہن ..... آخرا  
 دیریں بندگان اں دولتم و از کہن خاک نشینان اں در کاہہ شکست کہ چوں اساس کار بہن  
 و نیش دودا و ہند گرشہ و توشہ دیرینہ من بہن باز دہند۔

راجہ شیردھیان سنگھ ہمارا راجہ راؤ بینی سنگھ نے ۱۸۵۵ء میں انتقال کیا۔ ان کی جگہ ان کا بیٹا راجہ  
 شیو دھیان سنگھ منشی ہوا۔ منشی کے وقت اس کی عمر کم تھی۔ ہمارا راجہ راؤ بینی سنگھ کے عہد  
 میں منشی امین اللہ خاں دیوان بنے تھے اور میرزا اسفندیار بیگ نائب دیوان تھے لیکن ان  
 دونوں میں باہمی کشمکش شروع ہو گئی۔ ایک وقت میں منشی امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں  
 پر عتاب نازل ہوا۔ دوسرے وقت میں میرزا اسفندیار بیگ معتبوب ہو گئے۔ راجہ شیو دھیان سنگھ  
 کی منشی کے وقت منشی امین اللہ خاں ہی مختار تھے۔ اسفندیار بیگ نے انتقام کے جوش میں  
 راجہ پوتوں کے ساتھ ساز باز کیا۔ اور کہا کہ تمام کاروبار مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ راجہ  
 انہی کی صحبت کو پسند کرتا ہے، اگر یہ صورت حالات قائم رہے گی تو راجہ مسلمان ہو جائے گا۔ راجہ  
 نے اس پر ہنگامہ برپا کر کے منشی امین اللہ خاں اور ان کے بھائیوں کو گرفتار کر لیا  
 لیکن راجہ کے اصرار پر دونوں بھائیوں کو دہلی بھیج دیا گیا۔ پولیس اکیڈمی کو ان واقعات کی اطلاع  
 ملی تو اس نے حالات کی اصلاح کے لئے راجہ کو ہوشیار ہونے تک امور ریاست سے علیحدہ کر کے  
 انتظام کنبی کے حوالے کر دیا جس کے صدر کپتان اسپے تھے۔ پانچ برس کے بعد راجہ کو اختیار  
 ملے۔ کچھ مدت تک بڑا اچھا انتظام ہوتا رہا لیکن پھر نظمیاں پیدا ہو گئیں اور راجہ پوت موقوف  
 ہونے لگے جن سے راجہ کو سخت نفرت تھی۔ اس کے عکس مسلمانوں کے ساتھ گہرا ریل جول تھا  
 لے ممکن ہو یہ اسی توشہ کی طرف اشارہ ہو جس کا ذکر خواجہ علی نے دو کتابوں میں جلال الدینی قدر و زینتی میں کیا ہے



۱۸۶۱ء میں پھر راجہ صاحب اختیار کر دیئے گئے ۱۸۶۴ء میں ان کا انتقال ہوا۔  
 قصیدہ [عالم نے ہمارا راجہ شیو و حیان سنگھ کی مدح میں ایک قصیدہ غالباً ۱۸۶۰ء میں لکھا تھا۔  
 اس میں اپنے والد کی شہادت کا ذکر بھی کرتے ہیں :-

دیرینہ سالگی شدہ ام چاکر حضور      رنگیں سخن طراز مودیریں وظیفہ خوار  
 باید شنود راز ز عیان بارگاہ      باید شنفست قصہ ز پیران آں مآب  
 کافی بود مشاہدہ شاہد ضرورت      و رخاک راج گڑھ پدم را بود مزار  
 نات پوری نہ ہوئیں [راجہ شیو و حیان سنگھ سے عالم کی بڑی توقعات تھیں۔ میر ہندی مخرج کو ایک  
 ایس لکھتے ہیں :-

راجہ صاحب کے سلوک کا حال ہم پہلے ہی سن چکے تھے۔ انکو شدہ علیٰ کل حال۔ دیکھئے جماعت  
 کب کرتے ہیں۔ موافق اپنے وعدے کے ہم کو کب طلب کرتے ہیں۔ کلمات جاتے وقت فراموش  
 ہیں۔ کہیں انکو اسد کو بلاؤں گا۔ البتہ وہ بلائیں گے تو میں کیوں کرنے جاؤں گا۔  
 ایک مکتوب سے جو رام پور سے لکھا گیا تھا ظاہر ہوتا ہے کہ الور سے عالم کی توقعات  
 پوری نہ ہوئیں۔ کم از کم ۱۸۶۵ء تک وہ مایوس تھے حکیم غلام نجف خاں صاحب کو لکھتے ہیں :-

بھائی فضل اللہ خاں کی غمخواری و درد نگاری کا کیا کہنا ہے۔ مگر الور سے مجھ کو کہنا نہیں۔ یاد رکھنا  
 وہاں سے مجھے کچھ نہ آئے گا۔ یہ فرض محال اگر ملا تو ضاعی سورہ پہ سو وہ بھی مجھے بھائی فضل اللہ خاں  
 برادر امین اللہ خاں سابق دیدار الور کا دنیا سے مان کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اچانا اگر  
 خلاف میرے عقیدے کے پانسو روپے کا حکم ہوا۔ اور وہ آجائیں تو تم بعد اطلاق دھائی سو  
 یہاں فضل کو دے کچھ کو لکھنا۔ باقی۔ سب واسطے میں جس طرح نکھوں گا اس طرح کرنا۔

سید حسین میرزا باقر علی خاں کو ۱۸۶۷ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-  
 میں نے لکھے تھیں میں (یعنی دوسریں) سید حسین کی ایک جلیقہ عرضی اقبال نشان میرزا فضل حسین  
 خاں کی معرفت الور کو بھیجی تھی سو اس کے سہفے میں حضور پر نور ہمارا راجہ بہادر کا خطا بنی کی شہادت

مجھ کو آیا حضور نے اندراہ بندہ پروردی و قدر افزائی انقباب بہت بڑا مجھے لکھا خط میں فقر ہے بہت  
غایت اور انتہات کے بھرے ہوئے صوح کئے۔

میرزا باقر علی خاں اس زمانے میں الوریں تھے اوپر کے حالات کا ذکر کرنے کے بعد نہیں  
لکھتے ہیں:-

تم قرضیں تھے تم کو اس کی اطلاع ہو گئی تھی یا نہیں! اور اگر ہو گئی تھی تو تم نے مجھ کو کیوں نہیں لکھا  
اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کبھی وہاں میرا بھی ذکر آتا ہے یا نہیں۔ اور اگر آتا ہے تو کس طرح  
آتا ہے۔ حضورین کر کیا فرماتے ہیں۔

جے پور سے امداد ہر گوبال تھنہ کے نام کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو جے پور سے بھی کافی  
روپیہ ملنے کی امید دلائی گئی تھی، لیکن صرف پانسو ملے۔ فرماتے ہیں:-

تمہارا دعا گو اور اسو میں عالی پایہ نہیں رکھتا۔ مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی خراج  
ہوں سود و میں میری پیاس نہیں گھبھی تمہاری ہمت پر سو ہزار آفرین۔ جے پور سے اگر وہ ہزار روپے  
آجائے۔ تو میرا قرض دفع ہو جاتا۔ اور پھر اگر وہ چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض ادھل جاتا  
یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم تنفرات میں جا کر سو ڈیڑھ سو سوچ رہیں گے سو میرے صرف  
میں آئیں گے۔ مہاجروں کا سودی قرض ہے وہ بقدر پندرہ سو روپے کے باقی رہے گا۔

پانسو روپے :- پانسو روپے سبیل ہنڈی بھیجے گئے تھے۔ غالب کو ہنڈی جلد نہ پہنچنے کے متعلق  
بڑا اضطراب تھا۔ اس کے ساتھ فراخ حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ ہنڈی لانے والے کو کچیس روپے  
انعام دینے کے لئے تیار تھے نیز آنے جانے کے مصارف ادا کرنے پر آمادہ تھے۔ وہ فرماتے ہیں

بھائی آج کہ ہنڈی نہیں آئی میں حیران ہوں وجہ حیرانی کی یہ ہے کہ اس ہنڈی کے بھرے  
پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے۔ ۱۸۵۳ء میں  
کرتے ہیں وہیں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے باجوہ صاحب کو کچھ لکھ نہیں سکتا۔ جانتا ہوں  
کہ وہ میں کو پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا غصہ کریں! انیس روپے کی کون سا

ہاتھ اگر مصافحہ ہر دیونگہ رہنڈی لانے والے کا نام میرے اس سے بڑا ہوئے تو کیا غضب ہو  
 انیس اور پچیس (انعام کے) چون نکال ڈائیں باقی ارسال کریں۔

۲۴ جون ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :-

تیسے دن ہر دیونگہ کی عرضی اور پچیس روپے کی رسید اور پانسو کی رہنڈی پہنچی۔ تم مجھے  
 باوصاحب نے پچیس روپے ہر دیونگہ کو دیئے اور مجھ سے بھرانہ لئے۔ یہ ہر حال ہندو دی باہ دن  
 کی سیدادی تھی چھ دن گزر گئے تھے۔ چھ دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں۔ ہستی کاٹ کر روپے  
 لئے قرض متفرق سب ادا ہو گیا سینتالیس روپے نقد کس میں۔ اور چار بوتل شراب اور تین  
 کھانکے خوشہ خانہ میں موجود ہیں۔ الحمد للہ علی احسانہ۔

ذریعہ عطا یا کے باب میں فرماتے ہیں :-

بندہ پر دربار صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہندو دیاں بھیجی ہیں سو سو روپے کی۔ ایک ہزار تین  
 نیکش کے واسطے راجہ صاحب کی طرف سے تاریخ تولد کنور صاحب کے انعام میں۔ اور ایک اپنی طرف سے  
 مجھ کو بہ طریق نذر شاگروی بعد اس کے دو ہندو دیاں سو سو روپے کی بعد چار چار پانچ پانچ بیٹنے کے  
 آئین مع میر احمد حسین کے صلہ کے روپوں کے چار سو۔ اور اس سے علاوہ تین سو اور یہ کہ چار سو یا تین سو  
 کتنے دن میں آئے۔ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر جو آئے ہے۔ اگر وہ دو برس کے ہیں تو  
 دو برس میں اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

گواہار کے ساتھ تعلق | معلوم ہوتا ہے کہ گواہار سے بھی غالب کو عطیہ کی توقعات تھیں میر سید علی  
 خاں بہادر عرف حضرت جی کے نام فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ میں اپنے مقدمہ پیش کے  
 متعلق آخری فیصلے کا منتظر ہوں فیصلے کی اطلاع ملتے ہی گواہار کی طرف چل پڑوں گا۔

پہلا غالب کے فارسی قصائد میں ایک قصیدہ زندر سنگھ والی پٹیلار کی مح میں بھی ہے۔ جو غالباً  
 حکیم محمد خاں مرحوم کے بھائیوں کی وساطت سے پیش ہوا ہو گا۔ اس میں اپنے متعلق لکھتے ہیں  
 بے زور و دل آناؤہ فناں دارم فناں اگر دولت آنگی فناں گیر

نہ دیدہ و نہ سبخی مرا بہیں کہ منم  
کیکہ از غمش آور بہ استخوان گیسرد  
بجونی حال من از قال من لک کائنات  
سرغ آتش سوزندہ از دخال گیسرد  
مرا کہ نام مرا بے ادب نہ گیر و کس  
فلک نگر کہ بہ باد بچہ ناگہاں گیسرد  
پہر اعمی و من گوشہ گیر و رہ نشیب  
فخاں ز لطف کہ خصم پیش گیسرد  
حریر فکر مرا بہر فور و صد رنگ ہست  
خوشم کہ دیدہ و در از من لہ تحال گیسرد  
بہ شتری چہ رسم ترک چرخ و در راہ ہست  
کہ جان جامد و جاہر نہ کجاں گیسرد  
من اس منع گر انما یہ سبک قدم  
کہ گر بہ ہیچ خرو کس لہاں گیسرد  
دلہ کہ چارہ نہ وار و ہے جنوں کہ ترا  
بجال خوش و در اندیشہ مہرباں گیسرد  
دایان ممالک اودامرا کے مشاہروں یا عطیوں کے تذکرے کے بعد غالب کے اپنے  
شاگردوں اور نیاز مندوں کے ہدایا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تفتہ کا ہدیہ | تفتہ کے نام ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء کو ان کی طرف سے  
سورہ پے کی ہنڈی آئی تھی غالب اس کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں :-

ایک آدمی رسیدے کرنل کے کٹہ چلا گیا اور سورہ پے چہرہ شاہی لے آیا۔ آئے جانے کا  
دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپے داروغہ کی سوخت اٹھتے تھے وہ دیتے گئے پچاس روپے  
میں بیچ دے چوبیس روپے باقی رہے وہ کہیں میں رکھ لے۔ حساب مطابق چھپدین باقی  
رہنے چاہئیں مکن ہے وورہ پے کسی کو انعام میں دے ہوں  
غالب اسی ہدیہ کے متعلق دستنویس فرماتے ہیں :-

میرزا تفتہ .... از میرٹھ سفتہ زہد بہن فرستاد و جامد و نامیرتہ سے فرستد۔

انور الدولہ کے ہدایا | انور الدولہ نواب سعد الدین خاں بہادر شفق رئیس کہ ورکا لپی بھی دتا تھا  
روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ غالب ایک خط میں انہیں لکھتے ہیں۔

سینئیں روپے کی ہنڈی بھیجی اس کا بھی حال سابق کی ہی ہنڈی کا سا ہے یعنی

ساہوکار کہتا ہے کہ ابھی ہم کو کاپی کے ساہوکار کی اجازت نہیں آئی۔ جو روپیہ دیں۔ اگر  
سہرا کے کارپردازوں سے ساہوکار کو کہہ کر اجازت لکھو بھیجیں تو مناسب ہے۔

میرزا بہیم علی خاں کا بیہ | میرزا حسین مودودی نے غالباً نواب میرزا بہیم علی خاں سولی کی طرف سے  
پوچھا تھا کہ آیا کچھ روپیہ بھیجا جائے؟ جو اب میں لکھتے ہیں:-

سید صاحب قبلہ کیوں تکلیف کرتے ہیں اگر یہی مرضی ہے تو انتظام و امداد مختلف محض ہے بغیر  
بے سوال ہوں اگر کچھ بھیج دیں گے تو رو نہ کروں گا۔ کم و بیش پنظر نہ کریں۔ جتنے کا چاہیں نوٹ  
خط میں لپیٹ کر بھیج دیں۔

پھر ۲۵ ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں فرماتے ہیں:-

جب نوٹ بھیجے تو ذیل نکاتہ کی سطح آدھا آدھا دوبارہ کر کے نہ بھیجے گا میرے نام کا غلاف  
جس ٹہرے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رو نہ جائے۔ ورنہ ولی کے ڈاک خانہ میں  
پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

انہوں نے غالباً سو روپے کا نوٹ بھیجا تھا اس لئے کہ ۸ اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں  
فرماتے ہیں:-

حضرت یہ آپ کے جابجا کا غلام تو مر لیا۔ کثرت انتظام و لوا تر و در ودا شعار پھر یہ بنجار کہ سو روپے  
کے نوٹ کی رسید سب بار مانگتے ہو۔

میر غلام بابا خاں کا بیہ | نواب میر غلام بابا خاں سورتی بھی وقتاً فوقتاً غالب کی مالی امداد فرماتے  
رہتے تھے مثلاً اردوے معنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاطع برہان کو دوبارہ چھپوا سنے کے  
لسلے میں غالب نے امداد طلب کی تھی۔ نواب میر غلام بابا خاں نے ایک گھڑی بھیج دی۔  
غالب نے اس کے متعلق شکایتی خط میاں داد خاں سیاح کو لکھا جو نواب میر غلام بابا خاں کے  
صاحب بن گئے تھے۔ اس کے بعد نواب صاحب نے سو روپیہ بھیج دیا جس کی رسید ستمبر ۱۸۶۵ء

کے ایک مکتوب میں ان نقطوں میں بھیجتے ہیں :-

سورہ پے..... صرف سے وصول ہو گئے چھوٹے صاحب (نواب میر غلام بابا خاں) نے  
 بڑی جائزہ دی اور بڑی بہت کی اس طرف میں برکات اور ان کا نام ہوا۔ اللہ شہاب بھی  
 ہندوستان میں ایسے لوگ ہیں کہ میں نے ان کو دیکھا نہ انہوں نے مجھے دیکھا نہ میر کوئی  
 حق ان پر نہ ان کو کوئی خدمت مجھ سے پہنچی منظور خیر فقیر ہوں جب تک جیوں مجھ دعا کروں گا۔  
 یہ خط سیاح کے نام ہے۔ ایک خط میں میر غلام بابا کو براہ راست رسید بھی بھیجی گئی ہے۔  
 محمد علی خاں کا ہدیہ | مولوی ولایت حسین صاحب کے نام کے ایک فلسفی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ  
 خاں کی طرف سے ایک موقع پر دو سو روپے وصول ہوئے تھے۔

فتوحات و عطایا کے اس تفصیلی ذکر کے بعد غالب کی مالی و اقتصادی حالت کے متعلق  
 کچھ زیادہ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کے ابتدائی دور کو چھوڑ  
 وہ عمر بھر مالی مشکلات میں اُبھکے رہے۔ ان کا فرض غالباً کسی دور میں بھی ختم نہ ہوا کسی جگہ سے  
 روپیہ آتا تھا تو وہ بھلا قرض آتا دیتے تھے لیکن پھر اس بھروسے پر قرض لینا شروع کر دیتے  
 تھے کہ اور روپیہ آجائے گا۔ اول انہیں بڑی مدت تک یہ اُمید لگی رہی کہ ان کی خاندانی  
 پینشن کا سارا بھاریا یک مشت مل جائے گا۔ جو ۱۸۳۵ء میں ان کے حساب کے مطابق ۱۰  
 تین ہزار تھا۔ اور اس کے بعد سات ہزار روپے سالانہ کے حساب سے اس میں اضافہ ہوتا گیا  
 اسی روپے کے لئے کوششوں کے سلسلے میں انہوں نے وکٹوریہ کی طرح میں قصیدہ بھیجا  
 وہاں سے جنوری ۱۸۵۷ء میں جواب آیا جو غالب کے لئے بہت دلخوش کن تھا۔ اس طرح وہ  
 ۱۸۲۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک مسرت و اوقات کے چکر میں اُبھکے رہے۔ اور  
 میرا خیال ہے کہ فتوحات و عطایا کے سلسلے میں ان کے سامنے صرف دو حقیقتیں تھیں اول  
 بڑے بڑے شعرائے زمانہ ماضی کے ساتھ سلاطین و امرا کا شاندار سلوک۔ دوم اپنی شاعری کی

ان کے قصائد فارسی شاعری کے نہایت بلند پایہ شعرا کے قصاید سے اگر بہتر نہ تھے تو کمتر بھی نہ تھے۔ اور وہ قصائد مدوحین کی خدمت میں بھیجے وقت اسی خیال میں مبتلا رہتے تھے کہ مدوحین ان کے کمال شاعری کا صحیح اندازہ کریں گے اور ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک روا رکھیں گے۔ جیسا دوسرے بڑے بڑے فارسی شعرا کے ساتھ امرا و ملوک نے روا رکھا تھا لیکن ان کی یہ توقع کبھی بھی پوری نہ ہوئی۔ ان کا صرف ایک قصیدہ ہے جس پر نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے پانچ ہزار روپے دیئے لیکن اس رقم میں سے غالب کو ایک جہ بھی نہ ملا۔ ان حالات میں ان کا خرچ مسلسل زیادہ رہا اور ان کی آمدنی کسی وقت بھی ان کے مصارف کے ساتھ سازگار ہی پیدا نہ کر سکی۔

مالی مشکلات میں افزائش | سفر کلکتہ کے گراہنہ مصارف کے بعد ان کی مالی مشکلات خاص طور پر بہت بڑھ گئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انش کا بقیہ روپیہ یک مشت مل جائے گا اور تمام قرض بے باقی ہو جائیں گے۔ لیکن مقدمہ نے طول کھینچا جب فیصلہ غالب کے خلاف ہوا اور روپیہ ملنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا ہماروں نے غالب کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ اور ڈگریاں لے لیں تھیں ۱۸۳۵ء کی بات ہے جب ولیم فریئر قتل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں بلند پایہ افراد کے متعلق یہ دستور تھا کہ قرضخواہ انہیں گھر سے گرفتار کر کے قید نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اگر وہ لوگ گھر سے باہر نکلتے تھے تو انہیں پکڑوا کر حالات میں بھجوا یا جاسکتا تھا۔ غالب نے گرفتاری کے خوف سے اس زمانے میں دن و رات گھر سے باہر جانا بند کر دیا تھا اور وہ رات کی تاریکی میں سیر کے لئے نکلتے تھے۔ وہ غوثی نامی ناسخ گو یہ تمام حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

مختص شہرہ کہ در حسن صبر و ثبات ز دند آں بود کہ دو تن اگر کردہ دام طلباں چنانچہ  
قاعدہ عدالت انگریزی است ڈگری بحق من از عدالت حاصل کروند چوں فرجام آن است  
کہ یازمند رجبہ ڈگری گزاردہ شود یا تن یہ بند و زنداں دادہ آید۔ و دریں بارہ شاہ و گدا برابر

است۔ آری انہر نام آور ان میں قدرہست کہ سرنگ عدالت بہ کاشا نشان نتواند  
اندخت تا خود بہ گزریافتہ نشوند۔ بہ اسیری زندہ چون گنجائش اداسے زندہ و لا جرم بہ پای  
آورد خود اگر آورد دم و ترک نشاط سواری کردم۔

قرض کی کوشش | نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

کس فرستادہ اندرجیت و ہیرالال را بہ حضور بخوانند و در انجن نبشاند۔ و انکاء مرایا و ذرایا بتدا  
بیایم و سرلادہ گفتگو بکشایم تا چہ گفتہ آید مصلحت آنہہ حرف و سخن این باشد کہ اسد اللہ و ام پرست  
شماست و سر رشتہ تو نامیش بہ دست شماست۔ حالیا از اندوہ تنگ دستی و دلش دور اند  
بہ کار خویش است۔ دستش بگیرد و بہ یک ہزار روپیہ و گیر بہ کارش آید سعی شما صانع نخواہد رفت۔  
و سودمند خواہد افتاد۔

اس خط کی صحیح تاریخ معلوم کرنے کا کوئی قریبہ موجود نہیں لیکن اغلب ہے کہ یہ قرض صرف کلکتہ  
کے لئے کیا گیا ہو گا۔ اس لئے کہ اتنی بڑی رقم کے یک مشت لینے کی یہ ظاہر اور کوئی ضرورت  
نہ تھی۔ اور چونکہ خط میں دو سا ہو کاروں کا نام آیا ہے۔ شاید یہ وہی دو شخص ہوں جنہوں نے  
بعد ازاں غالب کے خلاف وہ ڈگری حاصل کی جس کا تذکرہ شیخ ناسخ و اسے خط میں موجود ہے۔

۱۸۵۳ء کی حالت | قرض کا سلسلہ بہ دستور جاری رہا بشمار ۱۸۵۳ء میں جسے پورے پانسو روپے

آتے تھے تو اس وقت بھی غالب پر پندرہ سو روپے کا سودی قرض تھا۔ قرض متفرق اس کے علاوہ  
تھا۔ غدر کے دنوں میں وہ کہڑے بیج بیج کر گزارا کرتے رہے۔ اور بے حد تنگ دست ہو گئے۔  
اس زمانے کی حالت مختلف خطوط سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک خط میں پنجابی کی مثل لکھتے ہیں  
پشن مل جائے حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ فکر کروں۔ پیٹ پیس رہ گیاں تو سبھی مٹاں

(مترجمہ ۴ جنوری ۱۸۵۹ء)

۱۸۵۹ء کی حالت | ایک اور خط میں جو نومبر ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں :-

بھائی! نہ کا غزہ۔ نہ کلکتہ۔ نہ لکھنؤ میں سے ایک بیڑنگ نفاذ پڑا ہے۔ کتاب میں



کا نڈ بھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں غم کین نہ ہونا۔ کل شام کو فتح کیں سے پہنچ گئی ہے آج کا غذا نکٹ  
دنگالوں کا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

جانتے ہو علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کہیں جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلہو (غالب کا وارث) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے کہ میں سے قرض ملنے کی امید ہے  
دکونی منہ منہ بیچ کے قابل۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو پھر ورنہ انا شد وانا الیہ راجعون۔

غدر سے تین برس بعد جب غالب کی فٹن کا سہ سال جمع شدہ روپیہ یک مشت ملا تو  
غالب کے ذمے سات کم پندرہ سو روپیہ سودی قرض تھا اور گیارہ سو کئی روپے متفرق قرض تھے۔  
آخری ایام | منشی حبیب اللہ خاں نوکا کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے  
آخری ایام میں بھی غالب کا خچ کم و بیش تین سو روپیہ ملا نہ تھا۔ اور آمدنی صرف ایک سو باسٹھ  
روپے تھی۔ فرماتے ہیں :-

ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے کی آمد تین سو روپے کا خچ۔ ہر مہینے ایک سو چالیس روپے کھاتا  
کہو زندگی دشوار ہے یا نہیں۔

تین سو روپے کہاں خرچ ہوتے تھے ؟ اس کی تفصیل بتانا مشکل ہے۔ ان کے مکان کا کڑا  
پانچ چھ روپے ملا نہ سے کبھی زائد نہیں ہوا۔ ملازموں کی تنخواہیں زیادہ سے زیادہ پچیس تیس روپے  
ہوں گی۔ گھر کا خرچ بھی زیادہ نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس آخری دوہیں بھی وہ پرانے قرض  
آمارے رہتے تھے اور ان کی آمد کا بڑا حصہ مختلف قرضوں کی قسطوں میں جاتا تھا۔



# لِوَالِ یَاب

## دستانِ عد

بہ ناکر فت چناں صر سے وزید رہر کنراں بر آئینہ آسماں غیب بار آمد  
 شرارہ بار غبارے ز مغر خاک گنجیت سیاہ رو سپے کا ندزیں و یار آمد  
 تو گوئی آئینہ من آں را غبارے گوئم زہر کشت من ابر نگار بار آمد  
 یوں تو غالب کے الم نامہ حیات کا کوئی صفحہ بھی ایسا نہیں جس کی سیاہی صمیمیتوں پر نشاں  
 اور دل شکستگیوں پر آہ و فغاں کے دھوئیں سے تیار نہ ہوتی ہو۔ یا جس کے بین اسطور کی آرائش  
 کے لئے دل و جگر کے خون کو بے دین صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس حلیل القدر انسان کے اندر  
 و غم اور فریاد و ماتم سے قوسِ عروجی کا نقطہ نہایت "سلطنتِ مغلیہ کی تاریخِ زوال کا وہ عزیز و  
 خوشگامی واقعہ مخزن ہے جو عام طور پر "عذر" کے نام سے معروف ہے۔

تیموریوں کا زول | تیموریہ سلطنت کی بساط جاہ و جلال حقیقتہً عالمگیر عظم کے آخری سانس کے ساتھ  
 ہی پسٹی جا چکی تھی مبین اگر انتہائی تیزی کے ساتھ چل رہی ہو تو انجن کے وقفہ رک جانے کے  
 بعد بھی بہیمہ تھوڑی مدت تک بہ دستور گھومتا رہتا ہے اور مشین کی حرکت جاری رہتی ہے۔  
 عالمگیر کی وفات کے بعد سلطنتِ مغلیہ کے وجود کی حیثیت مشین کے پہیہ کی اس عافنی گردش  
 سے مختلف نہ تھی جو انجن کے رک جانے اور فعال طاقت کے سطل ہو جانے پر بھی کچھ وقت  
 تک جاری رہتی ہے۔ حقیقت نا شناس سمجھتے رہتے ہیں کہ گویا مشین اپنی اصلی حالت میں چل رہی  
 ہے۔ آہستہ آہستہ پیہ کی رفتاریں سستی پیدا ہوتی گئی۔ خانہ جنگیوں کے قوا تر۔ اہلاد و ساما کی  
 غرض پرستانہ کشمکشوں کے تسلسل دشمنوں کے ہجوم، جاشینوں کی نالائقی اور عدم صلاحیت

نے سلطنت کا شیرازہ اس طرح پریشان کر دیا تھا کہ اس کے دوبارہ مرتب و مربوط ہونے کی بظاہر کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی جس طاقت و قوت کی سطوت و قربانی سے کبھی ایک دنیا لڑتی اور کانپتی تھی۔ وہ ٹکڑے ہو ہو کر خزاں دیدہ پتوں کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کی دھول میں بننے لگی تھی۔ آخر شاہ عالم ثانی کے عہد میں اس شین کا پیہا باطل ساکن ہو گیا۔ تاہم شین اپنی جگہ پر نصب تھی جس سلطنت کے حدود کسی زمانے میں قابلِ وقت نہ رہے۔ کراہیک طرف برٹش اور دوسری طرف اس کمارسی تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سلطنت سمٹی سمٹتی دہلی کے لال قلعہ کی چار دیواری میں محصور ہو گئی تھی لیکن اس کا نام باقی تھا۔ اور اس بے بسی کے عالم میں بھی یہ حالت تھی کہ ہندوستان کے بڑے بڑے اقطاع کے مالک اپنی فرمانروائی کے پروانوں پر اپنی لاچار و مجبور سلاطین کی مہریں لگوانے کے آرزو مند رہتے تھے اس لئے کہ ان مہروں کے بغیر کسی کی فرمانروائی کے موثق سمجھے جانے کی کوئی شکل نہ تھی تخت طاؤس افسانہ بن چکا تھا لیکن جس دیوان خاص کی دیواروں نے تخت طاؤس کے جلال و جبروت کی بہاریں دکھی تھیں وہ باقی تھا اور تخت طاؤس پر بیٹھنے والوں کے وہ اخلاف بھی زندہ تھے جن کی بے چارگی اگرچہ انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن لال قلعہ کی خاموش اور ساکت دیواروں کے سینوں میں جو داستانیں محفوظ تھیں انہیں سننے اور سمجھنے کی صلاحیت سے وہ بے بہرہ نہ تھے۔ جس انجن کے ساقیوں نے طول و عرض ہند کے ہر حلق میں ڈھائی تین سو برس تک زمردی کینوں اور ملی ساغروں کے ذریعہ سے زلال حیات ٹپکا یا تھا وہ پریشان ہو چکی تھی ساقی ہمنیہ کے لئے نقاب خاک اوڑھ کر سو چکے تھے۔ خم و سبو ڈٹ چکے تھے لیکن نیم شکستہ جام سفلیں اب تک باقی تھا جو انجن کی یاد تازہ کر رہا تھا جس دل نواز ساز کے روح پرور نغموں نے فرغانہ کی بہار آفریں فضاؤں سے اٹھ کر اس کمارسی تک ہر وجود کو قفس و وصل کی نئی لذت اور نیا ذوق بخشا تھا اس سانکے پردے پھٹ چکے تھے لیکن ابھی تک تمام کان اسی کی طرف لگے ہوئے تھے جس چراغاں ناز کی نظر افروز جگمگاہٹ نے روئے زمین ہند کو دیا نور بار کھا

تھا۔ جسے کہ "مارے بھی زمین پر اتر آتے تو اس دریا سے نور میں جلیے بننا اپنے لئے ہٹ  
 نخر سمجھتے اسے افسروں کی ہوائے مخالف بچھا چکی تھی لیکن ایک ٹمٹا سا دیا باقی تھا جس کی  
 جھلک عہد گزشتہ کی ضوافتا نیاں اور نور باریاں یاد دلانے لگی تھی۔ غالب کے "تصویر خامہ" کی "نور"  
 سرودش "نور" تھی بلکہ اسی بربادی کا "نور" اور اسی تباہی کا "مرثیہ" تھی۔

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط دامن باغبان و کف گل فروش ہے  
 لطف خرام ساقی و ذوق صد چنگ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے،  
 یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں نے وہ سرور و سوژنہ جوش و خروش کر  
 اور آخر یہ بھی کہنا پڑا کہ

دغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی  
 اک شمع رہ گئی تھی لہو وہ بھی خاموش ہے،

یہ ظاہر اس کبھری ہوئی آنکھ کے دوبارہ جینے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور شام پاس کے  
 بعد صبح امید و آرزو پھرتی دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن لال قلعہ کی سطوت کے سنے ہوئے  
 نقوش بھی بہت سے دلوں کی تسکین کا سامان تھے۔ آہ! کہ قدرت کو تسکین قلوب کا یہ حقیقی  
 سامان بھی پسند نہ آیا اور غدر کی باد تند نے اس چراغ کو بھی بجھا دیا جس کا سارا فقیہ قریب  
 قریب جل چکا تھا۔ اور جس کے روغن کا آخری قطرہ چراغ کی جھلملاہٹ کو سمجھانے میں صرف  
 ہو رہا تھا۔

بادشاہ اور غدر | سیرٹھ کی سپاہ جب اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے مٹی پہنچی۔ اور بہادر شاہ  
 کی مستقل پادشاہی کا اعلان کیا گیا تو ممکن ہے بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو  
 کہ سلطنت مغلیہ دوبارہ زندہ ہو گئی ہے اور بابر و اکبر و عالمگیر کی سطوت نے پھر خواب سے  
 آنکھیں کھولی ہیں۔ لیکن خود بہادر شاہ کی نظروں کے سامنے حقیقت حال زیادہ چھٹی  
 بے نقاب تھی۔ مرحوم ظہیر الملک اپنی "داستان غدر" میں فرماتے ہیں کہ پادشاہ ایک روز اپنے

میں سنگ مرمر کے تخت پر تشریف فرما تھے۔ میں (ظہیر مرحوم) حمید خاں جمعدارہ خاص بردار  
فتح علی جمعدار کماران اور حسین بخش عرضی بگی حاضر تھے۔

حضور نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام  
کیا ہونے والا ہے؟ حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور ڈیڑھ سو برس کے بعد  
حضور کا اقبال یا دہر ہوا ہے۔ نگئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔ پادشاہ سلامت نے  
فرمایا تم لوگ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔ مجھ سے سن لو کہ میرے بگڑنے کا کوئی سامان  
نہ تھا یعنی بنیاد خداداد مال و دولت، خزانہ، ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں، میرے پاس  
ان میں سے ایک چیز بھی موجود نہ تھی میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا مجھ کو کسی سے کیا خصوصیت تھی  
..... میں ترک گوشہ ایزدی میں فقیر کا مکینہ بنائے ہوئے چار صدیوں کو ہمراہ لئے ہوئے  
بیٹھا روتی کھاتا تھا میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اب جو منجانب اللہ غیب سے میرے پاس  
آگئی اور دلی میں آکر میری فتنہ برپا ہوا، فلک غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی شاہی منظور  
آج تک سلاطین بختیار کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم نابود ہو جائے گا۔  
یہ تک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہو  
جائے ہیں جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا دیں گے یہ بدعاش میرا گھر بگاڑ  
آئے تھے بگاڑ چلے اس کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سرکٹ رقبہ کے کنگرے پر  
چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اگر کوئی باقی رہ جائے گا تو  
آج کا میرا قول یاد رکھئے

تیموری خاندان کا آخری نام لیوا بے دست و پا ضرور تھا مچو اور بے بس یقیناً تھا لیکن  
قدرت کی عطا کی ہوئی بصیرت سے محروم نہ تھا۔ اس کی زبان پر جو کچھ جاری ہوا آخر پورا ہو کر رہا  
دستنبذ غالب نے قدر کے حالات سے متعلق ایک مستقل رسالہ (دستنبذ) لکھا ہے جو ان کی فارسی نثر

ہلک جو اہر کا آخری ورثہ وار ہے۔ یہ رسالہ حقیقتہً غالب کا پرائیویٹ روزنامہ تھا جس میں گھڑ میٹھے میٹھے جو کچھ سنستے تھے قلب بند کرتے جاتے تھے۔ اس رسالے کی تسوید کا کام شروع ہوا تھا تو غالب کو یا کسی دوسرے شخص کو یقین نہ تھا کہ انگریز ضرور کامیاب ہو جائیں گے اور مخالفین کا قلع نزع ہو جائے گا۔ لہذا یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ اس رسالے کی ترتیب انگریزوں کی خوشنودی کا مل کرنے کے لئے شروع ہوئی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس رسالے کے حالات و واقعات و غدر کے متعلق غالب کی بے لوث رائے کا موقع نہ سمجھیں جو ہر قسم کی مصلحت اندیشی یا ترسید کی سے پاک تھی۔ غدر پر کم و بیش اتنی برس گزر چکے ہیں۔ اس مدت میں ملک کی سیاسی فضا کا رنگ بالکل بدل گیا ہے۔ زادیہ نظر اور نقطہ نگاہ میں تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ پرانے نظریات کی صفیں درہم برہم ہو چکی ہیں اور ان کی جگہ نئے نظریات کے عسا کر کھڑے ہو گئے ہیں لیکن یہ آج غالب کی رائے بے لوث نہ سمجھی جائے۔ یا اس کی تصویب میں باریا زائل ہو لیکن جن حالات میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے رائے کو بے لوث سمجھنے میں نال کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ غالب کے غدر کے متعلق ابھی رائے ظاہر نہیں کی بلکہ اس کی تائید ہی ”تجربہ جی“ غالی تھی۔ اس کے متعدد وجوہ ذہن میں آتے ہیں:-

(۱) غالب طبعاً سکون پسند اور امن دوست تھے اور انہیں ہنگامہ آرائی یا مخصوص خویش ہنگامہ آرائی بالکل پسند نہ تھی۔

(۲) دہلی میں یا دوسرے شہروں میں انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر یکسی کے عالم میں جو ظلم و ستم ہوئے تھے۔ ان سے غالب کے انسانیت دوست دل سخت چوٹ لگی تھی۔

(۳) جو انگریز مارے گئے تھے ان میں غالب کے دوست، محب اور شاگرد بھی تھے۔

(۴) مغلیہ سلطنت کے احیاء کے لئے جو کوشش کی گئی تھی وہ بالکل غیر منظم تھی۔ اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کی تباہی اور سلطنت مغلیہ کے آخری نقش کے محاکے سوا کچھ نہ نکلا۔

(۵) مستعد و اکابر مارے گئے۔ ان کے گھر بار لٹے۔ جاہدادیں تباہ ہوئیں، اونچے اونچے

خاندانوں کی بساطیں اٹھیں۔ اور وہ نان شبیہ تک کے لئے محتاج ہو گئے۔  
 دہلی کی تباہی کا مرثیہ | لیکن انگریزوں کی فیروزی فتح مندی کے بعد دہلی، اہل دہلی، شاہی سلاطین  
 اور دوسرے لوگوں پر جو ظلم و ستم ہوئے ان کے اظہار میں بھی غالب نے نال نہیں کیا۔ دستنبو میں  
 بھی ان بختیوں اور شدتوں کا ذکر ہے لیکن ان کے اردو مرکا تیرکے دامن کا توہر گوشہ ماتم کے  
 آنسوؤں سے تر نظر آتا ہے۔ ذاتی حالات اور مالی پریشانیوں کے علاوہ غالب کے وردمند  
 دل نے جس موضوع کو الفاظ و حروف کا ماتی لباس پہنانے پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی۔ وہ  
 دہلی کی تباہی تھی۔ دہلی کی تباہی کا یہ منشور نوحہ جو اپنی الم ناکہ اور درد انگیزی میں کسی منظوم نوحہ  
 سے کم نہیں چونکہ منتشر و متفرق تھا اس لئے اس کی اہمیت پوری طرح واضح نہ ہو سکی ہیں  
 کوشش کی ہے کہ یہ داستان غم مرتب ہو جائے۔ غالب کی حالت یہ تھی کہ جہاں انہیں  
 موقع ملتا تھا اس درو میں چند نالے کھینچ لیتے تھے۔ اور خون کے آنسوؤں سے اپنے دامن  
 تحریر کو رنگیں بنا لیتے تھے میں نے ان تمام آنسوؤں کو یکجا کر دیا ہے تاکہ غالب کے قلبِ خرب  
 کی اس آہ و زاری کے آئینہ میں دہلی مرحوم کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہ تصویر  
 غالب کسی اور ورق میں نظر نہ آ سکے گی۔

دستنبو کا خلاصہ | مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے غالب کے رسالہ ”دستنبو“ کے اہم مطالب  
 پیش کر دیئے جائیں۔ اس لئے کہ ”دستنبو“ کا متعلق موضوع ہی غدر تھا۔ ابتدا میں اتنا عرض کر دینا  
 ضروری ہے کہ غدر کا سارا زمانہ غالب خانہ نشین رہے۔ اور وہ تمام حوادث کے شاہد  
 و ناظر نہ تھے بلکہ جو کچھ سن لیتے تھے لکھ لیتے تھے بے شک حال سننے والے معتبر ہوں گے یا

نہیں نے پچھہ کسولی میں مرتب کیا تھا جبکہ میرے پاس تصانیف غالب کے سوا اور کوئی کتاب نہ تھی  
 لاہور پہنچ کر معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی صاحب نے ”روزنامہ غالب“ کے نام سے حالات غدر کو خود غالب  
 کی تحریرات سے مدون کیا ہے۔ میں نے وہ رسالہ دیکھا تو معلوم ہو کہ وہ اس میں سارے حالات جمع نہیں  
 لے سکا تھا اس کی ترتیب کا انداز اسلوب اور سہجہ۔

ممکن ہے غالب مختلف ذرائع سے ہر روایت کی تصدیق کر لینے کے بعد اسے قلمبند کرتے ہوں۔ حالات غدر کا یہ موقع نہ مفصل ہے اور نہ تمام واقعات تسلسل کے ساتھ اس میں آئے ہیں بلکہ رسالہ بہت مختصر ہے، اور اس میں ذاتی حالات یا دوستوں اور عزیزوں کے حالات کا بھی اچھا خاصہ حصہ ہے۔

غدر کا آغاز | غدر کا آغاز ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں :-

وہیں سال کہ شمارہ اس راہ آئین بر آورد (یعنی تاریخ نکلنے کے طریق پر) اور سیزجیا باد  
 و اگر آشکارا ہر سی یک ہزار دوست و ہفتاد سہ (۱۲۷۳ھ) شہرند و شنبہ شانزہم ماہ  
 روزہ (درمضان المبارک) و یازدہم سی سال یک ہزار و ہشت صد و پنجاہ و ہفت ناگزفت  
 و در دیوار بارہ و بارہ و بی بھید۔ و ان جنبش زمین را فر گرفت ..... دہاں روزہاں سورج بتر  
 و کبریت چند از سپاہ کینہ خواہ میرٹھ بہ شہر آمدند ہمہ بے آزدیم و شور انگیزد و در خداوند کشی تشنہ خون انگیز  
 و دیباخان دروازہ لمے شہر ..... ہم پاس نمک و ہم پاس شہر گزشتند و ماہان ناخواندہ  
 یا خواندہ را اگر می داشتند۔ اس سواران سرگلن و سبک جلا و پیادگان زند و تیز و چوں در بازو  
 و رہبانان را ہمان نوازیا فتنہ دیوانہ و در ہر سو شتا فتنہ و ہر کرا از فرماندان و ہر کجا کارمشل نگاہ ان ہا  
 یافتند تا در رے کشندہ و پاک نہ سوختند و رے از ان سوریتا فتنہ۔

قلعہ دار اور ایجنٹ کا قتل | اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ چند گوشہ نشین فقیر جو انگریزوں کی بخشش  
 کی طفیل معمولی مایحتاج سے بہرہ مند تھے شہر کے مختلف حصوں میں جا بجا آباد تھے۔ ان لوگوں کو رام  
 و پیکار کے ہنگاموں سے کوئی مناسبت نہ تھی اور ہوتی بھی تو ظاہر ہے کہ غدر کے ہم گیر  
 سیلاب میں ان کی حیثیت محض چتہ شکوں کی سی تھی وہ اس فتنہ کے اسداویں اپنے آپ  
 عاجز و معذور سمجھ کر گھروں میں بیٹھ گئے۔

یہ ازاں ماتم زندگان بنم کہ درخانہ خویش بودم

میں نے شور مٹا اور اس کی علت بھی دریافت نہ کر سکا تھا کہ انگریز ایجنٹ اور انگریز قتل



کے قلعہ میں مارے جانے کی اطلاع ملی۔ ہر طرف سواروں کے دوڑنے اور پیادوں کے پہنچنے کا شور مچ گیا۔ پھر تو

بچہ مٹ خاک کے نمائندہ ان خون گل انگڑیاں از غوان زار نہ شد ..... ہستے آں جاں ان  
داؤد و زوش از روز نکو خستے نکو نام و آہ از ان خاتونان پری چہرہ نازک اندام ہلکے چوں آہ  
تے چوں سیم خام و دین آں کو دکان ہماں نادیدہ کہ در گفتہ و فی بد لالہ و گل سے خندیدہ۔ و  
در غش خرمی بہ یک و تدر و آہوے گرفتہ کہ ہمہ یک بار بہ گرواب خون فرو رفتند۔

غدر کی غرض و غایت کے متعلق اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن یہ ہنگامہ قتل کو کون جائز قرار دے سکتا ہے؟

اتش نذر کا ہمتال | غالب لکھتے ہیں کہ انگریزوں کے قتل کے بعد باغیوں نے شہر میں جا بجا ڈیرے ڈال دیئے قلعہ میں باغ شاہی کو اپنے گھوڑوں کا اصل بنا لیا۔ اور شاہی زمین کو خواب گاہ کے طور پر ہمتال کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مختلف مقامات سے خبریں آئے لگیں کہ سپاہیوں نے اپنے سپہ سالاروں کو قتل کر ڈالا ہے۔ یہ ہر حال سپاہیوں اور کسانوں کے جتنے یکٹل ہوئے اگرچہ ان کے درمیان کوئی ساز باز اور کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا تھا لیکن سب کے ایک مقصد پر کمر باندھ لی۔ گویا جھڑو کی تیلیوں کی طرح سب ایک کمر بند میں بستہ تھے۔ بے شک ہندوستان کو آرائش و آسائش سے باطل پاک کرنے کے لئے ایسے ہی جھڑو کی ضرورت تھی۔  
آرے رفت وروب ہند یوم بد انسان کہ آرائش و آسائش اگرچہ بیدہ اندازہ پرہ کا بت نیا  
بہنیں چارو گیتی آشوب جیسے خواہست۔

بے نظم و ترتیبی | معلوم ہوتا ہے کہ غدر کے بعد دہلی میں عام بے نظمی شروع ہو گئی تھی۔ ”دہستان غدر“ میں جو چشم دید حالات پیش کیے ہیں۔ اس بے نظمی کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ غالب اس بے نظمی اور انقلاب کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لشکر موجود تھے لیکن لشکر گرا رہے تھے ہپاہ چڑھتی لیکن سپہ سالار ناپید تھے۔ فرمانرواؤں کی مصیبت اور ہندوستان کی ویرانی پر

کیوں رونانہ آئے۔

شہر ہائے بے شہر بار پڑا زندہ ہائے بے خداوندیہ چنانچہ باغنامے سبے باغباں اور غلامان  
نابوسند۔ رہن انگیر و دار آواز و بانہ گون اور متغی۔ خانہ آویزاتہ۔ وکلبہ اخوان بغا گننا  
شمان خانہ شیش تماخیش در آرا بند و شخ چٹھی خوش بہ مردم نایند و وہ بروہ چوں شرہ لاخرا  
آختہ و نیک مردان آسودگی گزین دیکر بہ زقار آئینہ تا او خاد بہ بازار آئینہ ہزار جا سپر انداختہ۔

روشن گروں پھبتیں اور پھر فرماتے ہیں کہ چور مال و دولت لوٹ کر امیر بن گئے اور خلیل و شمیم  
ناکسوں کی شادمانیاں گئے بستروں پر بہتر راحت کرنے لگے۔ روشن گروں کے گھر میں تل بھی  
نہ رہا جس سے چراغ جلا سکیں۔ رات کی تاریکی میں انہیں پیاس لگتی تھی تو اس کی روشنی  
میں کوزہ و پیما نہ کو دیکھ کر باغی پیتے تھے (معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ خود غالب پر گزرا تھا) جو  
لوگ مٹی فرودخت کرنے کے لئے زمین کھودتے تھے وہ زردار بن گئے جو لوگ بزمے  
میں آتش گل سے چراغ روشن کرتے تھے وہ تاریک گھروں میں ناکامی کے دل غم سے  
جلنے لگے۔ قاصدوں نے خط لے جانے ترک کر دیئے۔ ڈاک کا سلسلہ درہم بہم ہو گیا  
سارے قاعدے الٹ گئے۔ دلیر اپنے سایہ سے ڈرنے لگے سپاہی شاہ و درویش پر  
حکم چلانے لگے پھر کیا یہ صوت حال سنو اور ماتم نہیں تھی اور اس گریہ پر خندہ بوا ہے  
عجیب بات یہ ہے کہ ان مصیبت ناک واقعات سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا تھا تو لوگ  
ضعف ایمان اور خرابی مذہب کے طعنے دینے لگتے تھے۔

ہنگامہ عام باغی شروع میں جو روپیہ اپنے ہمراہ لائے تھے انہوں نے شاہی خزانہ میں داخل  
کر دیا۔ آہستہ آہستہ ہر طرف سے سپاہی جمع ہونے لگے۔ تا آنکہ شہر و طلی کے اندر اور باہر سوار  
پیادہ کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی۔ بادشاہ نہ اتنے بڑے لشکر کو قابو میں رکھ سکتا  
تھا نہ اس کا انتظام کر سکتا تھا لہذا خود لشکر کے قابو میں آ گیا۔  
شاہ را در میان گرفت سپاہ دیں گرفتین بود گرفتین ماہ

ماہ دو مہینے گیسروں جنہ چار وہ نئے گیسروں  
شاہ ماہ گرفتہ را ماند نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

گویا پادشاہ کی حیثیت اس چاند کی سی تھی جس کے گرد لالہ پڑا ہوا ہو باغی جہاں سے  
گرتے تھے جیل خانوں کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ راہی یافتہ قیدی  
پادشاہ کے حضور میں آکر سرداری کی درخواستیں کرتے تھے اور صوبیداری کے آرزو مند  
ہوتے تھے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ ہر خوشنم کو بار بار اور ہر پناہ طلب کو پناہ کیوں دیے جاتے ہیں  
انہوں اور انگریزوں میں لڑائی انگریزوں کے قبضے میں صرف وہ پہاڑی رہ گئی تھی جو شہر سے جانب  
مغرب واقع ہے اور زیادہ دور نہیں۔ انہوں نے اسی پہاڑی پر دسے اور مورچے بنا کر وہیں  
پڑھائیں۔ اور باغیوں کے قبضے میں جو تو ہیں آئیں انہوں نے شہر کی فضیل پر بجا نصب  
کر دیں لڑائی شروع ہو گئی۔ رات دن پتھروں کی طرح گولے برسے لگے۔

عکرم حسن اللہ خاں مصیبت حکیم حسن اللہ خاں کے ایک پروردہ نے ناجائز طریقوں سے روپیہ  
جمع کر لیا تھا حکیم صاحب اس راز سے آگاہ تھے۔ پروردہ نے اپنی بددیانتی کو پردہ خائیں  
رکھنے کی غرض سے یہ افواہ اڑا دی کہ حکیم صاحب انگریزوں کے ہی خواہ ہیں اور ان کے  
لئے جاسوسی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ باغی بگڑ گئے اور حکیم صاحب کے قتل کی نیت سے  
ان کے مکان پر چڑھ دوڑے جن اتفاق سے حکیم صاحب اس وقت قلعہ میں پادشاہ کے  
ہاں موجود تھے۔ باغی قلعہ میں پہنچے اور حکیم صاحب کو گھیر لیا۔ خادم نواز بادشاہ نے اپنے آپ کو  
حکیم صاحب پر ڈال دیا اور اس طرح مظلوم کی جان بچائی۔ باغیوں نے حکیم صاحب کا مکان  
لوٹ لیا۔ مکان کو آگ لگا دی سارا مکان جل کر خاک ہو گیا۔ دیواریں دو آلود ہو گئیں ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ دیواریں مکان کے ماتم میں سیاہ پوش ہیں۔

حکیم صاحب پر اور فتنے آباد کے حالات دہلی سے باہر کے حالات لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تفضل حسین خاں  
دہلی فتنے آباد نے پادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی۔ خان بہادر خاں نے بریلی میں

لشکر جمع کیا۔ ایک سو ایک اشرافی اور نقربی ساز و سامان سے آراستہ گھوڑا اور ہاتھی کا  
 شاہی ہیں بہ طور نذر بھیجے۔ ذاب یوسف علی خاں والی رام پور دل سے انگریزوں کے دوست  
 لیکن ہمسایوں کے طعنوں اور شرانگیزیوں سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی مصلحتاً بادشاہ  
 کی خدمت میں زبانی پیام ارسال کیا۔ لکھنؤ سے کچھ انگریز بھاگ کر محفوظ جگہوں پر پہنچ گئے جو  
 بچے وہ بلی بگاریں حصار بند ہو گئے شرف الدولہ نے ان انگریزوں کے وجود سے بے پروا  
 ہو کر واجد علی شاہ کے ایک وہ سالہ فرزند کو تخت پر بٹھایا چونکہ ابتدا میں شاہانِ اودھ بادشاہ  
 دہلی کے وزیر تھے اور اس وجہ سے انہیں غازی الدین حیدر کے ابتدائی زمانے تک ذاب  
 وزیر اودھ کا لقب حاصل تھا اس لئے شرف الدولہ نے اس لقب کو بھی بادشاہ ہند کا  
 وزیر قرار دیا اور اپنے لئے وزیر کے پیشکار و دستیار کا لقب تجویز کیا بادشاہ کے لئے ایک  
 گراہنہ اند بھیجی جس میں دو گھوڑے اور دو ہاتھی تھے ایک زریں کلاہ بھی جو رنگ رنگ کے  
 نایاب گوہروں سے مزین تھی۔ نیز الماس کے بازو بندوں کی جوڑی اور بعض سری چیزیں بھی  
 کشمیری دروازے پر انگریزوں کا حملہ یہ حالات لکھنے کے بعد غالب و فتحہ ستمبر کے واقعات پر  
 پہنچ گئے۔ جبکہ انگریزی سپاہ نے کشمیری دروازہ پر حملہ کیا اور باغی شہر چھوڑ کر بھاگے۔ چار  
 مہینے میں شہر کی جو حالت رہی اسے سرسری طور پر بیان کر چکے تھے قلعہ کے حالات سے  
 تفصیلاً وہ آگاہ نہ ہو سکے اس لئے کہ غدر کے زمانے میں باہری نہیں نکلے تھے سرسری  
 حالات جو ان تک پہنچے ان کا محض اوپر درج ہو چکا ہے۔ انگریزی حملے کی کیفیت بیان  
 کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مئی گزرت دہلی قلعہ پر وارد	ستمبر ستم برآمد اور دوا
پس از چار ماہ پس انچار روز	فرد زندہ شد مہر گیتی فروز
نتی گشت دہلی زد یونگھاں	بہ مردی گرفتند فرز انگھاں

ہر چند ازیادہ ہم مئی تا چار ماہ و ہم ستمبر چار ماہ و چار روزہ و رنگ است پس از انجا کہ اندازہ

ہست وکشا وکار ہیں رنگ ہست کہ شہر بہ روز و شنبہ از دست رفت وہم بہ روز و شنبہ  
 ہست تو اس گفت کہ از دست رفتن و بدست آمدن شہر ہاں در یک روز بودہ است۔

یعنی انگریزی کو پیر کے دن شہر پر باغیوں کا قبضہ ہوا اور ۱۳ ستمبر کو پیر ہی کے دن انگریز  
 دوبارہ اس پر قابض ہوئے۔ لہذا اگرچہ چار ماہ اور چار دن کی مدت گزر چکی تھی لیکن دن کو  
 پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بجائے کہ شہر جس دن قبضے سے نکلا اسی دن دوبارہ قبضے میں آیا۔

انگریزی فوج کی زیادتیاں یہاں تک باغیوں کی چہرہ دستیوں اور ستم انگیزیوں کا بیان تھا اب  
 انگریزوں کی زیادتوں کی کیفیت سنئے۔ غالب لکھتے ہیں کہ فتح مند شہر میں داخل ہوا  
 تو لوگ بلا امتیاز قتل ہونے لگے معزز اصحاب بے گھروں کے دروازے بند کر لئے۔

ان کے نزدیک ایرو پچانے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ شہر میں جو باغی رہ گئے تھے انہوں نے  
 مقابلہ کیا۔ دو تین روز کشمیری دروازہ سے لے کر چاندنی چوک تک ہر کوچہ رزمگاہ بنا رہا۔  
 جہیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ پر یہ تینوں دروازے باغیوں کے

قبضے میں تھے۔ جب انگریزوں نے غصے اور غیظ کے عالم میں شہر کے اندر داخل ہو کر خندق  
 بے نواؤں کو مارنا اور چنگ گھروں کو جلانا وار کھا۔ تو اس اظہار خشم و کین سے سب پر خوف  
 طاری ہو گیا۔ بے شمار چھوٹے بڑے، نامدار و خاکسار مذکورہ بالا تینوں دروازوں کے

راستے شہر سے باہر جانے لگے۔ اور باہر کی چھوٹی چھوٹی بستیوں یا مقبروں میں پناہ گزین  
 ہو گئے۔ بعض نے وہاں بھی دم نہ لیا بلکہ بھیتیں اٹھاتے اور سختیاں سہتے دوسرے  
 مقامات کی طرف نکل گئے۔

ذاتی حالات اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر اسکان شہر کے اندر کشمیری  
 دروازہ اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اور دونوں دروازوں سے اتر گیا کچیاں  
 حاصلہ ہے۔ لوگ جوق جوق شہر سے نکلنے لگے لیکن میرے دل میں نہ گھبراہٹ پیدا ہوئی  
 اور میں اپنی جگہ سے ہلا۔

گفتم کہ چوں گہنگا رستم بہ سرنش منرا و رستم نہ انگلیاں بے گناہ کش نہ آب دہوئے  
شہر ناخوش۔ مرا چہ افتادہ کہ در اندیشہ ہائے تباہ اقم و اقام و خیزاں براہ افتم و رگوش  
بے توشہ با خامہ سیاہ جامہ ہم زیانم و ہم از ترہ شورابہ بار و ہم از گد خامہ خوننا بہشتان  
پر تید ستم و بے برگ خدا یا تا چند

بہ سخن شاد شوم کایں گہر از کان بہشت

دہلی پانگریزوں کا قبضہ ۱۸ ستمبر کو شہر و قلعہ پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہو گیا۔ غالب لکھتے ہیں کہ اس کے

غوغائے زد و کشت و گیر و دار بدیں کو چہ نیز رسید ہمہ را از بیم دل و دہیم شد باید دوست  
کایں کو چہ جز یک راہ ویش از وہ دوازہ خانہ نہ دارد و جز دو چاہ دریں کوئے نیست۔  
بیشتر از زن و مرد بدیں نوز کہ زن را بچہ در ناخوش است و مرد را پشتوارہ بردوش بدر زد و تنہ  
چند کہ بجا ماندہ اند بہ ہم داستانیں سن..... در از دروں بستند و سپر امن آں سنگ بہ سنگ  
بہم پیوستند۔ تاکو چہ چنانکہ بسر سیتہ بود و در سیتہ نیز شد۔

ہمارا جہ پٹیلہ کی سعی | اسی کو چہ میں شریف خانی خاندان مقیم تھا حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور  
حکیم غلام اللہ خاں جو حکیم شریف خاں کی اولاد میں سے تھے۔ سرکار پٹیلہ میں ملازم تھے۔ ہمارا  
پٹیلہ نے محاصرہ دہلی و فتح دہلی میں انگریزوں کی پوری ادا کی تھی اور عہدے لیا تھا کہ فتح کے  
اس کو سچے پر پھر بٹھا دیا جائے گا تاکہ انگریزی لشکر لے کو چہ کو گزند نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ ۱۸ ستمبر  
کو مہاراجہ کے سپاہی اس کو چہ کی حفاظت کے لئے پہنچ گئے۔

شہر کی حالت | غالب لکھتے ہیں کہ ۱۵ ستمبر سے شہر کے تمام مکان اور دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ نہ  
گندم فروش تھا جس سے دانہ خریدیں نہ دھوبی تھا جس سے کپڑا دھوائیں نہ حجام تھا جس سے  
اصلاح بنوائیں۔ نہ خاکروب تھا جس سے مکان صاف کرائیں جب تک دروازہ کو چہ کھلا  
تھا۔ چیزیں لے آتے تھے لیکن جب دروازہ بند کر کے پتھر چن دیئے گئے تو جو کچھ پاس تھا  
اسی پر مدار قوت لایوت رہ گیا۔ یہ سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو دورایتیں اور دودن لگتی اور

گڑبگی میں گزرا ہے۔

پانی کی تلاش | جب مہاراجہ کے پہرہ دار آگئے تو انہوں نے بتایا کہ کوچہ میں چاندنی چو  
تک تو پھر سکتے ہو اس سے آگے جانا خطرناک ہے۔ دروازہ کھولا۔ اور مختلف گھروں  
آوی ڈول، ہشک، پاکھال وغیرہ لے کر پانی لانے کے لئے نکلے۔ غالب کے دو ملا  
بھی ساتھ تھے۔ بیٹھا پانی دور تھا اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا ناچار نیم شور پانی لے  
واپس آئے۔ جو لوگ پانی لانے کے لئے گئے تھے انہوں نے واپس آکر بیان کیا  
شکریوں نے چند مسکاذوں کے دروازے توڑے لیکن نہ آنا ملا نہ کھی میسر آیا۔

ہرستی کہ زندانیانہ زندگی میگزرائیم نہ کس سے آید کہ گفتارش بکوش خورد و نہ خود برد  
سے رویم کہ ناویدہ دیدنیما نگرد ہر آئینہ سے تو انم گفت کہ گوشہائے ماکرست و چہشائے  
ماکورد و پیر وں ازاں گو نگوست و کشکش زمان ماثیرین است و آب ماثور روزے ناگاہ  
ابر آمد و یاراں بارید چادر سے بستیم و سخا میراں نہادیم و آب گرفتیم گویند ابراہیم و ربا  
بر وارد و بروئے زمین فرد یار و دریں بار ابر گرا نماند۔۔۔۔۔ آب از چشمہ زندگی آورد و آئینہ

آپہ نکند در پادشاہی جہت و نیافت این تیغ کام شور ابد آشام در تباہی یافت۔

یہ غالب کی حالت تھی جس کے کوچے کی حفاظت کے لئے مہاراجہ پٹیلہ کے سپاہی  
متین تھے کہ پٹیلہ کو پانی میسر نہیں آتا تھا۔ مینہ برسنا تو چادر باندھ کر اس میں مینہ کا پانی جمع کیا  
اور ٹمکا بھر اس سے اندازہ کیجئے کہ ان غریبوں اور مسکینوں کی کیا کیفیت ہوگی جن کا کوئی  
حافظ و نگراں اور پاسبان و یاور نہ تھا حق یہ ہے کہ دہلی والوں نے جس طرح انسانی زندگی  
کے بہتر سے بہتر و روور دیکھے اسی طرح بدتر سے بدتر و دروں میں سے بھی انہیں گزنا پڑا۔ ان  
کی نگاہوں نے جہاں غفلت و جلال کے درخشاں مناظر میں صدیوں غمی کی دھندلیوں ان کے  
سرور پر سے ناوڑ شاہی ترک تازا اور غدر کی ہنگامہ آرائی کے خونی سیلاب بھی گزرے۔  
تو کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان مسکینوں نے کیسے کیسے دکھ سے ہوں گے اور کیسی کیسی سختیاں

اٹھائی ہوں گی۔

غالب نے ضمناً اپنے خاندانی سوانح، اپنے بھائی کی دیوانگی، ان کے گھر بار کی غلطی اور ان کی موت کے حالات بھی لکھے ہیں۔ انگریزی فوج کے ظلم و زیادتیاں بیان کرنے میں غالب نے تامل نہیں کیا لیکن لکھتے ہیں کہ خود انگریزوں پر جو سختیاں ہو چکی تھیں ان کے انتقام میں اگر وہ دہلی میں کتوں اور بلیوں کو بھی زندہ نہ چھوڑتے تو بجا ہوتا تاہم انہوں نے اپنے غصے کو ضبط کیا۔ اور جو زیادتیاں کیں ان کی نسبت یوں سمجھ لو کہ جب کسی جگہ کو جنگ کے بعد فتح کرتے ہیں تو اس جگہ کے آدمیوں پر لازماً اس نوع کی سختیاں ہوتی ہیں۔

اہل شہر کی پریشانیاں پھر فرماتے ہیں:-

از فروماندگان شہر بیارے را بروں رامدہ اندواند کے ہم چیں در بندیم و رسید  
فروماندہ اند، در بارہ بیابان گردان پیو نہ نشین هیچ زمان نیست مگر در بیروں رفتگان و  
دروں رفتگان را در ماں نیست۔ کاش درونیاں دیر دنیاں را از مرگ وز نیست یک در  
آگہی بودے تا بے تابی و پرگندگی روئے نہ نمودے۔

غالب نے انگریز کینل کے پاس گئے ۵ اکتوبر کو چند گورے گوپے کے دروازے کے پاس کی دیوار سے  
کو دکر اندر آ گئے۔ ماما چہ پٹیل کے سپاہیوں کی روک تھام موثر نہ ہو سکی وہ دوسرے گھروں  
کو چھوڑ کر غالب کے مکان میں آ گھسے لیکن انہوں نے سامان کو ہاتھ نہ لگایا۔ بلکہ غالب باؤڑا  
خاں حسین علی خاں، چند ملازمین اور دوسرے ہمسایوں سمیت کینل براؤن کے پاس  
گئے جو غالب کے مکان سے دو تیر پتا کے فاصلے پر قطب الدین سوداگر کے مکان میں مقیم تھے  
کینل نے نام پتہ اور حالات پوچھ کر اسی روز انہیں واپس کر دیا۔

خاندان لوہارو کی سبیتیں | امرائے شہر کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب شہر  
فتح ہوا تو امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بھی اپنے اہل و عیال سمیت تین  
ہاتھیوں اور چالیس گھوڑوں کے ساتھ لوہارو کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دو تین روز آرام



کی غرض سے مہرولی میں ٹھہرے لیکن اس اثنا میں شکریوں نے ان کا سارا سامان لوٹ لیا۔ اور صرف تین ماہی باقی رہ گئے وہ بے سرو سامانی کے عالم میں دو جان پہنچے جہاں جن علی خاں رئیس دو جانہ نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو پادشاہ ایران نے ہمایوں کے ساتھ کیا تھا۔ کشتروہلی کو ان کے حالات کی اطلاع ملی تو امین الدین اور ضیاء الدین کو اپنے پاس بلا لیا۔ اور درشت گفتگو کی لیکن نرم جواب سن کر کچھ نہ کہا اور اپنا ان خانسامانی کے پہلوں قلعہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ جو سامان ساتھ لے کر نکلے تھے وہ مہرولی میں غارتگوں کی زد میں آئے۔ وہلی میں ان کے مکان میں پتھروں اور اینٹوں کے سوا کوئی چیز باقی نہ رہی مذروسم اور گستر ذنی دپوشیدنی کے نقصان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرے روسا کی گرفتاری | دو تین روز بعد عبدالرحمن خاں والی بھجھر کو پکڑ لائے اور دیوان عام میں ٹھہرایا۔ ۳۰ اکتوبر کو احمد علی خاں والی فرخ نگر کو لے آئے۔ ۲ نومبر کو بہادر جنگ خاں والی بہادر پکڑے آئے۔ ۶ نومبر کو راجہ بلب گڑھ گرفتار ہو کر آئے۔ وہلی کے ماتحت سات جاگیردار یاں شخص۔ لو آئے۔ جھجھر۔ بہادر گڑھ۔ بلب گڑھ، فرخ آباد، دو جانہ اور ہاٹو دی پنج جاگیردار پکڑے آئے بقیہ دو موضعیں ہیں۔

سالم الدین حیدر خاں | مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اور وفیق الدین حیدر خاں حسین مرزا شجر کے خاندان کی تباہی کے مغز آدمیوں میں سے تھے اپنے بھرے گھر کو چھوڑ کر زن و فرزند سمیت باہر چلے گئے تھے۔ ان کا گھر لٹ گیا۔ نہایت بیش بہا ساز و سامان غارت کر اٹھائے گئے بعد ازاں مکان کو آگ لگا دی گئی جو کچھ باقی بچا تھا وہ نذر آتش ہو گیا۔

پادشاہ اور شہزادے | شہزادوں اور پادشاہ کے متعلق لکھتے ہیں :-

از شہزادگان بیروں از بس نتواں سرو کو تے را از دہانے مرگ بہ دہان زخم بگورہ  
 فرور و چند سے را و جسم بند چاقی۔ یہ کش کش رن رواں و تن و سرو و فرور و چند از اس  
 زندان نشین اند و شمرہ چند از اس و دواں آوارہ روئے زمین۔ بر پادشاہ و رگ آما نگاہ

کہ ماتم زدہ تاب و توان است فرمان گیر و دار بہ انداز بارہ پیرس روان است -

یعنی شہزادے یا گولی سے مارے گئے یا پھانسی دیے گئے۔ جو باقی بچے وہ یا تو قید ہو گئے یا چھپ چھپا کر بھاگ نکلے اور آوارہ و سرگردان پھر رہے ہیں۔ بادشاہ ضعیف و ناتوان پر تقدیر پسل رہا ہے، جھجھک رہا ہے اور فرخ نگر کے روسا کو ایک ایک کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ غالب کس دُرو سے لکھتے ہیں :-

گوئی بد انسان گشت نگر کس نیار و گفت غول بختند۔

مسلمانوں پر سختیاں | اب مسلمانوں کی کیفیت سنئے۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کو شہر کے اندر آباد ہونے کی اجازت مل گئی لیکن غالب فرماتے ہیں کہ

مسلمانان از خانماں آوارہ را از بسکہ از رستن سبزہ در دیوار خانہ لائے آناں سبز است

ہر دم از زبان سبزہ سر دیوان ایں نوا بہ گوش مے خور و کہ جاتے مسلماناں سبز است -

مسلمانوں پر سختی کی کیفیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص نے حاکم شہر کے پاس شکایت کی کہ شریف خانی خاندان کا مکان ہمارا چھوٹا مکان کی حفاظت میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی جائے پناہ بن گیا ہے۔ ممکن ہے اس میں باغی بھی چھپے بیٹھے ہوں تو ۲۷ فروری ۱۸۵۷ء کو سپاہیوں کا ایک دستہ اس مکان پر پہنچا اور حکیموں کو ساٹھ آدمیوں کے ساتھ لے گیا۔ ۵ فروری کو حکیم محمود خاں حکیم مرتضیٰ خاں اور ان کے عم زاد بھائی عبدالحکیم عرف کالے حکیم صاحب رہا ہو کر آگئے۔ چند روز کے بعد چند آدمی چھوٹ آئے۔ بقیہ پرل میں رہا ہوئے۔

۲۷ فروری ۱۸۵۷ء کے حالات | ۲۷ فروری کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

چوں روز شب گشت و از ان شب سہرہ گزشت در دول داد و خواہاں براہ شب از دو  
بدانساں راہ گرفت کہ نگیند کماں بے خواست نفاں برداشتند کہ ماہ گرفت ..... داد و شد  
رہنچہ را ہار و آرزو مند ان آرزو در اندامہار داد و نہاد وافی کہ دریں شہر زنداں اند شہر ہیرن است نواغان

اندول اوریں ہر دو جا آنا یہ مردم راہیم در آ ورنہ کہ ہنداری پیکر در پیکر سے خزو شمار آناں  
کہ انہیں ہر دو بندی خانہ دروز لائے جدا گانہ پیش رسیاں جان باخندہ اندوشتہ جانتاں واندہ  
غدر امیری ۱۸۵۷ء کو ہوا۔ ۱۰ اکتوبر کو آگرہ سے دوبارہ دہلی پر قابض ہو چکے تھے لیکن غائب  
۲۶ فروری ۱۸۵۸ء کے حالات میں لکھتے ہیں:-

مسلمان در شہر از ہند کہیں افزوں نیابی نامہ بخار (غائب) نیز در ان ہزار کیے ہست۔  
گویا پانچ ماہ دس روز گزر چکے کے بعد بھی مسلمانوں سختی کا یہ عالم تھا کہ شہر میں ان کی  
تعداد ایک ہزار سے افزوں نہ تھی۔ غائب لکھتے ہیں کہ کچھ مسلمان اس قدر روزگار نہ کئے تھے  
کہ گویا وہ دہلی کے باشندے ہی نہ تھے بہت سے شہر کے ارد گرد دو دو چار چار کوس پر  
گراہوں، چھپروں اور کچے مکانوں میں اپنے بخت کی طرح سوئے پڑے تھے۔  
قیمتی اشارت لگیں | غائب امیر آدمی نہ تھے۔ ان کا گزارہ ٹپن اور تنخواہ پر تھا۔ آمدنی کے یہ  
دونوں ذریعے غدر کے ساتھ ہی مسدود ہو گئے تھے۔ اثاثہ بیت میں سے قیمتی چیزیں  
پاس تھیں۔ ان کی کیفیت سن لیجئے۔

کہ باوردیگم صاحبہ غائب، بے آنکہ بین گویا چیزائے گراں اور از زیور و زینت ہرچہ دوا  
نہانی در خانہ کالے صاحب پیر زادہ فرستاد تا دماغا ورنہ نماندہ نگاہ دہند و در بگل شہر  
چوں لشکر آریاں شہر را کشوند و لشکر بایں توان نہیا یافتند از دیوان آں راز بہمن و رسیاں  
نہاد کار از دست رفتہ بود و رفتن و آوردن را گنجائی نہ ماندہ تن مردم و طور را بیاں نہ نفیتم  
کہ چون قیمتی بود نیک ہست کہ از خانہ من نہ رفت۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ٹپن کا سر رشتہ گم ہے۔ اور بھنے بچھونے کی چیزیں بیچ  
بیچ کر تن پروری کر رہا ہوں دوسرے روٹی کھاتے ہیں اور میں کپڑا کھاتا ہوں ڈرتا ہوں کہ  
جب کپڑے ختم ہو جائیں گے تو بڑنگی اور گرنگی دونوں کا شکار ہو جاؤں گا۔  
بہادر جنگ کو مارا ورنہ فاضل | بہادر جنگ خاں میں بہادر گرگھ کا فیصلہ، عین کو ہوا ان کی

ریاست چھن گئی۔ ایک ہزار روپیہ مالانہ فیشن مقرر ہوئی اور انہیں لاہور روانہ کر دیا گیا۔  
احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں بے گناہ ثابت ہوئے اور ان کی ریاست واپس مل گئی۔  
لیکن یہ واقعہ غالب کی دستبنویس مذکور نہیں اس لئے کہ دستبنویس جولائی تک کے واقعات  
ہیں اور امین الدین و ضیاء الدین کی جاگیر جولائی کے بعد واکزار ہوئی۔

نا قابل بیان مصیبتیں | اب اردو سکھ تیب میں غدر کے واقعہ مالہ کی مرثیہ خوانی ملاحظہ فرمائیے  
ابتدائی تحریرات اگرچہ بہت محل ہیں لیکن بے حدود انگیز ہیں مثلاً حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے  
ہیں اور غدر کے متعلق اردو میں غالب کی غالباً یہ پہلی تحریر ہے۔

میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں ہے کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔  
نکالا نہیں گیا۔ نہیں کسی حکم میں اب تک پایا نہیں گیا۔ عرض باز پرس میں نہیں آیا۔  
دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

پھر ۲۷ دسمبر ۱۸۵۷ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

انصاف کرو لکھوں تو کیا لکھوں۔ کچھ لکھ سکتا ہوں یا لکھنے کے قابل ہے؟ تم نے جو کچھ  
لکھا تو کیا لکھا۔ اور اب میں جو لکھتا ہوں تو کیا لکھتا ہوں پس اتنا ہی ہے کہ اب تک تم  
ہم جیتے ہیں زیادہ اس سے نہ تم لکھو گے نہ میں لکھوں گا۔

۹ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک مکتوب میں دہلی کے حالات کی بے یقینی اور بے طمینی کی  
کی طرف یوں اشارے فرماتے ہیں:-

جو دم ہے غنیمت ہے۔ اس وقت تک سب عیال اطفال جیتا ہوں بد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ ملو  
نہیں قلم ہاتھ میں لئے پرچی بہت کچھ لکھنے کو چاہتا ہے۔ مگر کچھ لکھ نہیں سکتا اگر مل بیٹھا  
میں ہے تو کہہ لیں گے ورنہ انا فدا وانا الیہ راجعون۔

ہونا کہ انقلاب | غدر ایک زلزلہ تھا جس نے سب کچھ زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ غالب  
کے دل پر اس انقلاب کا اتنا اثر ہوا تھا کہ وہ ہنود کے عہدے کے مطابق

سمجھنے لگے تھے کہ جون بدل گئی ہے جنم تبدیل ہو گیا ہے۔ ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :-  
 صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اور کیا واقعہ ہوا؟ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم ہم  
 دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات ہر محبت و مریش آئے۔ شکر کے۔ دیوان  
 جمع کئے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے منشی نبی  
 ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ  
 انبساط بعد مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے  
 ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسم  
 پیشی ہر گوپال تخلص تفتہ ہوا دین جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دئی اور اس محلے کا نام بی ماراں  
 کا محلہ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا  
 پھر اپنی حالت لکھتے ہیں کہ میں حکیم محمد حسن خاں کے مکان میں رہتا ہوں دیوار بہ دیوار حکیموں کے  
 گھر ہیں جو راجہ نند سنگھ والی ٹیالہ کے ملازم ہیں۔  
 راجہ نے صاحبان عالی شان سے عہد لیا تھا کہ بوقت غارت دہلی یہ لوگ محفوظ رہیں گے۔  
 چنانچہ بعد فتح راجہ صاحب کے سپاہی دیاں آ بیٹھے۔ اور یہ کوچہ محفوظ رہا مدینہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں۔  
 ہمدردیانی شہر کی ہے آبادی اور دیرانی کی کیفیت بیان فرماتے ہیں :-  
 مبالغہ نہ جاننا میر غریب سب مل گئے۔ جو رہ گئے وہ غمے گئے۔ جاگیر و ارشن دار۔ دو  
 اہل حرفہ کوئی بھی نہیں مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان قلعہ پر شدت ہے باز پرس اور انوکھ  
 میں بتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامہ میں شریک رہے ہیں۔  
 ندرت سے تعلقی قلعہ کے ساتھ غالب کا بھی ویسا ہی تعلق تھا جیسا کہ دوسرے ملازمین کا لیکن غالب  
 نے ندرت سے قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ سرے سے قلعہ ہی نہیں گئے۔ مگر تجسپی ملاحظہ ہو کہ اپنی  
 بے گناہی اور ارباب جرم و بخی کے ساتھ بے تعلقی کے ضمن میں اپنے تعلق درابطہ دربار شاہی  
 کو بھی بے حقیقت ظاہر کر رہے ہیں فرماتے ہیں :-

میں غریب شاعر، دس برس سے تاریخ لکھنے اور شہر کی مصلحت دینے پر متین ہوا ہوں خواہی  
اس کو کوئی سمجھو خواہی مزدوری اس فنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور  
نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے غل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے۔ مگر چونکہ میری طرف  
پادشاہی دفتر میں سے یا خبروں کے ہاں سے کوئی بات نہیں پائی گئی۔ بند طلبی نہیں ہوئی۔  
ورنہ جہاں بٹے بڑے جاگیردار بلائے گئے، مثلاً لوہارو داسے، یا پکڑے ہوئے (مثلاً جھجر،  
باب گڑھ ہمارا گڑھ فخر دے) آئے ہیں، میری کیا حقیقت ہے۔

مارشل لا شہر کی ویرانی کا فوج ایک اور جگہ ان الفاظ میں لکھتے ہیں :-

اپنے مکان میں بیٹھا ہوں دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا سوار ہونا اور کہیں جانا توڑی  
بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے شہر میں ہے کون جو آوے۔ گھر کے گھر بے چراغ پڑے  
ہیں مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں جینٹی بندوبست (مارشل لا) یا زوہم سئی سے آج تک  
یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک یہ دستور ہے کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہندوئیے  
امور کی طرف حکام کی توجہ ہی نہیں دیکھنے انجام کیا ہوتا ہے۔

قدم خون میں شادابی | چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

میں مع زن و فرزند ہر وقت اسی شہر میں قدم خون کا ثنا ور رہا ہوں دروازے سے باہر  
قدم نہیں رکھا۔ نہ پکڑا گیا نہ قید ہوا۔ نہ مارا گیا کیا عرصہ کروں میرے عدلے بچہ پر کسی عنایت  
کی اور کیا نفس مطمئنہ بچنا۔ مال و اکبر وہیں کوئی فرق نہیں آیا۔

انگریزوں سے نہ ملے | غالب نے غدر کے بعد خود بھی کسی انگریز افسر سے ملنے کی کوشش نہیں کی  
حالانکہ داروگیر کے زمانہ میں اکثر اشخاص اپنے بچاؤ کے لئے جھوٹے افسانے بنا کر حکام کے  
ہاں اعتبار حاصل کرنے کی کوششیں کرنے لگے تھے۔ جھوٹے خبروں کا بہت زور ہو گیا تھا۔  
اور بہت سے آدمی ان خبروں ہی کی غلط بیانیوں کے باعث پھانسی پا گئے۔ غالب نے یہاں  
فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں بلایا نہیں گیا داروگیر سے محفوظ ہوں کسی طرح کی باز

ہو تو بلا یا جاؤں مگر اں جیسا بلا یا نہیں گیا۔ خود بھی بروئے کار نہیں آیا کسی حاکم نے یہی  
 ملا۔ خط کسی کو نہیں لکھا کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے مین بند ہے، کہو  
 یہ دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے انجام کچھ نظر نہیں آتا کہ کیا ہوگا۔  
 مسلمان ہفت ستم تھے | جیسا کہ دستنبو میں بیان ہو چکا ہے مسلمانوں پر سب سے بڑھ کر سختی تھی۔ غالب  
 فرماتے ہیں :-

واللہ دھندلے دھندے کو مسلمان اس شہر میں ملتا کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرد اگر کچھ ہیں  
 تو باہر کے ہیں بہنو والہ نہ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔  
 یعنی شہر سے باہر نکلنے میں ہندو اور مسلمان برابر تھے لیکن آبادی میں ہندوؤں کے ساتھ  
 رعایت تہی گئی۔ اور مسلمانوں پر بہ دستور سختی اور شدت جاری رہی۔ غالب ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-  
 ابھی دیکھا چاہئے مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔

بلا اجازت قیام کی ممانعت | غدر کے بعد کچھ مدت تک یہ حالت تھی کہ نہ یاہر سے کوئی شخص بلا اجازت  
 شہر میں آسکتا تھا اور نہ بلا اجازت خاص قیام کر سکتا تھا۔ اسی زمانے میں چودھری عبدالغفور صاحب  
 سرور مارہروی نے غالب کے ملنے کے لئے دلی آنے کا قصد کیا۔ لیکن چودھری صاحب کے چچا نے  
 انہیں روک دیا۔ چودھری صاحب نے غالب کو یہ کیفیت لکھی اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

آپ کے چچا صاحب نے کراہت کی جو آپ کو منع کیا۔ ڈاک کی سواری پر اگر آپ اس شہر میں کیر  
 مکان تک آجائے تو ممکن تھا مگر ہنا شہر میں بے حصول اجازت حاکم احتمال ضرور رکھتا  
 اگر خبر نہ ہو تو نہ ہوا اگر خبر ہو جائے تو البتہ قباح ہے۔ نہ ہا کہ بھی گمان نہ کیجئے محاکمہ دلی کی عملداری  
 میرٹھ، اگر بلا و شتر قیہ کی مثل ہے۔ یہ پنجاب احاطہ میں شامل ہے نہ قانون نہ آئین جس حاکم  
 کی جواز سے ہودہ ویسا ہی عمل کرے۔

دلی والوں پر جو مسلسل سختیاں ہو رہی تھیں ان کی کیفیت ایک کتاب میں فرماتے ہیں :-  
 بے فتنہ و فساد اور بلا و دیس ستم۔ یہاں کوئی طرح آسائش کی نہیں ہے۔ اہل دہلی عمر بھر

شہر گئے ہیں۔ یہ دغ ان کی جبین حال سے عموماً مٹ نہیں سکتا۔

میرمدی بھرج نے پنشن کے متعلق پوچھا، انہیں لکھتے ہیں :-

کیسا پنشن اور کہاں اس کا ملنا یاں جان کے لاسے پڑے ہوئے ہیں

ہے موجزن اک قلم غوں کا ش ہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے

اگر زندگی ہے اور پھر مل بیٹھیں گے تو کمائی کسی جائے گی۔

شہر سے باہر کے مکانوں کا انہدام | مسلمانوں کو مدت تک شہر میں آنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

ناچار ان میں سے بعض نے شہر کے باہر مکان بنانے شروع کئے لیکن حکم ہوا کہ یہ مکان منہدم کر دیے جائیں۔ غائب لکھتے ہیں :-

کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وکان کیوں بناتے ہیں جو مکان بن چکے ہیں

انہیں ڈھکا دو اور آئندہ کو ممانعت کا حکم سنا دو..... آج تک یہ صہرت ہے دیکھئے شہر

کے بسنے کی کون سی مورت ہے جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کئے جاتے ہیں یا جو باہر رہتے ہیں

وہ شہر میں آتے ہیں۔ الملک اللہ و الملک اللہ۔

شہر کی آبادی کی افزہ | اور آخر دسمبر ۱۹۵۷ء میں افواہ اڑی تھی کہ جنوری ۱۹۵۹ء سے سب لوگوں کو

شہر میں آباد ہونے کی اجازت مل جائے گی۔ غائب کہتے ہیں :-

خلق نے از روئے قیاس جیسا کہ دہلی کے خبر تراشوں کا دستور ہے یہ بات اڑا دی ہے

اور سارے شہر میں شہر ہے کہ جنوری شروع سال ۱۹۵۹ء میں لوگ عموماً شہر میں آباد کئے

جائیں گے۔ اور پنشن داروں کو جھولیاں بھر بھر کر روپے دیئے جائیں گے۔ خیر آج بدھ کا دن

۲۲ دسمبر کی ہے۔ اس کے شنبہ کو بڑا دن اور اگلے شنبہ کو جنوری کا پہلا دن ہے اگر جیتے ہیں

تو دیکھ لیں گے۔

یہ افواہ غلط غلطی۔ کافی دیر کے بعد پہلے یہ حکم ہوا کہ صرف مالکان مکان شہر میں آباد ہوں



کرایہ دار آباد نہ ہوں۔ بعد ازاں کرایہ داروں کو بھی آبادی کی اجازت ملی غالب و مرنمبر  
۱۸۵۹ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :-

آگے حکم تھا کہ مانکان مکان میں کرایہ دار نہ دیں پرسوں سے حکم ہو گیا ہے کہ کرایہ دار  
بھی دیں کہیں یہ نہ سمجھا کہ تم یا میں یا کوئی اور اپنے مکان میں کرایہ دار کو آباد کرے۔ وہ لوگ  
جو گھر کا نشان نہیں رکھتے اور ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے تھے وہ بھی آ رہے ہیں مگر سرکار کو کرایہ  
شہر کے دروازوں پر پہلے | انگریز ۱۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کو دہلی پر دوبارہ قابض ہو گئے تھے لیکن جنوری ۱۸۵۹ء  
ایک شہر کے دروازوں پر پہلے بیٹھے ہوئے تھے۔ غالب اور آخر جنوری ۱۸۵۹ء میں نواب  
مصطفیٰ خاں شیفہ سے ملنے کے لئے میرٹھ گئے تھے۔ تین چار روز کے بعد واپس آئے تو  
ایک خط میں مجروح کو لکھتے ہیں :-

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آکر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے۔ اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر  
کناعت نہیں۔ لاہوری دروازہ کا قلعہ دار نوٹڈھا بچھا کر ٹرک پر بیٹھا ہے جو باہر کے گورے  
کی آنکھ بچا کرتا ہے اس کو پکڑ کر حالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں پانچ پانچ بیگتے ہیں  
یا دور و پیہر جمانہ لیا جاتا ہے آٹھ دن قید رہتا ہے۔

ان حالات کا اندازہ کیجئے اور سوچئے کہ اہل شہر کی کیا کیفیت ہوگی۔

ایک اور خط میں جو آخر مارچ ۱۸۵۹ء کا ہے لکھتے ہیں :-

اول ماہ انگریزی میں روک ٹوک کی شدت ہوتی تھی آٹھویں دسویں سے وہ شدت کم ہو  
جاتی تھی۔ اس مہینے میں برابر ہی صورت ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

شہر کی آبادی کا چرچا ہوا۔ کرایہ کو مکان ملنے لگے۔ چار پاسو گھر آباد ہو گئے تھے۔ کہ پھر وہ

قاعدہ مٹ گیا اب خدا جالے کیا دستور جاری ہوا ہے۔

مسلمانوں کے املاک ۱۸۵۹ء کے آخر میں مسلمانوں کی املاک و انکسارت ہوئیں غالباً پین

مسلمانوں کی املاک کی واکسارت کا حکم عام ہو گیا ہے جن کو کراہی ہیں ان کو کراہی

ہو گیا ہے۔ لیکن یکم جنوری سے۔ پہرون چڑھتا ہے کہ تم کو (میر ہندی بھوج) کی یہ خط

لکھ رہا ہوں اگر مناسب جانو تو آؤ۔ اپنی املاک پر قبضہ پا کر چاہو نہیں رہو چاہو چلے جاؤ۔

شراب ناپ بھٹی | غالب کے لئے غدر کے بعد ایک بڑی مصیبت یہ تھی کہ شراب نہیں ملتی تھی بہت

گراں ملتی تھی ایک خط میں لکھتے ہیں :-

نہ کہیں جانے کا ٹھکانا ہے نہ کوئی میرے پاس آنے والا وہ حق جو بہ قدر ضرورت قائم  
بنائے رکھتا تھا میر نہیں۔

۲۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کے خط میں باجو کو بند سہارے کو لکھتے ہیں :-

دو قسم کی انگریزی شراب ایک تو کاس ٹین اور ایک اولڈ ٹام میں ہمیشہ پیا کرتا تھا اور

یہ دونوں قسم میں روپے صد چوبیس روپے درجن آتی تھی اب یہاں پہلے تو ٹھہری نہیں آتی

تھی اب پچاس روپے اور ساٹھ روپے درجن آتی ہے۔ وہاں سے تم دریافت کرو گے

نہ کیا ہے اور یہ بھی معلوم کرو کہ بہ طریق ڈاک پہنچ سکتی ہے یا نہیں ..... جاٹوں میں مجھ کو

بہت تکلیف ہے۔ یہ گڑبچال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے اور مجھے

اس سے نفرت ہے۔

حکم معاوضہ | کچھ مدت گزر جانے کے بعد ایک حکم معاوضہ قائم ہوا تھا۔ غالب اس کے متعلق

فرماتے ہیں :-

ایک حکم لایا ہو میں معاوضہ نقصان رعایا کے واسطے قائم ہوا ہے اور حکم یہ ہے کہ

کا مالج کالوں نے لوٹا ہے البتہ اس کا معاوضہ بر حساب وہ ایک (یعنی وہی جیسے ہیں سے ایک)

سرکار سے ہو گا یعنی ہزار میں سے ایک سو روپے ملیں گے اور جو گوروں کے وقت کی غارت

ہے وہ ہمارا وکیل ہے اس کا معاوضہ نہ ہوگا۔

ظاہر ہے کہ کالوں کے ہاتھوں وہی لوگ لٹے ہوں گے جو انگریزوں کے دفاتر تھے یا جن پر وفاداری کے شبہ کی گنجائش تھی۔ ان کو معاوضہ ملا جو لوگ گوروں کے ہاتھوں لٹے وہ زیادہ تر بے گناہ تھے زیادہ تر بے قصور تھے۔ اکثر وہ تھے جنہوں نے غدیں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کا گناہ محض یہ تھا کہ وہ دہلی کے باشندے تھے اور غدر ہو جانے پر بھی اس نے دہلی کی سکونت ترک نہ کی۔ مثلاً خدو غالب کے بھائی کا مکان لٹا۔ غالب کی بیگم صاحبہ کا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں لٹیں۔ لوہار والوں کا گھر لٹا۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی انگریزوں سے باغی نہ تھا اور نہ غدیں کسی نے حصہ لیا۔ لیکن ان لوگوں کو کوئی معاوضہ نہ ملا۔

دوسرے مفارقت یافتگان غالب کو ایک بڑا بیخ اس بات کا تھا کہ ان کے اکثر دوست اور ملنے والے غدیں مارے گئے یا تباہ ہو گئے۔ وہ فرماتے ہیں :-

کوئی نہ سمجھے کہ اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرنے والوں - جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیاں تو معلوم مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیہ والوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا امید گاہ تھا۔ اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار۔ اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست کچھ شاگرد کچھ مشوقی سوہرے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دیکھو اس کو زہیت کیوں کر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا تو میرا کوئی رخصتے والا بھی نہ ہوگا۔

پھر لکھتے ہیں :-

بھائی وہ زمانہ آیا ہے کہ سینکڑوں عزیز راہی ملک عدم ہو گئے سینکڑوں ایسے مفقود و مجبور ہوئے کہ ان کی مرگ و زیست کی خبریں جو دو چار باقی رہیں خدا جانے کہاں بیٹے ہیں کہ ہم ان کے دیکھنے کو ترستے ہیں۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

ہزار دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں۔ ادھ کس سے فریاد کروں جیوں تو کوئی غمخوار  
نہیں اور مردوں تو کوئی غزا دہنیں۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے :-

سینکڑوں بلکے ہزاروں دوست اس ہاتھ برس میں مر گئے خصوصاً اس قتلہ و آشوب میں  
(خدیجہ) تو شاید سیر کوئی جاننے والا نہ بچا ہو گا۔

دہلی کا نقشہ بدل چکا تھا۔ غالب بہت مغرب تھے۔ تمام حکام ان سے دوستانہ ملتے تھے۔  
لیکن غدیر میں ہر شے متقلب ہو گئی۔ غالب فرماتے ہیں :-

نہ وہ حکام جن کو میں جانتا تھا۔ نہ وہ عملہ جن سے میری ملاقات تھی۔ نہ وہ عدالت کے  
قواعد جن کو بچاؤ برس میں نے دیکھا ہے ایک کو نے میں بیٹھا ہوا نیزنگ روز نگار کا  
تماشا دیکھ رہا ہوں یا حافظہ دیا حفظہ روزیاں ہے۔

غیر دو عہد سلطنت پر پابندی | جب خاص پابندیاں اٹھ گئیں اور شہر میں آمد و رفت کی اجازت گئی  
تو فقیر اور صاحب السلحہ اس آزادی سے مستثنیٰ تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

فقیر اور تھپیار جس پاؤں پر وہ نہ آئے۔ باقی ہندو مسلمان عورت مرد سوار پیادہ جو چاہے  
چلا جائے چلا آئے۔ مگر بغیر اجازت کے رات کو شہر میں رہنے نہ پائے۔

شہر میں کون تھا | اسی زمانے میں منشی شیونرائن آرام مالک مطبع مفیدہ خلائق اگرہ نے اخبار نکالا تھا  
اور غالب سے خریدار مہیا کرنے کی استدعا کی تھی۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے :-

یساں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں ہمارے لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے  
ہیں کہ گیسوں کہاں سستے ہیں بہت سخی ہو گئے تو جنس پوری دیں گے۔ کاغذ اخبار، روپے بیسے ۱۰  
کیوں مول میں گئے۔

غالب کے کمالات نگارش کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضمناً بعض نہایت اہم باتیں

لڑا جاتے ہیں۔ مثلاً خریداری اخبار کے ضمن میں ہوجاتوں کے کیرکٹر کا پور نقشہ چنے الفاظ میں کھینچ دیا۔

ایک اور خط میں اسی قسم کی خواہش کا جواب یوں دیتے ہیں:-

مسلمان امیروں میں تین آدمی حسن علی خاں، نواب حامد علی خاں و حکیم حسن اللہ خاں،

سوان کا یہ حال کہ روٹی ہے تو کپڑا نہیں، مسندایاں کی اقامت میں تذبذب۔ خدا جانے کہا

جائیں کہاں وہیں حکیم حسن اللہ خاں نے آفتاب عالمیاب کی خریداری کر لی ہے۔ اب وہ

مکرملات و بارشاہی کیوں پس گئے سوائے ساہوکاروں کے یہاں کوئی امیر نہیں۔ وہ لوگ

اس طرف کیوں توجہ کریں۔

ٹکٹ ادہلی کی فتح کے بعد اول کسی کو شہر میں آیا وہو نے کی اجازت نہ تھی۔ پہلے ہندوؤں کو

اجازت ملی بہت دیر بعد مسلمان مسکان داروں کو اجازت ملی۔ پھر کرایہ داروں کو بھی اجازت

ملی کہ شہر میں رہیں لیکن کرایہ سرکار کو دیں۔ اس دوران میں ٹکٹ بھی جاری ہو گئے تھے جن کے

بنیہ شہر میں جانے یا باہر نکلنے یا پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ ٹکٹ قیمت ملتے تھے اور شخص کی

حیثیت کا اندازہ کر کے ٹکٹ کی قیمت کا تعین حاکم کی رائے پر موقوف تھا۔

۱۵ شہادت علی خاں والی جھجھر کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اپنے بڑے بھائی فیض محمد کی ریاست کے زمانے میں جنیل

رہے فیض محمد کا انتقال ہو گیا۔ اور ان کے بیٹے فیض علی خاں سند نشین ہوئے تو ان میں حسن علی خاں میں اختلاف ہو گیا۔

مقدمہ بازی لگ لویت پہنچی۔ انگریزی حکومت نے صلح کرائی حسن علی خاں کا تین ہزار روپیہ مانا نہ مقرر ہوا جو بڑی بددستی

کی طرف انہیں لٹاتا تھا اور وہ دہلی میں مقیم ہو گئے۔ غدر کے دنوں میں کبھی کبھی بادشاہ کے پاس جاتے تھے جب انگریز

دہلی پر قابض ہوئے تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ گئے کچھ مدت روپوش رہے اور یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو واپس آئے۔

۱۶ نواب حامد علی خاں اعظم والدولہ فیض علی خاں وزیر شاہ اودھ کے داماد تھے ان کی بیوی کو باپ کے ترکہ سے نواک

روپیہ ملا تھا۔ حامد علی خاں دہلی چلے آئے۔ روپیہ شاہی خزانہ میں جمع کروا یا جس کا سو و ساسٹھ چار ہزار روپیہ مانا

ملا تھا۔ وہ بہادر شاہ سے وزیر بھی بن گئے تھے۔ غدر کے بعد چودہ مہینے حالات میں رہے۔ فروری ۱۸۵۹ء میں راہ ہجرت

۱۷ دہلی کے مشہور امرا میں سے تھے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے بقدر  
مقدور نذرانہ دے اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔  
ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

اب یہاں ٹکٹ چھاپے گئے ہیں۔ میں نے بھی دیکھے فارسی عبارت یہ ہے "ٹکٹ بادی  
درون شہر بہ شرط ادخال جرمانہ" مقدار روپیہ کی حاکم کی رائے پر تاج پانچ ہزار ٹکٹ چھپ چکا  
ہے کل اتوار تھیں ہے پرسوں دو شنبہ سے دیکھے یہ کاغذ کیوں کر تقسیم ہوں  
منشی نقشبہ کو لکھتے ہیں :-

یہاں باہر سے اندر کوئی بیئر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا تہہ نہاں یہاں کا ارادہ  
تھانوں پر حکم پہنچ گیا تھا کہ دریافت کرو کون کون بے ٹکٹ مقیم ہے :-  
سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو کون بے ٹکٹ مقیم ہے۔ اور کون ٹکٹ رکھتا  
ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے یہاں کا جہاد میرے پاس بھی آیا میں نے لکھا  
تو مجھے نقشے میں نہ رکھ میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ عبارت یہ کہ اسد اشدیشن وارثۃ  
سے حکیم بیلا دوائے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا نہ گورواں  
کے وقت میں غلا اور بٹا لایا گیا۔ کوئل براؤن صاحب کے زمانہ حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔  
ابہا کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جہاد نے  
مجھے کے نقشے کے ساتھ کوڑالی بھیج دی ہے۔

حکیم غلام نجف خاں ان دنوں دوجانہ میں تھے۔ انہوں نے لکھا کہ دوجانہ آجائے۔  
لیکن غالب نے جواب دیا کہ ٹکٹ کے بغیر باہر نکلنا غیر ممکن ہے پھر میں کیوں کر آؤں۔ یوسف نیرا  
کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں کہ ٹکٹ موقوف ہو گیا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط  
۱۸۶۰ء سے پہلے کا نہیں لیکن اس کی صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے۔

سکون کا الزام باغیوں کی حمایت کے متعلق غالب کے خلاف کوئی شہادت موجود نہ تھی لیکن کسی شخص نے کہہ دیا کہ غالب نے بہادر شاہ کے سکے کسے تھے۔ حالانکہ یہ سکے ذوق نے شاہ مروج کی تخت نشینی کے موقع پر ۱۸۵۷ء میں کسے تھے اور یہ اسی زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی باقر علی نے اپنے اخبار میں جس کا نام اردو اخبار تھا چھاپ دیے تھے۔ غالب کو مذکر کے بعد اردو اخبار کے قائل کی ضرورت پیش آئی تاکہ اس قاطع شہادت کی بنا پر اپنی بے گناہی ثابت کر سکیں۔ زمانہ اتنا نازک تھا کہ حکام جس کے خلاف شرکت غدر کا الزام لیتے تھے۔ اسے جلد سے جلد سزا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ غالب چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

مولوی باقر علی دہلوی کے مطبع سے ایک اخبار مینے میں چار بار نکلتا ہے۔ سب سے پہلی اردو اخبار بعض اشخاص سنین، احضار کے اخبار جمع کر رکھتے ہیں اگر چنانچہ آپ کے یا آپ کے کسی دوست کے پاس جمع ہوتے چلے گئے ہیں تو اکتوبر ۱۸۵۷ء سے دو چار مینے کے آگے کے اوراق جن میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر ہوا اور سیاں ذوق کے دوستوں ان کے نام کے کہہ کر مذکر کے کا ذکر منہج ہوئے غلط وہ اخبار چھاپے کا بجنہ میرے پاس بھیج دیجئے۔ معلوم رہے کہ اکتوبر کی ساتویں آٹھویں تاریخ ۱۸۵۷ء میں پخت پڑی تھی ہیں۔ اور ذوق نے اسی مینے میں یادو ایک مینے بعد یہ سکے کہہ کر گزارے ہیں۔ احتیاطاً چار پانچ مینے کے اخبار دیکھ لئے جائیں۔ یہاں تک میری طرف سے ابرام ہے کہ اگر نیشل کسی اور شہر میں کوئی صاحب آپ کا دوست جامع ہوا اور آپ کو اس کا علم ہو تو وہاں سے منگو ابھیجئے۔

چودھری صاحب نے بہت کوشش کی لیکن اخبار نہ مل سکے۔ غالب نے "جام جہاں نما" والوں کو کھانٹتے بھی لکھا۔ لیکن پہلی اردو اخبار کا مطلوبہ نمونہ وہاں سے بھی نہ ملا اور اضطراب بہ دستور باقی رہا۔ چودھری صاحب ہی کو لکھتے ہیں :-

مکہ کا وار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا گراب اس سے کہوں اس کو گواہ لاؤں۔ یہ دوا

کے ایک وقت میں لکھے گئے ہیں..... ذوق نے یہ دو سکے کہہ کر گزرائے بادشاہ نے  
پسند کئے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے عقیدین میں سے تھے انہوں نے دلی اردو اخبار میں یہ  
دونوں سکے چھاپے۔ اس سے علاوہ وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے اس زمانے میں مرشد آباد  
اور کلمتہ میں یہ سکے بنائے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔ اب یہ دونوں سرکار کے نزدیک میرے  
کے ہوئے اور گزرائے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند فکر و ہند میں دلی اردو اخبار  
کا پرچہ ڈھونڈا کیس ہاتھ نہ آیا۔ یہ وجہ مجھ پر راپٹن بھی گیا۔ اردو ریاست کا نام و نشان  
خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر کچھ ہوا چونکہ موافق رضائے آبی ہے اس کا گلہ کیا ہے۔

چوں جنبش پہر بہ فرمانِ داوِ رست

بیدار و بنو دآئینچہ بہار آسمان رسد

یوسف میرزا کو بھی اردو اخبار کی تلاش کے لئے لکھتے ہیں :-

اپنے دل کو تسلی دینے کا طریق یہ ہر حال یہ معلوم ہے کہ غائب کے لئے نہیں کہتے لیکن بہ صورت  
عدم وستیابی ثبوت و شہادت غائب اپنے دل کی تسلی کے لئے بعض عذرات تلاش کر  
یوسف میرزا کو لکھتے ہیں :-

میں نے کیا نہیں کہا اگر کیا تو اپنی جان اور حرمت بچائے کو کہا۔ یہ گناہ تھیں ہے۔ اور  
اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ہمارے معظریہ کا اشتہار (عفو عام) بھی اسے مٹا نہ سکے۔  
بحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا۔ اور تو میں لگانا اور بنک گھرا در میگنیزین کا لوٹنا معاف  
ہو جائے اور شاعر کے دوسرے معاف نہ ہوں ہاں صاحب گولہ انداز کا بہنوئی مددگار  
ہے اور شاعر کا سالابھی جانب دار نہیں۔

آخری فقرے میں کیسا طبع نکتہ ارشاد فرمایا ہے بہنوئی کو اپنی بیوی کے بھائی کی موت  
یا مصیبت پر کتنا ہی رنج کیوں نہ ہو لیکن وہ اس رنج کا مقابلہ نہیں کر سکتا جو سارے کو بہن کے خاوند



بہت واقف نازل ہونے کی حالت میں ہو سکتا ہے۔ غالب اپنے خطوں میں اس کے مبلغ جملے عموماً بلا تعلق لکھ جاتے ہیں۔

کا انتظام فتح دہلی کے بعد پہلی مرتبہ شہر میں شکی خانے مقرر ہوئے تھے۔ غالب فرماتے ہیں:

شہر کا حال جان کیا ہے۔ ہون ٹوٹی کوئی چیز ہے، وہ جاری ہو گئی ہے۔ سوائے انج

اور اپنے کے کوئی چیز ہی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں :-

ہون ٹوٹی کے باسیں کو نسل ہوئی۔ پرسوں، رنومبر سے جاری ہو گئی۔ ساگ رام

خزائنہ، چھٹاں ہمیش داس ان تینوں شخصوں کو یہ کام بہ طریق مالی سپرد ہوا ہے۔ غلے اور

نپے کے سوا کوئی چیز نہیں جس پر محصول نہ ہو۔

کی گرائی اس زمانے میں غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ غالب اس گرائی کی کیفیت ان قسطوں

مابیان فرماتے ہیں :-

غلہ گراں ہے موت ارزوں ہے۔ میوہ کے مول انج بکتا ہے۔ ماش کی وال آٹھ سیر باجو

بارہ سیر گیہوں تیرہ سیر۔ چنے سولہ سیر۔ گھی ڈیڑھ سیر۔ ترکاری ہنگلی۔

ذرا اپنے زمانے کی حالت کو سامنے رکھ کر اس گرائی کا اندازہ فرمائیے۔ غالب ان

قول کی بنا پر جو ہمارے نزدیک اعلیٰ درجے کی ارزانی کے نرخ ہیں فرماتے ہیں کہ میوہ کے

دل انج بکتا ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد ایسا دور آنے والا ہے جس میں گرائی کے

نرخ انسانی کشائش کے نرخوں کے مقابلے میں بھی ارزوں ہوں گے۔

چراغ اکرم نومبر ۱۸۵۷ء کو دہلی میں چراغاں کا حکم ہوا غالب فرماتے ہیں :-

فیہ بھی اس تہیہ میں کہ قصارہ مینے سے ہٹن مقرر نہیں پایا اپنے مکان پر روشنی کرے گا۔

نفسہ ہماروں کا اندام انگریزوں کے دہلی پر قابض ہونے کے بعد جگہ جگہ سے شہر ہندم ہونا شروع

ہو گیا تھا، نئی نئی سڑکوں کی تجویزیں تھیں۔ ریل کی سڑک بننے کی افواہ تھی۔ غالب بربادی کا جو

پہلے دیکھ چکے تھے۔ اس کے بعد اندام شہر ان کے قلب حزیں کے لئے کیوں سخت قفس ٹھہرا نہ ہوتا۔ چنانچہ ان کے مکانیبا اندام شہر پر پرج کے تذکروں سے لبریز ہیں لیکن اس بچ کا تفصیلی انعام صرف انہی لوگوں کے نام کے خطوں میں ہے جو یا تو خود مہلی کے رہنے والے تھے یا اس کے مختلف حصوں سے پوری واقفیت رکھتے تھے بقیہ خطوں میں تفصیلی ذکر موجود نہیں جامع مسجد کے گرد میدان | میر ہمدی حج روج کو لکھتے ہیں :-

جامع مسجد کے گرد بچپن میں فٹ گول میدان تھے کھانڈو کھانڈو حویلیاں ڈھائی جائیں گی  
دارالبقا فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اندکا۔ خان چند کا کوچہ شاہ بولا کے بڑے ٹمک ڈمک کا۔  
دوروں طرف پھاؤڑہ چل رہا ہے۔

کشمیری کٹہر گر گیا | پھر فرماتے ہیں :-

کشمیری کٹہر گر گیا ہے وہ اونچے اونچے دروازہ بڑی بڑی کھٹیاں دور وہ نظر نہیں آتیں  
کہ کیا ہوئیں۔ آہنی رشک کا آنا اور اس کی رہ گزرا صاف ہونا ہنوز ملتوی ہے۔  
دکانوں کا اندام اور قین کی بندش | ایک خط میں لکھتے ہیں :-

لوٹنوسا ہندو کی دلی کی باتیں ہیں چوک میں بگیم کے باغ کے دروازے کے سامنے حوض  
کے پاس جو کنواں تھا اس میں رنگے خاشاک ڈال کر بند کر دیا جلی ماروں کے دروازے کے پاس  
کتنی دکانیں ڈھاکر اسٹہ چوڑا کر دیا۔

دہلی کے جنگلے | ایک جگہ فرماتے ہیں :-

بھائی کیا پوچھتے ہو کیا لکھوں، دلی کی سہتی منحصر کسی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ پاندلی چوکا ہر روز  
جمع بازارہ جامع مسجد کا۔ ہفتے سیرت کے پل کی۔ ہر سال میلہ بھول والوں کا یہ پانچوں باتیں  
اب نہیں پھر کس دلی کہاں۔ ہاں کوئی شہر قلعہ ہند میں اس نام کا تھا۔  
میر ہمدی نے اپنے آئے کا ذکر کیا تھا انہیں لکھتے ہیں :-

جامع مسجد کے پاس مفتی عبداللہ بن آذرہ کی قائم کی ہوئی درگاہ تھی۔

تم آئے ہو تو چلے آؤ جانِ شادِ رخاں کے چھتے کی اور رخاں چند کے کوسے کی سڑک کھینچتے جاؤ۔ باقی بنگم کے کوسے کا ڈبنا اور جامع مسجد کے گرو سڑک کا میدان غلٹنا سن جاؤ۔  
 دہلی کی ملت | میرمدی کی آنکھیں دکھنی آگنی تھیں۔ غالب اس آزار کو بھی دہلی کے ہندام کا فخر قرار دیتے ہیں:-

تمہاری آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے کہ جو مکان دہلی میں ڈھائے گئے اور جہاں جہاں  
 سڑکیں نہیں تھیں گرد اڑی اس کو تپنے ازراہ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی۔  
 دہلی کی زبان | میرمدی بھڑوچ نے ایک غزل اصلاح کے لئے بھیجی تھی جس کا مقطع کا مصرعہ یہ تھا  
 میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے

اس مصرعے نے غالب کے سارے درد کا بڑا چھیر دیا فرماتے ہیں:-

میرمدی تجھے شرم نہیں آتی "میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے" اسے اب اہل دہلی ہند  
 ہیں یا اہل حرفہ ہیں یا غاک ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں۔ ان میں سے تو جس کی تعریف کرتا  
 لکھنؤ کی آبادی میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ریاست تو جاتی رہی باقی ہرن کے کامل لوگ جو دنیا  
 اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"فاری کا کنواں بند ہو گیا لال ڈنگی کے کوئیں نکھلم کھاری ہو گئے۔ یہ کھاری ہی پانی پیتے  
 گرم پانی غلٹنا ہے پرسوں میں سوار ہو کر کوئوں کا حال دریافت کرے گیا تھا مسجد جامع سے راج  
 گھاٹ دروازے تک بے ساندہ ایک صحرانق دوق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر چڑھے ہیں اگر  
 اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے یا دکر و سزاگو ہر کے باغیچے کے اس طرف کو کسی بانس شیشیا

غالب کا جو روزنامہ غدر خواہن نظامی صاحب نے مرتب فرمایا ہے اس میں اس اقتباس کو غالب کی حسبِ ملن  
 دہلی میں پیش کیا گیا ہے میرمدی بھڑوچ کے نام کے خط کو غالب کی منتقل تحریر نظر ہونے کے لئے آخری فقرہ میں  
 کے غالب کو حذف کر دیا گیا ہے۔ بلاشبہ غالب کے دہلی سے انتہائی محبت تھی لیکن اس کا ثبوت وہ نہیں جو خواجہ صاحب نے پیش فرمایا  
 بالکل میرمدی کی کچھ غنیمت کہ غالب کی رشوبہ جٹیم کی اس شانِ عراندہ تجویہ کے پیدا کنندہ یقیناً غالب تھے لیکن اس کے سوا بھڑوچ تھے۔

اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فیصل کے کنگورے کھلے رہے ہیں باقی سب اٹ گیا کیشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو اب اپنی سرک کے واسطے کلکتہ دروازہ سے کولمبی دروازے تک میدان ہو گیا پنجابی کٹرہ و صوبی کٹرہ راجی گنج، سعادت خاں کاکٹرہ، جتیل کی بی بی کی حویلی، راجی داس گودام داس کے بھائی صاحب رام کا باغ اور حویلی ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شوگر بھرا ہو گیا اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گودم نہ پایا ہو گیا تو یہ صحرانورد بن کر رہا ہو جائے گا۔

شہر نہیں کیسے ہے، یہ تمام حالات بیان کرنے کے بعد پھر مل سنگ کی طرف آتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ دہلی والے اب بھی اس شہر کی زبان کو اچھا کسے جانتے ہیں۔

اے بندہ خدا آردو باد آردو رلا، آردو کہاں، آردو کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے کیسے۔  
چھاؤنی ہے، وہ قلقلہ نہ شہر نہ یاد آئے نہ۔

دہلی میں جو خوفناک تغیر ہوا تھا اس کو مد نظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر کیا کہا جاسکتا تھا کہ اب یہ شہر نہیں کیسے، چھاؤنی ہے عزیز الدین کو لکھتے ہیں :-

صاحب کیسی صاحبزادوں کی سی باتیں کرتے ہو وائی کو ویسا ہی آباد جانتے تھے جیسی تھی۔  
قاسم جان کی نگلی خیراتی کے پھاٹک سے فتح اللہ بیگ خاں کے پھاٹک تک چلے گئے۔  
ہاں آباد ہے تو یہ ہے کہ غلام حسن خاں کی حویلی ہسپتال ہے اور ضیا الدین خاں کے گھر میں ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اور کالے صاحب کے مکان میں ایک اور صاحب عالی شان انگلستان تشریف رکھتے ہیں..... لال کنوئیں کے محلے میں خاک اڑاتی ہے۔

ہل فوج اور ہل قلم دان کا چٹا بعض حصوں کے اندام میں فوجیوں اور رسول والوں کا اختلاف بھی تھا  
مثلاً غالب فرماتے ہیں :-

خیل خانہ فلک پیرا۔ لال ڈوگی سے عماذی کے سکنات سب گرائے گئے۔ بدلتی سلیم کا کوہ پڑا  
سے ہل فوج (دشمنی والے)، ڈھایا جا رہے ہیں۔ ہل قلم (رسول والے)، بجلتے ہیں پاپان کا روکیے کیا ہوا۔

آغا باقر کا امام باڑہ [آغا باقر کا امام باڑہ ایک مشہور قدیم عمارت تھی لیکن وہ بھی ڈھادی گئی۔ غالب لکھتے ہیں :-

آغا باقر کا امام باڑہ اس کے علاوہ کہ خداوند کا عزا خانہ ہے۔ ایک بڑا قدیم رفیع مشہور  
اس کے اندام کا غم کس کو نہ ہو گا۔ بیاں وہ شرکیں دوڑتی ہیں ایک ٹھنڈی شرک اور ایک  
آہنی شرک مل جان کا الگ الگ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ گوروں کا بارگ بھی مشر میں  
بنے گا۔ اور قلعہ کے آگے جہاں لال ڈوگی ہے ایک بیدان نکالا جائے گا۔  
پھر متفرق عمارتوں کے اندام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-  
کیوں میں دلی کے ویارہ سے خوش نہ ہوں جب اہل شہر ہی نہ رہے شہر کو لے کے  
کیا چلے میں ڈالوں۔

شرکوں کی افواہیں [اندام عمارت کے وقت عجیب افواہیں تھیں کہا جاتا تھا کہ شرکیں غلیں گی  
غالب فرماتے ہیں :-

شرور غل تھا کہ شرکیں غلیں گی۔ اور گوروں کی چھاؤنی بنے گی کچھ بھی نہ ہوا مرہٹ کر  
ایک جاں نثار خان کے چھتے کی شرک غلی ہے۔  
نواب علارالدین خاں کو لکھتے ہیں :-

سیری جان یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے..... ایک کیمپے مسلمان اہل حرد  
با حکم کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہندو۔

شاہی خاندان کے افراد [شاہی خاندان کے افراد کی مصیبتیں قابل بیان نہیں غالب ایک موقع  
پر لکھتے ہیں :-

سزل بادشاہ کے مذکور جوقبہ سیف تھے پانچ پانچ روپے مہینہ ہاتے ہیں اناٹ ہیں  
پر ہزن ہیں وہ کٹنیاں اور جواںیں کہیاں۔

غالب کے دستنبہ اگر وہ میں چھپوادی تھی۔ اس کی چند جلدیں حکام کی نذر کے لئے عمدہ بنوائی

منظور تھیں۔ تفتہ کو لکھا کہ اگر وہ میں جلدیں بھی بنواؤں تفتہ نے غالباً جواب دیا کہ جلدیں اپنے سامنے دلی میں بنو لیجئے۔ اس پر لکھتے ہیں :-

سیرا تفتہ تم بڑے بے دروہ و دلی کی تباہی پر تم کو حرم نہیں آتا۔ بلکہ تم اس کو آباد و چاقو  
یہاں نجد میں تو میرے نہیں صحاف اور نقاش کہاں :-

تفتہ اور کلند کی غنیابی | ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

یہاں شہر ڈھیر ہے بڑے بڑے نامی بازار خاص بازار اردو بازار اور خانم کا بازار  
کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ تھا۔ اب پتہ بھی نہیں کہ کہاں تھے۔ صاحبان اکٹہ و دو کلین  
نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا اور دکان کہاں تھی برسات بھر مینہ نہیں برسا اب تیشہ او  
کلند کی طیفانی سے مکان گر گئے۔

دہلی اور کھنڈ کا مقابلہ | ایک مکتوب میں لکھنؤ اور دلی کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

بھائی لکھنؤ میں وہ امن و امان ہے کہ نہ ہندوستانی عملداری یعنی ملکی حکومت میں  
ایسا امن و امان ہوگا نہ اس فتنہ و فساد و اندرا سے پہلے انگریزی عملداری میں یہ چین ہوگا۔ امر  
و شرف سے حکام کی ملاقاتیں۔ قدر و تعظیم و توقیر پیش کی تقسیم علی العموم۔ آبادی کا حکم عام لوگوں  
کو کمال دئی اور ملطف سے آباد کرتے جاتے ہیں۔

گویا دلی میں نہ حکام امر و شرف سے ملنا پسند کرتے تھے۔ نہ ان کی مناسب توقیر و تعظیم کا  
طرف متوجہ تھے۔ نہ پیش وادوں کو پیشین ملتی تھیں۔ نہ آبادی کا حکم عام تھا اور نہ لوگوں کے ساق  
نرمی اور ملطف کا برتاؤ مرغی تھا۔

سیف الحق سیاح مسافر کے وسط میں لکھنؤ گئے تھے۔ انہوں نے غالباً لکھا تھا کہ

میں بھی عمارتیں ڈھالی جا رہی ہیں جواب میں غالب لکھتے ہیں :-

لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے مگر تم یاد رکھو کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہوگا۔  
یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی۔ بازار اچھے مل جائیں گے جو کیسے گا داد و سے گا۔ اور دلی کے

فساد کے بعد کون نہیں ہے۔ یہاں فساد و فساد چلا جائے گا۔ شہر کی صورت سونے اس  
بازار کے جو قلعہ کے لاہوری دروازے سے شہر کے لاہوری دروازے تک ہے ہر گز  
بگڑ گئی ہے اور بگڑتی جاتی ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے بعد مسلمانوں پر بہت سختیاں ہونے لگی تھیں۔ غالب نے  
لکھنؤ کے مقابلے میں بھی اس کیفیت کو رد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے فرماتے ہیں:-  
وہاں (لکھنؤ) کے صاحب کشتربا در نے جو دیکھا کہ علم میں ہنود بھرے ہوئے ہیں اہل  
اسلام نہیں ہیں۔ ہنود کو اور علاقوں پر بھیج دیا اور ان کی جگہ سب مسلمانوں کو بھرنی کیا۔  
یہ تو آفت دہلی ہی پر ٹوٹ پڑی ہے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی غدر کے الم نامہ کا ایک خوب چٹکاں باب اکابر علم و جاہ کی مصیبتیں ہیں۔ غالب  
کے مکتوبات میں اس کے تعلق بھی کافی مواد موجود ہے مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی دواؤں  
میں معقول کے امام تھے۔ ان کی قدر و منزلت کا یہ عالم تھا کہ جب عدالت دہلی کی سرشتہ واری  
سے مستفی ہوئے تو ذرا فیض محمد خاں والی جھجھنے پانسور دپہ ماہانہ کی تنخواہ ان کے لئے مقرر کر دی  
جب دہلی سے ان کی روانگی کا وقت آیا تو بہادر شاہ اس زمانے میں ولیعہد تھے انہوں نے  
مولانا کو طلب کر کے دو سالہ ملبوس خاص ان کے کندھوں پر رکھ دیا آنکھوں میں آنسو بھرائے  
اور فرماتے لگے:-

شہامے گوید کہ من صحبت مے شوم مرا جز اینکه زیرم گزیریت امایزد و ناداند کز نقط  
دول اول بزباں منے رسد الا بہ ہر ارجہ نقیل

غدر کے بعد مولانا بھی باغیوں کی اعانت سے تہمت ہوئے اور انہیں حبس دوام بہ عبور دریا  
شوری سرائی۔ غالب یوسف میرزا کو لکھتے ہیں:-

مولانا کا حال کچھ تم سے مجھ کو معلوم ہوا کچھ مجھ سے تم معلوم کرو۔ حرافہ میں حکم دوام حبس بحال  
بلکہ تاکید کی گئی کہ جلد دریا سے شوری کی طرف روانہ کرو چنانچہ تم کو معلوم ہو جائے گا ان کا کیا

ولایت میں پہل کیا جاتا ہے کیا ہوتا ہے جو ہوتا تھا سو ہو دیا۔ انا مشرورانہ الیہ راجعون۔  
میاں داد خاں سیاح سیر کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے تو غالب انہیں ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے خط  
میں لکھتے ہیں :-

اں خاں صاحب آپ جو کلکتہ پہنچے ہوا اور سب صاحبوں سے ملے ہو تو مولوی فضل حق کا  
حال بھی طرح دریافت کر کے مجھ کو لکھو کہ اس نے رہائی کیوں نہ پائی۔ وہاں خبر یہ میں اس کا  
کیا حال ہے۔ گزار اس طرح ہوتا ہے۔

مولانا فضل حق نے انڈیا میں ہی وفات پائی غالب نے نامہ غالب میں ایک مکتبہ پرولانا  
کے ایک رسالہ سے اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے "فخر بھٹلا، ختم العلماء، امیر الدولہ مولوی محمد فضل حق  
رحمۃ اللہ علیہ" لکھنا "نامہ غالب" کی ترتیب کے وقت مولانا فضل حق کا انتقال ہو چکا تھا۔

مفتی صدر الدین آزاد [مفتی صدر الدین صاحب آزاد] کے دور آخر کے نہایت فاضل بزرگ تھے۔ دینی  
علوم کے فیضان کا وسیع سلسلہ آپ کی ذات گرامی سے جاری ہوا۔ آپ دہلی کے صدر الصدور تھے  
ایک موقع پر غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ آپ کے سامنے پیش ہوا۔ غالب نے عدالت میں حاضر ہو کر  
جواب دعوے میں یہ شعر پڑھا :-

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کڑاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مفتی صاحب مرحوم مسکرائے۔ غالب کے خلاف ڈگری دے دی لیکن ڈگری کا روپیہ اپنی

جیب سے ادا کر دیا۔

مفتی صاحب کے ساتھ غالب کے تعلقات نہایت گہرے تھے غد میں ان پر بھی آفت نازل

ہوئی یہ داستان خود غالب ہی کی زبان سے سنئے :-

حضرت جناب مولوی صدر الدین صاحب بہت دن حالات میں رہے کرٹ میں



مقدمہ پیش ہوا اور بجا بیاں ہوئیں۔ آخر صاحبان کو رشتے جان بخشی کا حکم دیا۔ ذکر ہی موقوف  
جاہداد ضبط، ناجا خستہ و تباہ حال لاہور گئے۔ فائنل کشن اور ٹینٹ کو رزے ازرہ ترحم  
نصف جاہداد و اکثر اہشت کی۔ اب نصف جاہداد پر قابض ہیں۔ اپنی جیلی میں رہتے ہیں۔  
کرایہ پر معاش کا مدار ہے۔

حضرت مفتی صاحب کی واکزاشت شدہ جاہداد کا کرایہ صرف چالیس روپیہ مانا نہ تھا۔  
لیکن ان کی نیک نیتی و قربا پروری کا یہ عالم تھا کہ اپنے بعض متعلقین کی اولاد کی پرورش بھی اپنے  
ذمے رکھی تھی، اور اس ذمہ داری سے انقلاب روزگار کے بعد افلاس کے عالم میں بھی انہوں  
نے کنارہ کشی گوارا نہ فرمائی۔ غائب لکھتے ہیں:۔

اگرچہ یہ جاہداد کرایہ، ان کے گزارے کو کافی ہے کس واسطے کہ ایک آپ ایک بی بی  
میں چالیس مہینے کی آمد۔ لیکن چونکہ نام بخش کی اولاد ان کی عمرت ہے اور وہ دس بارہ آدمی  
ہیں لہذا فراغ مالی سے نہیں گزرتی ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثامنہ کے  
ادواخیز ہیں (یعنی ۸۰ برس کے قریب عمر ہے)، خدا سلامت رکھے بہت نفیست ہیں۔

۱۳ دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب کے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱ دسمبر کو حضرت مفتی صاحب پر  
نان گرا تھا۔ پانچ چھ برس اسی حالت میں گزرے ۱۲۰۴ھ میں زمین آرائے وجود ہوئے تھے  
پانچ تالیف و ولادت تھی۔ اسی برس کی عمر میں ۱۲۸۵ھ میں یہ چراغ علم فضل خاموش ہو گیا  
اگلے درجے کی کشائش کا دور بھی انتہائی سلامت روی میں گزارا اور زندگی کے آخری بار سال  
بھی خوشہ بد مصیبتوں کے سال تھے صبر و استقلال کے ساتھ گزارے رحمت اللہ تعالیٰ جامع مسجد  
کے پاس "دار البقا" کے نام سے ایک درسگاہ قائم کر رکھی تھی جو غدر کے بد نزہین شہر کی سکیموں  
کے سلسلے میں منہدم کر دی گئی۔

مصطفیٰ خاں شفیقہ انھما کے ایک نہایت عزیز و دوست اور مخلص قدر داں نواسے مصطفیٰ خاں شفیقہ تھے۔

جو ایک باندہ پایہ امیر ہونے کے علاوہ زہد و انقضاء علم و فضل اور ذوق شعر و سخن کے اعتبار سے  
 دور آخر کے ایک نہایت گرامیہ وجود تھے نواب صاحب کے حرم عظیم الدولہ سر فزا الملک نواب مرتضیٰ  
 خاں بہادر مظفر جنگ کے صاحبزادے تھے ۱۸۰۳ء میں لاہور کے دہلی فتح کی تو نواب مرتضیٰ خاں  
 بہادر کو حن خدمات کے صلے میں ہوڈل پول کا علاقہ بطور جاگیر عطا ہوا تھا ۱۸۱۴ء میں جاگیر آباد  
 کا علاقہ جو راجہ بھووس رائے کی ملکیت تھا خرید لیا۔ نواب مرتضیٰ خاں کا انتقال ہوا تو ہوڈل پول  
 کی جاگیر واپس لے لی گئی اور اس کے عوض ارکان خاندان کی پنشنیں مقرر کر دی گئیں چھٹے ۱۸۵۵ء  
 تک جاری رہیں۔ جاگیر آباد کا علاقہ نواب مرتضیٰ خاں نے اپنی زندگی ہی میں نواب مصطفیٰ خاں کے نام  
 منتقل کر دیا تھا ۱۸۵۵ء (مطابق ۱۲۳۴ھ) میں نواب صاحب نے حج کا سفر اختیار فرمایا جس کے تفصیلی  
 حالات ان کے سفر نامہ موسوم بہ "رہ اور وائیں" مرقوم ہیں، عند کے دنوں میں وہ جاگیر آباد میں  
 تھے جب نندہ و فساد کی ہمہ گیری کے باعث یہ مقام خطرے میں پڑ گیا تو نواب صاحب نے  
 چھوڑ کر اپنے دوست عبداللطیف خاں کے پاس خان پور چلے گئے۔ ٹھاکروں نے قلعہ جاگیر آباد  
 پر قبضہ کر لیا۔ نواب صاحب کے عالی شان محلوں میں آگ لگا دی۔ سارا قیمتی سامان جلا کر خاک کر ڈالا۔  
 حتیٰ کہ ان کا گراں بہا کتب خانہ بھی شعلوں کی نذر ہو گیا جس اتفاق سے رام پور کی فوج اس سے  
 سے گزری اور اسے حالات کا علم ہوا تو اس فوج نے ٹھاکروں کو شکست دے کر جاگیر آباد پر  
 نواب صاحب کو دوبارہ قبضہ دلا یا لیکن نیزگی روزگار ملاحظہ ہو کہ یہ تمام نقصان اودھ میں اٹھانے  
 کے بعد نواب صاحب پر باغیوں کی اعانت کا الزام لگا دیا گیا کہ وہ گزرتا ہو گئے اور نہ محض ان کی جاگیر  
 ہی ضبط ہوئی بلکہ سات سال کی قید کی سزا بھی ہو گئی۔ غارت گیتے ہیں :-

مصطفیٰ خاں کا حال سنا جو گا خدا کرے مراحہ میں چھوٹ جائے در نہ میں ہفت سالہ

کی تاب اس نادر پروردہ میں کہاں -

جنوری ۱۸۵۹ء میں ان کی تقصیر معاف ہوئی۔ غالب فرماتے ہیں :-

۱۔ مخلصانہ مقدمہ کاپات حسرتی و شیفہ مرتبہ جناب نظامی بدایونی -

نواب مصطفیٰ خاں بیسوا دسات برس کے قید ہو گئے تھے سوان کی تقریر حاف ہوتی اور ان کو رہائی ملی صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہانگیر بادشاہ کی زمینداری اور دینی املاک اور پنشن کے باب میں ہنود کچھ حکم نہیں ہوا۔ لاچار وہ رہا ہو کر میرٹھ میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرے ہیں۔ یہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیچہ کر میرٹھ گیا ان کو دیکھا چاروں ٹاں رہا پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔

مفت روسا ادہلی کے ماتحت روسا کی کیفیت و مشن کے دور سے بیان ہو چکی ہے اردو کا تئیس باب لکھتے ہیں :-

آگے کے درباروں میں سات جاگیر دار رکھتے کہ ان کا الگ الگ دربار ہوتا تھا۔ چھوٹا بلب گڑھی، فنجنگر، دو جانہ، پاٹودی، لوہارو، چار بندو مخص ہیں اول الذکر چار، جو باقی کے ان میں سے دو جانہ، لوہارو و سخت حکومت الہی حصار، پاٹودی حاضر، اگر کسی حصار کے کشتہ بادران دونوں کو بیاں لے آتے تو تین رئیس ورنہ ایک رئیس۔ دربار عام والے دیان لوگ سب موجود۔ اہل اسلام میں سے صرف تین آدمی باقی ہیں۔ میرٹھ میں مصطفیٰ خاں سلطان جی میں مولوی صدر الدین۔ بلی ماروں میں سائیکس برہمنوں مردود، مطرود، مخروم، منہوم

ٹوٹ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو لب

آسمان سے بادۂ کلفام گو برسا کرے

پہلے انالہ کے ایک عزیز شاگرد میراجدین میکیش تھے۔ اس بیچارے کا کوئی جرم اور کوئی قصور نہ تھا۔ غالب، زوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں میکیش کے متعلق لکھتے ہیں :-

میکیش چین میں ہے۔ باتیں بنا تا پھرتا ہے۔ سلطان جی میں تھا۔ اب شہر میں آ گیا ہے دو تین بار میرے پاس بھی آیا۔ پانچ سات دن سے نہیں آیا۔ کہتا تھا کہ بی بی کو اور لڑکے کو ہرام پر دروازہ علی کے پاس بھیج دیا ہے خود بیاں لوٹ کی تمنا میں خریدتا پھرتا ہے۔

اسی حالت میں وہ غریب گردن رہا اور پھانسی کی شہر پا گیا۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :-

احمد بن سیکش کا حال کچھ تم کو معلوم ہے یا نہیں مثنوی ہوا یعنی پھانسی پا گیا، گویا اس نام کا آدمی شمشیر تھا ہی نہیں۔

ایک خط میں غالب اپنے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے سیکش کا تذکرہ خاص کر فرماتے ہیں۔  
اس چرخ کج رفتار کا بڑا ہوم ہے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ ملک مال جاہ و جلال کچھ نہیں رکھتے تھے  
ایک گوشہ و گوشہ تھا چند مجلس و بے نوا ایک جگہ فراہم ہو کر کچھ ہنس بول لیتے تھے۔  
سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اسے فلک  
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر کھیت

یاد رہے یہ شعر غازی میر درد کا ہے۔

اس سے سیکش مجھ کو بہت یاد آتا ہے سو صاحب اب تم دیر مدی مخرج ہی بناؤ کہیں تم کو  
کیا لکھوں۔ وہ صحتیں اور تقریریں جو یاد کرتے ہو اور تو کچھ بن نہیں آتی مجھ سے خط پر خط لکھو لے ہو۔  
آنسوؤں سے پیاس نہیں بھتی یہ تحریر تلافی اس تقریر کی نہیں کر سکتی۔

غلام فخر الدین علی بخش خاں برجنورد کے صاحبزادے اور غالب کے بھائی میرزا یوسف خاں کے ولاد  
غلام فخر الدین خاں بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ وہ بہادر شاہ کی جاگیر کوٹ قاسم کے نظم  
تھے اور بادشاہ کے حکم کے مطابق وقتاً فوقتاً روپیہ بھیجتے رہے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-  
غلام فخر الدین خاں کی دو رو بھاریاں ہوئی ہیں صورت اچھی ہے خدا چاہ تو رانی ہو جائے۔  
حکیم غلام نجف خاں نے غلام فخر الدین خاں کی رانی پر لکھا تھا کہ دوبارہ زندگی پائی۔  
غالب لکھتے ہیں :-

اے غلام فخر الدین خاں کی رانی زندگی دوبارہ ہے۔ خدا تم کو مبارک کرے۔

بہادر شاہ بہادر شاہ غفران مکان کے متعلق غالب کے اردو مسکاتیب میں صرف دو جگہ ذکر ہے اول  
میرمدی مخرج نے پوچھا تھا کہ دستنیز ہیں بہادر شاہ کے دہلی سے رخصت ہونے کے حالات  
کیوں نہیں لکھے۔ غالب فرماتے ہیں :-

بھائی میں نے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے ۲۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک کا حال لکھا ہے اور خاتمہ میں اس کی اطلاع دے دی ہے۔ امین الدین خاں کی جاگیر کے ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیوں کر لکھتا ان کو جاگیر گست میں ملی بادشاہ اکتوبر (۱۸۵۸ء) میں گئے کیا کرتا اگر تحریر موقوف نہ کرتا۔

دوسری جگہ بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ہے :-

۲۷ نومبر (۱۸۵۷ء) مطابق ۱۴ جمادی الاول سال جمعہ کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قیصر سے آزاد ہوتے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

دیکھنے کو یہ چنار الفاظ ہیں لیکن ایک ایک لفظ کی تہ میں درد اور حزن کا دریا موجزن نظر آتا ہے۔ شاہی خاندان | شاہی خاندان کے افراد کے متعلق بعض تحریرات اوپر گزر چکی ہیں مثلاً بہت سے شہزادوں مارا جانا بعض کا قید ہونا۔ جو تلوار سے نیچے تھے ان کا پانچ پانچ روپے پنشن پانا۔ خواتین گوناگوں مصائب میں مبتلا ہونا۔ غالب ان حالات سے بے حد متاثر تھے۔ اور معمولی سا بہرہ مل جانے پر بھی اپنے اس درد کے اظہار کے لئے مضطرب ہتے تھے۔ منشی ہرگوپال تفتہ۔ اپنی کتاب "سنبلستان" چھو کر غالب کو بھیجی۔ اس کی چھپائی بہت خراب تھی۔ غالب۔ چھپائی کی خرابی ہی کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور بد حالیوں کے ذکر کا ذریعہ بنا فرماتے ہیں :-

اجی میرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ مانے کیا بُری کجائی ہے .... اس کجائی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے۔ اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پانچ لیر لیر جو تو ٹوٹی۔ یہبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبلستان ایک معذوقہ خور ہے مگر بد لباس ہے۔

تاج علی بیگ | ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

تاج علی بیگ بہادر شاہ مرحوم مرزا قیصر اور مرزا جواں نخت کے سلسلے ولایت علی بیگ جے پوری کی

زوجہ ان سب کی الہ آباد سے رٹائی ہو گئی، دیکھئے کیسے پھنس رہیں یا لندن جائیں۔  
 مرزا الہی بخش | دوسرے اکابر و اجاب کے اور خود اپنے حالات یوں بیان فرماتے ہیں :-  
 مرزا الہی بخش جو شہزادوں میں ہیں ان کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں، دیکھئے  
 کیا ہو۔ حکیم جی کو حکیم حسن اللہ خاں، ان کی حویلیاں مل گئی ہیں۔ اب وہ مع قبائل ان مکانوں میں  
 جا رہے ہیں ان کا حکم ان کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رٹائیں ہی  
 تو بیکی وغیرہ ہی ترا کہے پرسد

نہ جنا نہ سزا، نہ نفوس نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف نہ قہر، بندہ دل پہلے تک دن کو روٹی اور  
 رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے۔ کپڑا یا تم نعم کا بنا ہوا ابھی ہے  
 اس کی کچھ فکر نہیں۔

ایک اور خط میں مرزا الہی بخش کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :-  
 میرزا الہی بخش کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے۔ انہوں نے زمین پر کھڑی ہے سلطان جی میں بہتے  
 ہیں عذر کر رہے ہیں، دیکھئے یہ جبراً کھجائے یا یہ خود اٹھ جائیں۔  
 حکیم حسن اللہ خاں | حکیم حسن اللہ خاں کے متعلق حکیم غلام محف خاں کو لکھتے ہیں :-  
 میاں تم کو مبارک ہو کہ حکم پر سے وہ سپاہی جو ان کے اوپر متعین تھا اٹھ گیا۔ اور ان کو حکم ہو گیا  
 کہ اپنی وضع پر رہو۔ مگر شہر میں رہو۔ باہر جانے کا اگر قصہ کرو تو پوچھ کر جاؤ اور ہر سفتہ میں ایک  
 کھری میں حاضر ہوا کرو۔ چنانچہ وہ کچے باغ کے پھوٹے مرزا جاکن کے مکان میں آ رہے ....  
 جی ان کو دیکھنے کو چاہتا ہے مگر از روئے احتیاط نہیں جاسکتا۔

بعض دوسرے اشخاص کے متعلق فرماتے ہیں :-  
 میرزا بہادر بیگ نے بھی رٹائی پائی۔ اس وقت مناسب ہے کہ وہ خاں صاحب کے پاس آئے یہ  
 یقین ہے کہ بعد ملاقات باہر چلے جائیں گے۔ یہاں نہ رہیں گے۔ قدم شریف میں رہتے ہیں  
 آج پانچواں دن ہے کہ حکیم محمود خاں مع قبائل و عشائریٹھیا لگے ہیں بہ مقتضائے وقت

اپنی سکونت کے مکان کو چھوڑ کر میاں آ رہا ہوں۔ اس طرح کہ محل سڑ میں نہ اور دیوان خانہ میں نہ اور

توٹا اکابر پھر فرماتے ہیں :-

ہے یہ کیوں کر نکھوں حکیم رضی الدین احمد خاں کو قتل عام میں ایک غامی نے گولی مار دی اور احمد حسین خاں ان کے چھوٹے بھائی اسی دن مارے گئے۔ طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹہکے رخصت لے کر آئے تھے غدر کے سبب جان سکے ہیں رہے اور بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو چھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں زندہ ہیں پریقین ہے کہ مروہ سے پڑے ہوں گے۔ میر جھوٹم نے بھی چھانسی پائی۔ حال صاحبزادہ میاں نظام الدین دابن شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں کا یہ ہے کہ جہاں سب اکابر شہر سے بھاگے تھے۔ وہاں وہ بھی بھاگ گئے تھے۔ بڑوہ میں رہے اور نگ آباد میں رہے، حیدر آباد میں رہے۔ سال گزشتہ جاؤں میں یہاں آئے۔ سرکار سے ان کی صفائی ہو گئی لیکن عرف جان بخشی۔ روشن الدولہ کا درسہ جو عقب کو تو اسی چوبندہ ہے، وہ اور خواجہ قاسم کی حویلی جس میں نعل علی خاں مرحوم رہتے تھے وہ اور خواجہ صاحب کی حویلی پیدا ملک خاص حضرت کالے صاحب کی اور کالے صاحب کے بعد میاں نظام الدین صاحب کی قرار پاکر ضبط ہوئی۔ اور نیلام کاروپہ سرکاریں داخل ہوا۔ ہاں قاسم جان کی حویلی جس کے کاغذ میاں نظام الدین کی والدہ کے نام کے ہیں۔ وہ ان کو یعنی میاں نظام الدین کی والدہ کو مل گئی۔ فی الحال میاں نظام الدین پاکپٹن گئے ہیں شائد بہاول پور بھی جائیں گے۔

خاندان فرخ عالم شیخ کلیم اللہ جان آبادی اپنے زمانے کے بہت بڑے اور مشہور اہل اللہ تھے۔ ان کا مقبرہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان میدان میں ہے۔ یاد شہسوی کے زمانے میں مقبرے کے آس پاس ایک اچھا گاؤں آباد تھا جس میں شیخ مرحوم کی اولاد رہتی تھی۔ اسی خاندان میں سے لانا فر الدین رحمۃ اللہ علیہ مرید تھے جن کے پوتے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں تھے۔ کالے میاں بہادر شاہ کے پیر تھے۔ میرزا بہیم علی خاں سورتی نے شیخ کلیم اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں اور قطب الدین

ابن مولانا فخر الدین کے حالات طلب کیے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

خداوند نعمت کیا تم دہلی کو آباد اور قلعہ کو معمر اور سلطنت کو بہ دستور سمجھتے ہو جو حضرت شیخ کا  
کلام اور صاحبزادہ قطب الدین ابن مولانا فخر الدین علیہ الرحمۃ کا حال پوچھتے ہو۔ ایسا ذکر  
مکا و خورو، گاؤں راقصاب برد، و قصاب در راہ مرد، بادشاہ کے درم تک یہ باتیں نہیں بخود  
میاں کا لے صاحب بنفہور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ میسے چھاڑ دیکھو وی کا غذا کا پرزہ اسونے  
کا تار شمشینہ کا بال باقی نہ رہا شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کا مقبرہ اُڑ گیا۔ ایک اچھے کاؤں کی  
آبادی تھی۔ ان کی اولاد کے لوگ تمام اس موضع میں سکونت پذیر تھے۔ اب ایک ٹھیل ہے  
اور میدان میں قبر اس کے سوا کچھ نہیں۔ وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے  
تو خدا ہی جانتا ہو گا کہ کہاں ہیں۔ ان کے پاس شیخ کا کلام بھی تھا کچھ تبرکات بھی تھے  
اب جب وہ لوگ ہی نہیں تو کس سے پوچھوں کیا کروں، کہیں سے یہ دعا حاصل نہ ہو گا۔

حسام الدین حیدر کے فرزند مبارک الدولہ ممتاز الملک نواب حسام الدین حیدر خاں بہادر حسام جنگ دہلی  
کے ایک بہت بڑے امیر تھے۔ بنا گیا ہے کہ اصل لکھنؤ کی طرف کے تھے لیکن دہلی میں مستقلاً  
سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ بلی ماروں میں جہاں غالب رہتے تھے ان کی عظیم الشان جلی تھی  
نواب صاحب شاعر بھی تھے۔ نامی تخلص حسام تے تھے۔ ان کے ساتھ غالب کے روابط  
بہت گہرے تھے انہوں نے ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے معین الدولہ عمدۃ الامر  
صفدر الملک سید ذوالفقار الدین حیدر نظارت خاں بہادر ذوالفقار جنگ حسین مرزا کے نام  
سے مشہور ہیں غالب کے گہرے دوست تھے حسین میرزا آغا حیدر میرزا ناظر بہادر شاہ کے امار  
تھے اور ناظر صاحب کی وفات کے بعد نظارت کا کام حسین میرزا ہی کے حوالے ہوا تھا۔ غدر  
میں ان پر جو آفت نازل ہوئی اس کی کیفیت "دستنبو" کے حوالے سے اور بیان ہو چکی ہے۔  
یعنی وہ اور ان کے بھائی مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں اپنے اہل و عیال کو لے کر شہر سے



غل گئے۔ ان کا مکان بے طرح ٹوٹا گیا۔ اس کے بعد مکان کو آگ لگا دی گئی۔ منظر الدولہ الوری  
پہلے آئے اور گوڑا گاؤہ میں گولی مار کر شہید کر دیئے گئے۔ حسین میرزا بیچارے سرسیمہ حال پھر  
رہے تھے۔ اسی اثنا میں غالب کو اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

حسین میرزا صاحب کیوں بیمار ہوئے۔ خدا یا ان آوار مکان دشت غربت کو جمعیت تو  
جب چاہے غایت کر۔ مگر تصدق مرتضیٰ اعلیٰ کا تندرست رکھ۔ اللہ اللہ حسین میرزا کی ڈرگیا  
سفید ہو گئی۔ یہ شدت غم و بیخ کی غویاں ہیں۔

حسین مرزا کی امداد ایک وقت تھا کہ غالب حسین مرزا کے والد کی وساطت سے قرض لینے  
تھے لیکن جب حسین مرزا پراختا و مصائب کا سیلاب آیا اور وہ بیچارے پیسے پیسے کو محتاج  
ہو گئے تو غالب حصول قرض کے لئے حسین مرزا کے متوسل بنے ایک خط میں وہ حسین مرزا  
لکھتے ہیں:-

ابھی جتنی لال مہار اور مغواہ آیا تھا۔ تمہارا حال پوچھتا تھا۔ کچھ بیج جھوٹ کہہ کر اس کو راہ  
بر لایا ہوں۔ کہ سود و سوروپیہ تم کو بھیج دیے۔ بیویوں کی طرح تقریر اس کو سمجھانی سپ کہ لالہ  
جس درخت کا پھل کھانا منظور ہو تمہارے اس پانی دیتے ہیں۔ حسین مرزا تمہارے کھیت میں  
پانی دو تو انج پیدا ہو۔ بھائی کچھ تو نرم ہو اسے تمہارے مکان کا پتہ لکھو اور کہ گیا ہے  
اور کہ گیا ہے کہ میں اپنے بیٹے راجی داس سے صلاح کر کے جو بات ٹھہرے گی آپ سے اگر  
کہوں گا۔ اگر وہ روپیہ بھیج دے تو کیا کہنا ہے۔ اور اگر وہ خدا لکھے اور تم اس کا جواب لکھو تو یہ  
مزدور لکھنا کہ اسد اللہ نے جو تم سے کہا ہے وہ سچ ہے۔ اور وہ امر نامہ میں آئے والا ہے۔

یوسف میرزا نواب حسام الدین حیدر خاں کے نواسے اور منظر الدولہ سیف الدین حیدر  
خال اور ذوالفقار الدہ حسین مرزا دجن کو غالب بعض اوقات ناظر جی لکھتے ہیں) کے بھانجے  
تھے۔ یوسف مرزا نے غالباً مصائب کے عالم میں اپنے نانانانی کی خوشحالی کے زمانے کا ذکر کیا تھا

## غائب انہیں لکھتے ہیں

”ماما ماما کے مرے کا ذکر کیوں کرتے ہو وہ اپنی ہل سے مرے ہیں بزرگوں کا مرنا  
 بنی آدم کی میراث ہے۔ کیا تم یہ چاہتے تھے کہ وہ اس عہد میں ہوتے اور اپنی آبرو کھو؟  
 ہاں مظهر الدولہ کا غم منجملہ واقعات کر بلائے ہوئے ہے یہ دواغ ماتم جیتے جی نہ مٹے گا۔  
 ہجوم پنج و غم پھر یوسف مرزا ہی کو لکھتے ہیں :-

میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے توانی  
 ہو جاتے ہیں عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت تنکیرہ میں فرق آگیا ہے  
 تو کیا عجب ہے۔ بلکہ اس کا باور نہ کرنا غصہ ہے، پوچھو کہ کیا غم ہے؟ غم مرگ، غم فراق، غم ذوق  
 غم عزت، غم مرگ میں، قلعہ نامساوی سے قطع نظر کر کے ہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظهر الدولہ میرزا ناصر  
 میرزا عاشور بیگ میرا بھائی اس کا بیٹا احمد مرزا امیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن غلام الدولہ  
 اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں۔ قاضی فیض اللہ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں  
 کے برابر نہیں جانتا تھا؟ اسے لوجھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میرا احمد حسین میکیش۔ اللہ اللہ  
 ان کو کہاں سے لاؤں؟ غم فراق حسین مرزا، یوسف مرزا، میر محمدی میر سرفراز حسین، حسین خاں  
 خدا ان کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ ہاں ہوتے خوش ہوتے۔ گھرانے کے بے چراغ، وہ خود اللہ  
 سجاد اور کبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ  
 سکتا ہے۔ مگر میں ملی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے غم میں  
 عالم میری نظر میں تیرہ دوتا رہے..... یہاں اغنیا، وامر کے اولاد و زواج بھیجک مانگتے  
 پھر میں ادیس دیکھوں!

سچی ہمدردی حسین مرزا نے ایک موقع پر پریشان ہو کر لکھا تھا کہ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں۔  
 اس پر غائب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :-

تمہارے ماموں حسین مرزا کی دستخطی تحریر نے جو میرا حال کیا ہے۔ وہ کس زبان سے

کردوں۔ ہے ہے۔ حسین مرزا اور یہ کہے کہ میں کہاں جاؤں اور کیا کروں اور مجھ کو بخت سے  
 اس کا سر انجام نہ ہو سکے! بہت بڑا آسرا تھا اور سرکار کی خدمت نہ سہی۔ عمدہ نہ سہی، تھا  
 نہ سہی سو ڈیڑھ سو روپیہ و راہمہ مقرر ہو جاتا کیا شکل تھا دلی کے آدمی خصوصاً امرار شاہی ہر  
 شہر میں بدنام اتنے ہیں کہ لوگ ان کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ مرشد آباد بھی ایک سرکا  
 تھی۔ حیدر آباد بہت بڑا گھر ہے مگر بے ذریعہ و واسطہ کیوں کر جائے اور جائے تو کس لئے۔  
 ناچار وہیں رہو کسی طرح شاہ اودھ کا سامنا ہو جائے۔

آخری فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین مرزا کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں اجد علی شاہ  
 کے اہل کوشش کر رہے تھے۔ غالباً اس بنا پر کہ حسین مرزا کے والد لکھنؤ کے تھے۔  
 فرخ آباد کی ریاست ضبط اعذر کے بعد فرخ آباد کی ریاست بھی ضبط ہو گئی تھی اور فضل حسین خاں ولی  
 فرخ آباد کی جان بخشی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے جائیں چنانچہ وہ  
 ہندوستان سے ہجرت کر کے عرب چلے گئے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں :-  
 مجھ کو رشک آتا ہے۔ جزیرہ نشینوں کے حال پر دینی انڈیان کے قیدیوں پر عموماً اور  
 رئیس فرخ آباد پر خصوصاً کہ جاز سے آمار کر سز میں عرب پر چھوڑ دیا۔ اے اے اے

پڑے گریہ ریز کوئی نہ ہو تیار دار

اور اگر مر جائیے تو نوہ خواں کوئی نہ ہو

عام نیازی ایک اور مکتوب میں عام تباہ حالی کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-  
 امر آگ اسلام میں سے اموات گنوجین علی خاں بٹے باپ کا بیٹا۔ سو روپے روز کا فٹن ار  
 سو روپے مینے کار و زینہ دار بن کرنا مراد نہ کر گیا میرزا ناصر الدین باپ کی طرف سے پیر زادہ، نانا  
 اور نانی کی طرف سے امیر زادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہوگا  
 ہے۔ بیمار پڑا نہ دوا نہ غذا انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا ذوالخیر الدین احمد خاں کی سرکار سے

لکھنؤ کا خاندان ملی کا بہت بڑا خاندان تھا۔

تجزیہ و کفین ہوئی۔ راجا کو پوچھو ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آگیا ہے اس کے پاس ایک میا نہیں شیکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو لگیا ہے مگر دیکھتے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڑے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت چلے گئے خیر والدولہ کے پاس سو روپے کے املاک و اگر اہست ہو کر پھر قرق ہو گئے۔ تباہ و برباد لاہور گیا وہاں پڑا ہوا ہے دیکھتے کیا ہو۔ قصہ کوتاہ قلعہ اور بھجھ اور بہادر گڑھ اور لب گڑھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں بٹ گئیں شہر کی ایتنی خاک میں مل گئیں۔

لوہارو والوں کے اموال و امکنہ کے لٹ جانے کا حال اور عرض کیا جا چکا ہے غارت زدہ اشیاء کی بیش بہائی کا کون اندازہ کر سکتا ہے صرف کتب خانہ کی قیمت کا اندازہ بیزار روپے تھا جن میں غالب کی اپنی نظم و نثر کے مجموعے بھی شامل تھے۔

حامد علی خاں نواب حامد علی خاں دہلی کے ایک بہت بڑے رئیس تھے۔ یہاں شاہ کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ یہ اعتماد الدولہ فیصل علی وزیر نصیر الدین حیدر پادشاہ اودھ کے داماد تھے۔ اور اعتماد الدولہ کے انتقال کے بعد دہلی چلے آئے تھے۔ مگر میں ان پر بھی اتنی نازل ہوئی ان کی ساری جائیداد ضبط ہو گئی۔ غالب ایک جگہ حسین مرزا کو لکھتے ہیں :-

مکانات کو حامد علی خاں کا کہہ کر کیوں لکھتے ہو۔ وہ تو مدت سے ضبط ہو کر سرکار کا مال بن گیا بارغ کی صورت بدل گئی محل مراد کو بھی میں گورے رہتے ہیں اب پھاٹک و رسمہ مفر کا گرا دی گئیں سنگ و خشت کا نیلام کر کے روپیہ داخل خزانہ ہوا مگر یہ سمجھو کہ حامد علی خاں کے مکان کا بلکہ بجا ہے، سرکار نے اپنا مملوکہ و مقبوضہ ایک مکان ڈھا دیا ہے۔

ایک اور خط میں غالب فرماتے ہیں کہ حامد علی خاں کراہی کے مکان میں مع اپنی مستوعہ

لے مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں سے نواب غلام محی الدین خاں عرف بڑے صاحب دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے ایک ہزار روپیہ یا نہ نہیں تھی۔ نین سو روپے یا نہ بھرت پور سے ملتے تھے پاس روپے مااندہ لایا تھا سب حکیم مکن الدولہ کے بیٹے تھے۔ دہلی کے بہت بڑے رئیس تھے۔ غدر کے بعد ہائی پت چلے گئے تھے وہاں سے کہلاتے

ہے رہتے ہیں۔

مفتیاں | دہلی میں غدر کے بعد عام سختیوں کا دور شروع ہو گیا تھا کہ کسی کو بے انصافی کی تلافی  
یا توغ نہ رہی تھی۔ غالب حسین مرزا کو لکھتے ہیں :-

تم اب تک سمجھ نہیں کہ حکام کیا سمجھتے ہیں اور نہ یہی سمجھو گے جو احکام کہ دلی میں ہیں وہ  
احکام قضا و قدر ہیں۔ ان کا کوئی مرافعہ نہیں۔

ب لطیفہ | انگریز حکام کی بے خبری اور ناواقفیت احوال اہل ہند کے متعلق ایک عجیب لطیفہ  
ہا ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غدر کے بعد جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں یا جن کی جائیداد  
نہا لی گئی ان کے مفروضہ یا حقیقی جرائم کا امتحان کرنے والے اور ان پر حکم لگانے والے لوگ  
پسے تھے۔ دہلی کے آدمیوں میں ایک حافظ محمد بخش تھے جو حافظ موموں کے نام سے مشہور تھے۔ وہ  
ہی غدر میں پکڑے گئے لیکن بے گناہ ثابت ہو کر رہائی پا گئے۔ بعد ازاں انہوں نے املاک  
لی وکرائش کے لئے درخواست دی۔ ان کا مقصد تصرف ثابت تھا۔ صرف حکم کی دیر تھی لیکن جب  
تقدیم پیش ہوئی سائنس آئی تو

حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ میں پچھو پچھا کہ حافظ موموں کون؟ عرض کیا  
کہ میں اہل نام میر محمد بخش ہے۔ "موم" موموں مشہور ہوں۔ (صاحب نے) فرمایا کچھ بات  
نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ اور حافظ موموں بھی تم۔ ساما جان بھی تم جو دنیا میں ہے وہ بھی  
تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ سل دخل دفتر ہوئی۔ میاں موموں اپنے گھر چلے آئے۔

جامع مسجد | غدر کے بعد جامع مسجد بھی سرکاری قبضے میں چلی گئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ شہر پر  
انگریزوں کے حملے کے وقت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے جامع مسجد سے نکل کر حملہ  
کیا تھا اور انگریزی فوج کو مار کر پیچھے ہٹا دیا تھا۔ یا اس وجہ سے کہ انگریزوں کے دل میں خیال نہ گیا  
تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لئے جہاد کی خاص وعظ گاہ ہے۔ بہر حال بعض انگریزوں نے تجویز  
پیش کی تھی کہ مسجد کو گر جانا لیا جائے مسلمان کو ششیں کر رہے تھے کہ مسجد و انگریز کر دی جائے۔

غالب ایک مکتوب میں سیاح کو لکھتے ہیں :-

مسجد جامع کے باب میں کچھ پیشین لاہور سے آئی ہیں۔ یقین ہے کہ واگزار سیاح کا حکم آئے اور وہ مسلمانوں کو مل جائے ہنوز بہ دستور پر رہ لگا ہوا ہے اور کوئی جانے نہیں پاتا۔

اس خط پر دن اور تاریخ درج ہے یعنی صبح شنبہ ۲ فروری قعدہ دوسری سال ۱۲۹۱ھ میں نیز اسی خط میں سیاح کو سورت پہنچنے پر مبارکباد دی گئی ہے۔ غالب کے مختلف مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح جون ۱۸۶۷ء میں لکھنؤ میں تھے۔ دسمبر ۱۸۶۶ء میں بنارس میں اکتوبر ۱۸۶۷ء اور نومبر ۱۸۶۷ء میں وہ کلکتہ میں نظر آتے ہیں۔ ۱۶ اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ سیاح سورت میں نواب میر غلام بابا خاں کے پاس تھے۔ سیر خیال ہے کہ اوپر کا خط دسمبر ۱۸۶۲ء مرقوم ہے۔ گویا غدر سے پانچ برس بعد تک مسجد جامع پر سرکاری قبضہ تھا۔

دسمبر ۱۸۶۲ء کے ایک مکتوب میں سیرمدی بخروج کو لکھتے ہیں :-

مسجد جامع واگزاشت ہو گئی تہی قبر کی طرف ریڑھیوں پر کبابیوں نے دکانیں بنائیں انڈیا مرغی کبوتر بچنے لگا۔ دس آدمی ہتھم ٹھہرے مرزا علی بخش مولوی صدیق الدین تفضل حسین خاں تین یہ سات اور

شہری بربادی | قاضی عبد الجلیل بریلوی نے اسی زمانے میں غالب کے نثر و نظم کے مجموعے مانگے جواب میں غالب فرماتے ہیں :-

یہ شہر بہت فحاش زدہ ہے، نہ اشخاص باقی نہ اکثرت کتاب فروشوں سے کہہ دوں گا اگر سیری نظم و نثر کے رسالوں میں سے کوئی رسالہ ملے گا تو وہ مولے کے خدمت میں بھیج دیا جائے گا۔ اکابر شہر اور غور غالب کی مصیبتوں کے اور بھی کئی موقع ہیں لیکن وہ غالب کی نشین کی بنا بیان میں پیش ہوں گے۔

نزدیک تین سو اتفاق یہ کہ غدر کے بعد دہلی پہلے دسمبر ۱۸۶۲ء میں دہلی میں شکار ایک تہہ بڑھ چلا گیا ایک تہہ

کے ہٹ لٹا ایک تیرہ سات اتنی شدت سے ہوئی کہ بہت سے مکان گر گئے۔ اور میں خراب ہو گئیں  
 غالب ولی کی تمام مصیبتوں کا تذکرہ مجھلا اور برسات کا تذکرہ مفصلاً ان الفاظ میں کرتے ہیں :-  
 برسات کا نام آگیا سر پہلے تو مجھلا سنو۔ ایک قدر کالوں، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ ہند  
 کھانا کا، ایک آفت و بانی۔ ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جیسے حالات کی جامع ہے  
 کچ اکیراں دن ہے۔ آفت ب۔ اس طرح نظر آتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات  
 کو لگی بھی تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جھٹو سمجھنے لگتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں  
 کی بن آئی ہے کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے۔ یہ لفظ نہ سمجھنا نہ پڑا سکا  
 لگے۔ سیکڑوں آدمی جا بجا وب کر مر گئے۔ گلی گلی ندی بہ رہی ہے۔ قصہ غصہ وہ ان کال تھا کٹنی  
 نہ برسات نہ نہ پڑا ہوا تیرہ سات کال ہے۔ پانی ایسا برساکد بڑے ہوئے دانے بہ گئے۔ جنہوں نے بھی  
 نہیں برباد تھا وہ برسے سے رہ گئے۔

پانچ لشکر ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

پانچ لشکر حملہ ہے ور ہے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر اس میں اہل شہر کا اعتبار تھا دوسرے  
 لشکر غازیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و زمین و آسمان و زمین و آسمان سراسر لٹ گئے  
 تیسرے لشکر کال کا اس میں ہزار آدمی بھوکے مرے۔ چوتھا لشکر سیپے کا اس میں بہت سے پرہیزگار  
 مرے پانچواں لشکر تپ کا اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس لشکر نے شہر سے کچ نہیں کیا  
 چھٹے میں دو آدمی تپے بٹلا ہیں ایک بڑا لڑکا (باقول علی خاں) ایک داروغہ دکنو، خدا ان کو جلد  
 اپاہر ہدی نے غالباً پوچھا تھا کہ بیٹھے کی کیفیت کیا ہے اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-  
 وہاں کیا پڑھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ بھی ایک تیر باقی تھا قتل ایسا عام لوٹ لپیٹ  
 کال ایسا بڑا، وبا کیوں نہ ہو۔ سامان الغیبے دس برس پہلے فرمایا ہے

ہر یکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے،

لٹا غازیوں سے مراد انگریزی فوج ہے۔ اور تیرہ تیرہ انگریزی فوج کی وردی کے رنگ پر مبنی ہے۔

وفات کی پیشگوئی غالب نے اپنے متعلق پیشگوئی کر رکھی تھی کہ وہ ۱۲۷۷ھ میں مرجا میں گئے۔ بلکہ ایک قطعہ تاریخ بھی خود ہی مرتب کر لیا تھا۔

من کہ با شتم کہ جاوداں باشم      چوں نظیری نہ ماند و طالب مرد  
وہ پر پسند و رکدا میں مال      مرد غالب بگو کہ غالب مرد

لیکن یہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ اور وہ بیچ رہے اسی سال ہی صغیر کی وبا پھوٹی تھی۔ غالب کو اپنی پیشگوئی کے خلاف نہ مرنے کا ایک دلچسپ عندیہ تھا۔ اگیا میر ہمدی بجز نکھتے ہیں۔۔۔  
میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر ویسے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں بری کسر شان تھی۔ بعد رخ فنا دہوا اور صغیر نکھتا جلے گا۔

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ۱۲۷۷ھ میں نہ مرنا صرف میری نگذریکے واسطے تھا اسی زمانے میں صاحب عالم مارہروی نے غالب کی مدح میں چند اشعار کہہ کر بھیجے تھے۔ انہیں جواب میں لکھتے ہیں کہ صاحب عالم میں صرف اس لئے جیتا بچا کہ آپ کی مدح کی سعادت غنٹے سے بہرہ اندوز ہو سکوں۔

غالب کا قطعہ ادب پر انگریزوں کے دوبارہ قابض ہونے کے بعد شری جو حالت ہوئی تھی اُن کا نقشہ غالب نے چند اردو اشعار میں بھی کھینچا تھا لیکن یہ اشعار ان کے مطبوعہ اردو دیوان میں شامل نہ ہو سکے البتہ نسخہ حمید میں اردوئے معلّے سے لے کر شامل کر دیے گئے ہیں چونکہ یہ اشعار غالب کے دوسرے حکام کے علاوہ عام شاعت نہیں پاسکے اس لئے میں انہیں یہاں درج کرتا ہوں۔

بسکہ فعال مایید ہے آج      ہر سلحشور نگہستاں کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے      زہرہ ہوتا ہے آبِ نال کا

چوک جس کو کہیں وہ قتل ہے      گھر نو نہ بنا ہے زنداں کا

شہر و بلی کا ذرہ ذرہ خاک      تشہ خوں ہے ہر سداں کا

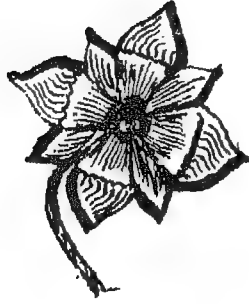
کوئی دواں سے نہ آسکے یاں تک      آدمی دواں نہ جاسکے یاں کا



میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا  
 گاہ چل کر کیا کیسے شکوہ سوزش و اغماص پنہاں کا  
 گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرا ویدہ لائے گریاں کا  
 اس طرح کے وصال سے غالب  
 کہا مٹے دل سے طغ بھراں کا

غدر کے سلسلے میں غالب کے ماتم و مفاداری کی یہ داستان غم میری رائے میں کسی تبصرہ  
 کی طرح نہیں۔ اس داستان کا ایک حصہ بھی باقی ہے جو غالب کی نیشن کی بندش سے تعلق  
 رکھتا ہے۔ اسے قارئین کرام آئندہ باب میں ملاحظہ فرمائیں گے لیکن دو پارہ یہ عرض کروں  
 ضروری ہے کہ غالب نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ ان کے تاثرات کا نہایت صحیح موقع ہے انہوں  
 انگریزوں کی بے جا خوشامدیں کی اور ان کی خاطر کسی سختی یا شدت کی پردہ پوشی نہیں کی۔  
 جہاں انہوں نے کالوں کی سختیوں اور دازکستیوں کی مذمت کی وہاں گوروں کی  
 زیادتیوں کو بھی صفائی اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنے میں تامل نہیں کیا۔ غدر کی  
 وجہ سے دہلی پر جو فتنے اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔ وہ اوپر کے خونچکاں موقع میں تفصیل کے ساتھ  
 بیان ہو چکی ہیں۔ جہاں بے گناہ انگریزوں بالخصوص بچوں اور عورتوں کا قتل غالب کے لئے  
 اذیت افزا تھا وہاں اکابر و رؤسا و عوام دہلی کی بربادیوں پادشاہی خاندان کی الم نایکوں  
 نے بھی نہیں بے طرح تڑپا یا اور ان کے ساز تاثرات سے ایسے خون آلود فتنے پیدا کئے  
 جن کو سن کر گج بھی کوئی ذی احساس اور ذی تاثر انسان اشکباری سے فارغ نہیں رہ سکتا۔  
 آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالب شاعر تھے کسی خاص گروہ،  
 خاص جماعت اور خاص قوم کے شاعر نہ تھے بلکہ اپنے دل و دماغ اور اپنے تاثرات  
 و احساسات کی ہمہ گیری کے باعث کائنات انسانیت کے شاعر تھے۔ یونیورسل شاعر  
 تھے۔ اور ان سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی کہ وہ ایک مخصوص گروہ اور مخصوص جماعت

کے مخصوص تاثرات کی تابیت قبول کریں۔ ان کی نظروں میں زیادتی اور تجاوز عن الحدود  
 ہر حال میں بڑا تھا خواہ اس کے ترکیب ہندوستانی ہوئے تھے یا انگریز۔ اور الم نامہ غدر  
 کے ہر ورق پر غالب کی خصوصیت آشکار نظر آ رہی ہے۔



## دسوال باب

### پنشن کے حصول کیلئے معنی سفارش

پر تہمتِ دم و بے برگ، خدا یا تا چند

سچن شاد شوم کایں گہرا ز کان ہن است

غالب کی ورد انگیز اقتصادی حالت کا متعین علیحدہ پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کے وسائل آمد  
بہت محدود تھے۔ اور پنج اچھا خاصا امیر و تھاکہ۔ غدر کے آغاز میں ان کی مستقل آمدنی کے  
دو ہی ذریعے تھے۔ اول قلعہ کی تنخواہ جس کی مقدار پچاس روپے ماہانہ تھی۔ دوم خاندانی پنشن  
جو ساڑھے ساٹھ سو روپیہ سال یا ساٹھ سو روپے ہینڈ تھی۔ یہ دونوں تنخواہیں غدر  
کے ساتھ ہی بند ہو گئی تھیں۔ پہلی اس لئے کہ نہ غدر کے بعد غالب گھر سے نکلے۔ نہ قلعہ سے  
کوئی سروکار رکھا۔ نہ اس ہنگامہ آرائی میں کسی کو یہ خیال آ سکتا تھا کہ ایک خانہ نشین شاعر یا  
مورخ کے واجبات باقاعدہ ادا ہونے چاہئیں جب غدر ختم ہوا تو وہ بساطِ ہیٹ چلی  
گئی جس کے ساتھ قلعہ کی تنخواہ وابستہ تھی۔ دوسری تنخواہ اس لئے بند ہوئی کہ وہ سرکارِ انگریز  
سے ملتی تھی اور انگریزوں کی حکومت دہلی سے اٹھ چکی تھی۔ غدر کے بعد غالب کو نیشنل ہنی  
جائے ملتی لیکن ان پر باغیوں کی طرف داری کا الزام عائد ہو گیا۔ اپریل ۱۸۵۷ء کی جوشنِ مہنی  
کی پہلی یا دوسری تاریخ کو ملی ہوگی غالب وصول کر چکے تھے۔ اسی مہنی کو غدر ہو گیا۔ اس وقت  
سے لے کر اپریل ۱۸۵۷ء تک پورے تین برس غالب اس سے محروم رہے۔ مہنی ۱۸۵۷ء میں  
تین برس کا روپیہ اکٹھا کر پنشن کے ساتھ خلعت و دربار بھی بند ہو گئے تھے ان کی بجالی میں  
نزد دو برس صرف ہوئے۔

غالب کی سگیم صاحبہ نے اپنا زیور اور دوسری قیمتی چیزیں غالب سے مشورہ کئے بغیر اپنے صاحب کے مکان کے تہ خانہ میں رکھوا دی تھیں۔ وہ انگریزی سپاہ کی غارت گری کی نذر ہو گئیں۔ کپڑوں یا دوسری چیزوں میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ فروخت کر کے کھا لیا۔ جولائی ۱۸۵۹ء میں نواب یوسف علی خاں مرحوم والی رام پور نے سو روپے ماہانہ کفالت وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن غالب اس سے قبل ڈیڑھ برس کی مدت میں کافی قرض لے چکے تھے۔ رام پور کا وظیفہ ان کے احتیاجات کی وسعت کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ یوں تو غالب کی زندگی کا کوئی دور بھی کشاکش، فراغت بال اور اطمینان کا دور نہ تھا لیکن عذر کے بعد کے تین سال بڑی ہی مصیبت کے سال تھے پنشن سے بھی زیادہ غالب کو خلعت اور دربار کی بندش کا قلق تھا۔ جسے وہ اپنے ذاتی اعزاز اور خاندانی وجہات کا زوال سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں ان کے سکا تیرب کا ساز و دو عالم بہ طور خاص دنگیز نعموں سے لبریز رہا۔

حکام سے تعلق | غدلیں پہلے باغیوں کے ہاتھوں پھر انگریزی فوج کے ہاتھوں شہر پر چڑھتی ہیں نازل ہوئی تھیں۔ ان سے غالب کے دل پر سخت چوٹ لگی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے ابتدا میں انگریزی حکام کے ساتھ کوئی رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ ہر گوالہ قلعہ کو ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں رقم فرماتے ہیں :-

کسی حاکم سے نہیں ملا کسی کو خط نہیں لکھا کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

مجھ کو دیکھو نہ آؤ اہوں نہ قید نہ رہجو۔ ہوں نہ تندرست نہ خوش ہوں نہ ناخوش نہ مر ہوں نہ زندہ نہ مرنے جاتا ہوں بائیں کتے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں جب موت آئے گی مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے جو تقریر ہے بریں حکایت ہے۔

پنشن کے لئے سلسلہ جنبانی جب بیسج والہ میں بقیہ خزانے مرور زمان تخفیف ہوئی اور احتیاجات نے ٹنگ کیا تو غالب نے پنشن کے حصول کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کر دی لیکن انہیں ہر طرف سے ایسی نظر آتی تھی۔ میر ہمدی مجروح کو لکھتے ہیں:-

دیکھا اس پنشن قدیم کا حال۔ میں تو اس سے لڑتا دھوئے بیٹھا ہوں۔  
 اوپر عن کیا جا چکا ہے کہ غالب کو پنشن سے بھی بڑھ کر غفلت و دربار کا قلق تھا۔ مجروح نے غالب لکھا تھا کہ پنشن کے لئے گورنر جنرل کے پاس مراجعہ کرنا چاہئے جواب میں لکھتے ہیں:-  
 بے مکنہ و کف من خامہ روانی

سر و ست ہوا آتش بے دود کجائی

میر ہمدی صبح کا وقت ہے جاڑا خوب پڑا ہے۔ انگلیں سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دوحرف لکھا ہوں لڑتا پتا جاتا ہوں آگ میں گرمی نہیں۔ ہائے آتش سیال دہشرب کہاں کہ جب دوجرے پی لئے فوراً دگ وپے میں دوڑ گئی۔ دل توڑنا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا نفس ماطقہ کو تو اجدیم پہنچا ساتی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب ہائے غضب لائے غضب۔

یہاں تم پنشن پنشن کہہ رہے ہو۔ گورنر جنرل کہاں اور پنشن کہاں۔ صاحب ڈپٹی کمشنر صاحب کٹر بہادر نواب غفلت کو روز بہا در جب ان تینوں نے جواب دیا ہو تو اس کا مراجعہ گورنر میں کروں۔ مجھے تو دربار غفلت کے لائے پڑے ہوئے ہیں تم کو پنشن کا فکر ہے۔  
 ایک خط میں فرماتے ہیں:-

میرادبار اور غفلت دربار ہو گیا۔ پنشن کی توقع نہ دربار غفلت کی صورت نہ سزا نہ انعام نہ رسم معمولی قدیم۔

دوسرے پنشن داروں کی حالات | بعض دوسرے پنشن داروں کے اور اپنے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

اے کوئی دن ہوئے حیدر خاں گرفتار آیا ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں۔ ہاتھوں میں تھکڑیاں

حوالات میں ہے۔ دیکھتے حکم اخیر کیا ہو۔۔۔۔۔ جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا۔ ہر شخص کی سرپرست کے موافق حکم ہو رہے ہیں نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ۔ نہ نظیر کام آئے نہ تقریر پیش جائے۔ ارتضے خاں بن مرتضے خاں کی پوری دوسو سو روپے کی فیشن کی منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی بیٹیوں سو سو روپے مہینہ پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چونکہ تمہارے بھائی بھرم تھے تمہاری فیشن ضبط۔ بہ طریق ترجم دس دس روپے مہینہ تم کو ملے گا۔ ترجم یہ ہے تو تغافل کیا قدر ہو گا میں خود موجود ہوں اور حکام صدر کاروشناس یسٹرن میں اکھیر کتا۔ ۲۰ دس کی فیشن تقریر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک وینٹنٹ اور پرنٹ ملا ہے نہ ملے گا۔ غیر احتمال ہے ملنے کا، علی کا بندہ ہوں اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں لکھتا اس وقت کلو (دور غم) کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

فیشن کے لئے سعی کی روداد | اب فیشن کے لئے سعی کی روداد ملاحظہ فرمائیے :-

عرضی میری سر جان لارنس چیف کشتیرما در کوگزری اس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کوئلہ ضمیمہ سائل کو بھیج دی جائے۔ اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کشتیرما کے پیش کرو اب سررشتہ وار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا یہ نہ ہوا۔ وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میت پاس آگئی ہیں نے خط صاحب کشتیرما رس ساندرس کو لکھا۔ اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اس میں لغوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کشتیرما صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کی فیشن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو ان کے ہاں یہ رجسٹری آئی ہے۔ دیکھتے کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر کے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اس کو دیکھیں گے۔

دستنبی کی طبیعت کی غرض | غالب نے دستنبی کے چھپانے میں بھی اسی غرض سے عجلت کی

کتاب کے ذریعہ سے حکام کے ساتھ تجدید روابط کی مقبول صورت پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر وہی عبد الغفور  
خال اس دور مارہروی کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

راہ و رسم مراسلت حکام عالی مقام سے بہ دستور جاری ہو گئی ہے۔ نواب نقشبند گورنر  
بہادر غزب و شمال (آگرہ و لاہور) کو نسخہ دستنبو بہ سبیل ڈاک بھیجا تھا ان کا خط ناری شہر حسین عبادت  
و قبول صدق اراکات و مودت سبیل ڈاک آگیا۔ پھر قصیدہ بہاریتینیت و مدح بھیجا گیا۔  
اس کی رسید آگئی وہی خال صاحب بسیار مہربان و دوستانہ القاب اور کاغذ افشانی زبان  
ایک قصیدہ رابرٹ انگلری صاحب نقشبند گورنر بہادر قلم و پنجاب کی مدح میں۔ توسط چیف  
بہادر دہلی گیا۔ اس کے جواب میں بھی خوشنودی نامہ۔ توسط کشنر بہادر کل مجھ کو آگیا۔ مینشن بھی  
تک بچ نہیں لی۔ جب ملے گی حضرت کو اطلاع کر دی جائے گی۔

ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کے کو تو ال سے غائب کے متعلق کیفیت طلب کی گئی  
تھی۔ فرماتے ہیں :-

مینشن کی صورت یہ ہے کہ کو تو ال سے کیفیت طلب ہوئی اس نے ابھی لکھی۔  
خوش اعتمادی غائب بڑے خوش اعتماد تھے۔ صاحب نے بلایا۔ اچھے انداز میں گفتگو کی۔ اور غائب  
کو یقین ہو گیا کہ اب مینشن ماننے والی ہے۔

ہفتے کے دن ساتویں گشت بر ۱۸۵۹ء بمی مجھ کو اجڑن صاحب بہادر نے بلایا کچھ سہل  
سوال مجھ سے کئے۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنخواد ملے اور جلد ملے۔ تردد اگر ہے تو اس  
میں ہے کہ ہندہ مینے پہلے بھی ملتے ہیں یا صرف آئندہ کو مقرر ہوتی ہے

حالانکہ اس کے بعد بھی مینشن کے حصول میں کم و بیش پونے دو برس صرف ہوئے۔  
دستنبو کے مختلف نسخے مختلف حکام کے پاس پہنچے اور رسیدیں آنے لگیں تو پھر غائب  
اکٹ امیدیں آبیاری کا سامان ہوا۔ اوائل مارچ ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-  
صاحب کشنر بہادر دہلی یعنی جناب سائڈرس صاحب بہادر نے مجھ کو بلایا پنجشنبہ ۲۲ ذی

کو میں گیا صاحب شکار کو سوار ہو گئے تھے۔ میں اٹھا پھر آیا۔ جمعہ ۲۵ فروری کو گیا ملاقات ہوئی، کرسی دی، بعد پرش مزاج کے ایک خط انگریزی چار ورق کا اٹھا کر پڑھتے رہے۔ جب پڑھ چکے تو مجھ سے کہا کہ یہ خط ہے حاکم اکبر صدر پور ڈپٹی پنجاب کا تمہارے باب میں لکھتے ہیں ان کا حال و ریاقت کر کے لکھو۔ سو ہم تم سے پوچھتے ہیں کہ تم ملکہ منغلہ خلعت کیا مانگتے ہو حقیقت کہی گئی۔ ایک کاغذ آمدہ ولایت لے گیا تھا۔ وہ پڑھو اور پھر دوچھا تم نے کتاب کیسی لکھی ہے۔ اس کی حقیقت بیان کی۔ کہا ایک کتاب میکلوڈ صاحب نے دیکھنے کو مانگی ہے۔ اور ایک ہم کو دو میں نے عرض کیا کل حاضر کروں گا۔ پھر نیشنل پوچھا وہ گزارش کیا، ماسپے گھرا یا اور خوش آیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ خوش اعتقاد دی کی بنا پر غالب نے ہنسی ہتھکرات کو نئی خوشگوار امیدوں کا سینہ بنایا فرمائے ہیں:-

دیکھو میرمدی حاکم پنجاب کو مقدمہ ولایت کی کیا خبر کتابوں سے کیا اطلاع ہنسن کی پرش سے کیا مدعا۔ یہ ہتھسار یہ حکم گورنر جنرل بہادر ہوا ہے اور یہ صورت مقدمہ فیضی ان کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کتابیں لے کر گئے لیکن سائنڈرس صاحب ہاں چلے گئے اور جاتے ہوئے کہہ گئے کہ کتابیں ان کے نشی کے حوالے کر دی جائیں۔ ایک دن کے وقفے کے بعد غالب پھر ملاقات کے لئے گئے۔ سائنڈرس صاحب نے بہت التفات سے باتیں کیں۔ غالب نے گورنروں کے سرٹیفیکیٹ دکھائے میکلوڈ صاحب کے نام ایک خط لکھ لے گئے تھے۔ وہ سائنڈرس صاحب کو دیا کہ دستنبو کے ساتھ میکلوڈ صاحب کی خدمت میں بھیج دیا جائے۔ پھر پرنٹنگ مشین کو کھینچ کر لے کر آئے کہہ کر اجڑن صاحب سے ملے۔ اس تحریر کا ان کا حصہ غالب کی خوش اعتقاد کی ایک اور دیکھ پرتع ہے یعنی وہ سمجھ رہے تھے کہ ہن تمام مراحل طے ہو چکے ہیں۔ تمام غلطیاں اوستہ میں ختم ہو چکی ہیں، صبر ثبات کی آزمائش ہو گئی



نہیں کہتے کہ منشن ملنے والی ہے۔ بلکہ اس انداز میں منشن کا ذکر فرماتے ہیں کہ گویا سارا  
ہان کی جیب میں پہنچ چکا ہے۔

دیکھو سید (میر مندی)، اسد اللہ لغاب علیہ السلام کی مدد کو کہ اپنے غلام کو کس طرح  
بچایا، باتیں مینے تک (ابتداء سے ۱۸۵۷ء سے لے کر اواخر فروری ۱۸۵۹ء تک)  
بھوکا پیاسا بھی رہنے دیا۔ پھر کس حکم سے کہ وہ آج سلطنت دہندہ ہے برے نقد کا  
حکم بھجوا یا حکام سے مجھ کو عزت دلائی، میرے صبر و ثبات کی داد ملی۔ صبر و ثبات بھی اسی  
کا بخشا ہوا تھا میں کیا اپنے باپ کے گھر سے لایا تھا

لیکن اس کے بعد بھی غالب تنگی، عسرت اور فاقہ دستی کے کم و بیش چودہ مہینے گزرنے  
لے تھے۔

برکات حالات کی جستجو | اس زمانے میں غالب مختلف افسروں کے حالات معلوم کرنے کے  
لئے بہت مضطرب رہتے تھے۔ غالباً اس خیال سے کہ شاید کوئی ایسا افسر آجائے جو ان کا  
ماسا ہوا ہو حکومت میں ان کے متعلق کوئی اچھی رپورٹ پیش کرنے پر آمادہ ہو جائے، چنانچہ  
ان کے سکاٹب میں مختلف دوستوں سے مختلف افسروں کے متعلق جا بجا استفسارات ملتے  
ہیں مثلاً منشی شیو زائن کو لکھتے ہیں :-

وہ نمبر اخبار کا جو تم نے مجھ کو بھیجا تھا اس میں ایڈمنشن صاحب کے ٹھنٹ ہونے کی اور  
بہت جلد اگر آئے کی خبر لکھی تھی۔ یہاں مجھ کو کسی باتیں پوچھنی ہیں ایک تو یہ کہ چیف  
سکرٹری گورنر جنرل کے تھے۔ جب ٹھنٹ گورنر ہوئے تو اب چیف سکرٹری کون ہوگا  
یقین ہے کہ ولیم مہر صاحب اس عہدے پر مامور ہوں پس اگر یونہی ہے تو ان کے حکم میں  
چیف سکرٹری کون ہوگا۔ دوسری یہ کہ میر منشی ان کے تو وہی منشی غلام غوث خاں رہیں گے۔  
تیسری یہ کہ گورنر جنرل کے فارسی دفتر کے میر منشی ایک بزرگ تھے بلکہ ام کے رہنے والے۔

ملا سربراہ فریڈرک ایڈمنشن ۱۵ جنوری ۱۸۵۹ء سے لے کر ۲ فروری ۱۸۶۳ء تک صوبجات متحدہ ٹھنٹ گورنر

منشی سید جان خاں آیا اب بھی وہی ہیں یا ان کی جگہ کوئی اور صاحب ہیں۔ ان سب باتوں میں سے جو آپ کو معلوم ہوں وہ اور جو نہ معلوم ہوں ان کو معلوم کر کے مجھ کو لکھئے اور جلد لکھئے اور ضرور لکھئے۔

ایک خط میں خواجہ غلام غوث خاں بنجیر سے اس قسم کے متعدد دستخطات کئے ہیں مثلاً گورنر جنرل کا چیف سیکرٹری ویدمنشن کی جگہ کون ہوا؟ لفٹنٹ گورنر کے سیکرٹری کا نام کس کے حوالے کیا گیا؟ گورنر جنرل کا دورہ کب شروع ہو گا؟

دستنبیو کی رسیدوں پر خوشی غالب و مستند کے نسخے جا بجا بھیجتے جاتے تھے اور وہاں سے رسید آتی تھی خوش ہو جاتے تھے۔ جہاں سے کوئی اطلاع نہیں ملتی تھی پڑمروہ ہو جاتے تھے۔ خواجہ غلام غوث خاں بنجیر نے اطلاع دی تھی کہ لفٹنٹ گورنر کے نام جو پارسل بھیجا تھا وہ مل گیا۔ اس پر خوش ہو کے لکھتے ہیں :-

اس نامہ مختر نے وہ کیا جو پارہ ابرکت خشاک سے کرے یعنی خطا اور پارسل کا پہنچ جانا ایسا نہیں کہ اس سے خبر پا کر بخت کی رسانی کا سا سگزار نہ ہوں۔ یہ تو حضرت کو لکھ چکا ہوں کہ دو سر پارسل اور خط معاً اس خط کے ساتھ بھیجا گیا۔ اور ہر گز نہ توقع کا خیال ہی پارسل پر ہے۔ کس واسطے کہ اس خط میں حاکم اعظم کے نام عرضی موقوف ہے۔ جانتا ہوں کہ محکمہ ایک ڈاک ایک دونوں پارسل دونوں لفافے ایک دن پہنچے ہوں گے مگدل نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ نہ مانوں گا۔ جب تک حضرت اس سرشت سے معلوم کر کے دیکھیں.....

ایڈمنشن صاحب گورنر جنرل کو اگر آگئے تو غالب نے انہیں بھی ”دستنبیو“ بھیجی۔ نیز گورنر کی تنہیت میں ایک فارسی قصیدہ بھیجا۔ ان کی طرف سے جواب میں ایک فارسی خط آیا جو کہتا ہے کہ رسید اور نظم کی تحمیں پر عمل تھا بعد ازاں غالب نے پنجا کے لفٹنٹ گورنر سٹورٹ منگری کو لکھ کر ایک قصیدہ مشاعرہ تنہیت و موح بھیجا لیکن فرماتے ہیں کہ

پنشن کے باب میں ابھی کچھ حکم نہیں اسباب قرض فراہم ہوتے جاتے ہیں، ویرا دیدو رست آید  
 اناج کھاتا ہی نہیں ہوں، آدھ سیر گوشت دن کو اور پانچ بھر شراب رات کو پیتا جاتی ہے۔  
 ہلی کی غانا درپورٹ | معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے سرورشتہ نظم و نسق سے غالب کے حق میں ابھی  
 بٹ نہیں ہوئی تھی بلکہ لکھا گیا تھا کہ وہ پنشن کے مستحق نہیں لیکن صدر کے حکام نے پنشن  
 ظوری دے دی۔ غالب خود فرماتے ہیں :-

گورنمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے میری پنشن کے اجرا کا حکم دے دیا۔  
 ایک اور جگہ لکھتے ہیں :-

میرداد گریسے بچنا کراست اسد اللہی ہے۔ ان میسوں کا لکھا آنا عطیہ بد اللہی۔ حاکم  
 شکر لکھ دے کہ شیخ گورنمنٹ پانے کا مستحق نہیں۔ حاکم صدر مجھ کو پنشن دلوائے اور پورا دلوائے۔  
 بڑبڑل کا حکم | مارچ ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں :-

نواب گورنر جنرل بہادر نے حاکم پنجاب کو لکھا کہ حاکم دہلی سے فلاں شخص کی پنشن کے چڑھا  
 ہوئے روپے کے یک مشت پانے کی اور آئندہ ماہ بہ ماہ ملنے کی رپورٹ منگوا کر اپنی  
 منظور کی لکھ کر ہمارے پاس بھیج دو۔ تاکہ حکم منظور ہو دے کر تمارے پاس بھیج دیں سو بہا  
 اس کی مثال بہ طرز مناسبت ہوگی۔ کم و بیش دو مہینے میں سب رو سپیل جائے گا

الفتح | جن جن لوگوں کے لئے پنشنوں کی منظوریاں ہو چکی تھیں یا جن کے حق میں ابھی پوٹین ہو چکی  
 تھیں اور توقع تھی کہ انہیں ضرور پنشن مل جائیں گی انہیں ساری چڑھی ہوئی رقمیں ملنے  
 سے قبل ۱۸۵۵ء میں قریباً ایک ایک سال کی رقمیں یک مشت علی الحساب مل گئی تھیں غالب  
 زوری ۱۸۵۵ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

۱۸۵۵ء  
 علی بخش خاں پچاس روپے مہینہ پاتے ہیں۔ بائیس مہینے (از مئی ۱۸۵۴ء تا جنوری ۱۸۵۵ء)  
 گزار سوہوتے ہیں۔ ان کو چھ سو روپے مل گئے باقی دو سو چڑھا رہا آئندہ ملنے میں کچھ غلام نہیں۔  
 غلام حسن خاں سو روپے مہینے کا پنشن دار بائیس مہینے کے بائیس سو ہوتے ہیں۔ اس کو باڑ

ملے۔ دیوان کشن لال کا ڈیڑھ سو روپیہ بمینہ بائیس مہینے کے تین ہزار تین سو موٹے ہیں  
اس کو اٹھارہ سو روپے ملے مینا جمدار دس روپے مہینے کا ساکھ لبر سال بھر کے ایک سو  
بیس روپے ملے آیا اس طرح پندرہ سولہ آدمیوں کو ملا ہے۔

مد و خراج کی شرط | اس کا نام مد و خراج تھا اور اس کے حصول کے لئے اقتصادى بے مقدوری کے  
انہماک کے واسطے چار گواہ پیش کرنے پڑتے تھے جب فروری ۱۸۵۹ء میں دو کمیشن ڈاروں  
کو مد و خراج ملا تو غالب نے بھی اس کے لئے کوشش کی تھی۔ خطوں پر خط حکام کو لکھے بڑی دیر کے  
بعد کو تو اس کے نام حکم آیا کہ:-

اسد اللہ خاں نیشن دار کی کیفیت لکھو کہ وہ بے مقدور اور محتاج ہے یا نہیں۔ کو تو اس نے  
موافق ضابطہ کے مجھ سے چار گواہ مانگے ہیں سوکل چار گواہ کو تو الی حیثیتہ جائیں گے۔ اور  
میری بے مقدوری ظاہر کر آئیں گے تم کہیں یہ نہ سمجھنا کہ بعد ثبوت بھٹسی چڑھا ہوا روپیہ مل  
جائے گا۔ نہ صاحب یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بعد ثبوت ان اس متقی ٹھہروں کا چھ مہینے یا برس تک  
روپیہ علی الحساب پانے کا۔

غالب کو اس وقت کچھ نہ ملا۔ اور پورا ایک سال گزرنے کے بعد نیشن کی منظوری ملنے  
صرف دفتری کارروائی کی تکمیل باقی تھی۔ کمشنر نے حکم دیا کہ اگر علی الحساب سو روپیہ لینا چاہو تو  
ملے۔ لو۔ غالب نے اس وقت بھی سال بھر کے روپے کا مطالبہ کیا لیکن جواب ملا جب سارا رقم  
جلد ملنے والا ہے تو اتنی بڑی رقم علی الحساب لینے کی کیا ضرورت ہے۔

تین سال کا روپیہ مل گیا | غرض ہم یہی نہ ملے کہ غالب کو تین سال کا روپیہ یک مشت ملا اور  
آئندہ ماہ بہ ماہ روپیہ ملنے کا حکم ہوا۔ ۱۸۶۶ء کے خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:-

زد سہ سالہ جمعہ ہزاروں کہاں سے ہوا۔ سات سو پچاس پاناہوں تین برس کے دو ہزار  
دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مجھے مد و خراج ملے تھے وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو متفرقات ہیں۔

رہے دو ہزار روپے بیز غنار کار ایک بنیا ہے۔ اہد میں اس کا قرضہ اقدیم ہوں۔ اب جو

دو ہزار روپے لایا اس نے اپنے پاس رکھ لئے اور مجھ سے کہا میرا حساب کچھ سات کم  
پندرہ سو اس کے سودوں کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اسی سے حساب کرایا گیارہ سو کئی  
روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھپیں سو ہوئے۔ اصل میں یعنی دو ہزار میں چھ سو کا گھٹا۔  
وہ کہتا ہے کہ پندرہ سو میرے دے دو پانچ سو سات باقی تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرق  
گیارہ سو چکا دیئے تو باقی نو سو رہے۔ نو سو تو لے آؤ مجھے دے پرسوں چوتھی۔  
(۱۸۶۶ء) کو وہ روپے لایا ایک ایک قصہ نہیں چکا میں جلدی نہیں کرتا دو ایک تاجن  
بچ میں ہیں۔ مفتے بھر میں جگا فیصل ہو جائے گا۔

بال بھی تفصیل میری عمر قح کے نام کے خطیں موجود تھیں۔ آخر کار کے ساتھ فیصلے کے بعد  
ایک خط میں لکھتے ہیں :-

پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زر جمعہ سہ سالہ ایک مشت ل گیا۔ بعد اوائے حقوق  
چار سو دینے باقی رہے اور شاہی روپے گیارہ آنے بھنے چکے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مختار نے اپنے قرض کے سود میں کمی کر دی تھی۔ یا اس کا  
تھوڑا بہت روپیہ باقی رہ گیا تھا۔ اور غالب نے اسے عام حقوق میں شامل نہیں کیا تھا۔  
نوشی کی دو چیزیں پنشن کے ملنے کی ایک خوشی تو یہ تھی کہ روپیہ مل گیا تھا اور غالب کی قرض خواہوں  
سے کم از کم تھوڑی مدت کے لئے ضرورت نجات مل گئی تھی۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ عزت رہ گئی  
حاصل کے لئے اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہی۔ وہ خود لکھتے ہیں :-

بات رہ گئی بت رہ گئی۔ حاسدوں کو رت آگئی۔ دوست سب شاد ہو گئے چہا

نکلیجو کا ہوں جب تک جیوں گا ایسا ہی رہوں گا۔

نعت دربار | پنشن کا قضیہ طے ہو گیا تھا لیکن غالب کے خاندانی اعزازات کی ایک بڑی چیز جو  
انہیں پنشن سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ دربار و ضلعت کی عزت تھی۔ اس عزت کی بحالی کے لئے غالب

۱۵ اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۴۱۔

مزید دو برس جدوجہد کرنی پڑی۔

گورنر جنرل نے ۱۸۶۷ء کے آغاز میں میرٹھ میں دربار کیا تھا۔ غالب اس امر کے متوقع تھے انہیں بھی دربار میں بلایا جائے گا۔ لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ بنا سب انتظار کے بعد انہوں نے خود درخواست کی کہ سابقہ قاعدے کے موافق انہیں بھی دربار میں بلایا جائے۔ جواب ملا کہ نہیں ہو سکتا۔ دربار کے بعد گورنر جنرل دہلی آئے تو غالب معمول کے مطابق خیمہ گاہ میں پہنچے۔ ولوی اہلہ احسن صاحب میرٹھی سے ملے چیف سکریٹری کو اطلاع کرائی۔ جواب ملا کہ فرصت نہیں دوسرے روز پھر گئے۔ اور اطلاع کرائی۔ لیکن میرٹھی صاحب نے جواب دیا کہ آیام غدیر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟

غالب فرماتے ہیں :-

اس دن چلا آیا۔ دوسرے دن میں نے انگریزی خط ان کے نام لکھ کر ان کو بھیجا۔ مضمون یہ کہ باغیوں سے میرا اخلاص منقطع محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔ یہاں کے مقامات پر جواب نہ ہوا۔ اب ماہ گزشتہ یعنی فروری ۱۸۶۷ء میں پنجاب کے ملک سے جواب آیا کہ لارڈ ہارڈ فرماتے ہیں کہ ہم تحقیقات نہ کریں گے۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

میرٹھی صاحب سے ملا۔ ان کے خیمے میں اپنے نام کا ٹکٹ (کارڈ) صاحب سکریٹری ہارڈ کے پاس بھیجا۔ جواب آیا کہ تم غدر کے دنوں میں بادشاہی باغیوں کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ اب گورنمنٹ کو تم سے ملنا منظور نہیں ہیں۔ گداٹے برہمن اس حکم سے منع نہ ہو۔ جب لارڈ صاحب ہارڈ کا مکہ پہنچے۔ میں نے قصیدہ حسب معمول بھیج دیا۔ مع اس حکم کے کہ آپ آیا کہ آپ یہ چیزیں بہار

ایہی قصیدہ ہے جس کے مستحق یوسف میرزا کو لکھتے ہیں کہ وہ مینے دن رات غن جگر کھایا۔ اور ایک قصیدہ چوتھ سبت کا۔ محمد افضل مصور کو دے دیا وہ پہلی دسمبر کو مجھ کو دے گا۔۔۔ اس میں التزام اپنی تمام سرگزشت کے لکھنے کا کیا ہے۔

پاس نہ بھیجا کرو۔

جیون لال کارونناچ | میرا خیال ہے کہ محض غالب بلکہ بعض دوسرے اکابر پر بھی غد میں شرکت یا باغیوں سے اخلاص کا جو الزام لگا تھا اس کی بنیاد و اساس منشی جیون لال کارونناچ تھا۔ منشی صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ غدر کے زمانے میں دہلی میں انگریزوں کے خالص سوس تھے اور شمر کے حالات کے متعلق روزانہ رپوٹیں مرتب کر کے بھیجا کرتے تھے۔ انہی رپورٹوں کا مجموعہ ان کارونناچ ہے۔ اس میں جو حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض بدانتہ غلط ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر غالب کے متعلق لکھا گیا ہے کہ انہوں نے انگریزوں پر فتح حاصل ہونے کی خوشی میں بہادر شاہ کے روبرو قصیدہ پڑھا۔ حالانکہ غالب نے ایک لمحہ کے لئے بھی گھر کے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ یا کم از کم وہ اپنے کوچے سے باہر نہیں گئے تھے۔

اغراض کی بجالی | یہ ہر حال نشین کھل گئی لیکن دربار خلعت کی بجالی کے سلسلے میں تحقیقات ثنی رہی جب غالب کے گناہ ثابت ہوئے تو پیر ۱۸۶۲ء میں خلعت و دربار بھی بجالا ہو گئے۔ غالب لکھتے ہیں :-

دوشنبہ ۳۰ مارچ ۱۸۶۲ء کو سواد شہر مخیم گورنری ہوا۔ آخر روز میں اپنے شفیق قسیم جناب مولوی انوار حسین خان بہادر کے پاس گیا۔ اٹنا لٹکھو میں فرمایا کہ تمہارا دربار و خلعت یہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔ نتیجہ میں نے پوچھا کہ حضرت کیوں کر حضرت نے کہا کہ حاکم حال نے ولایت سے اگر تمہارے علاقہ کے سب کا غدارگریزی و غارتگری دیکھی اور یہ اجلاس کو تسلیم نہ کیا کہ سدا اللہ حال کا دربار اور غیر و خلعت یہ دستور بہ حال و برقرار ہے۔

دوسرے دن سردار برٹنگمیری صاحب لفٹنٹ گورنر بن جائے بلا کر خلعت دے دیا اور کہا کہ اگر گورنر جنرل کے دربار انبالہ میں شرکت کرو گے۔ تو وہاں بھی خلعت ملے گا۔ غالب اگرچہ لفٹنٹ گورنر صاحب کے کہے گئے تھے کہ وہ انبالہ کہاں جائیں گے۔ لیکن باوجود عدم انتظام منار

وہ جانے کی تیاری کر رہے تھے اس سے چند ماہ قبل ان کے ہاتھ پھنسی نکل آئی تھی جس نے سخت تکلیف وہ صورت اختیار کر لی اور انہیں اپنا ارادہ سفر ختم کرنا پڑا۔

گویا لاٹو کینٹنگے دربار و خلعت بند کیا تھا اور ان کے چائین نے آکر بحال کر دیا حضرت مولانا ابوالکلام آزاد بیان فرماتے ہیں کہ غالب کی منشن اور دربار و خلعت کی بجالی کے لئے سرسید احمد خاں مرحوم نے خاص کوشش فرمائی تھی۔

خواجه حالی نے حیات جاوید میں سرسید کے بیان کی بنیاد پر تحریر فرمایا ہے۔ کہ غالب ام پور کے پہلے سفر سے واپس ہوتے ہوئے مراد آباد پہنچے تو اس زمانہ میں سرسید مراد آباد میں صدر الصدور آئین اکبری کی تقریظ کے زمانے سے سرسید کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ اس لئے غالب نے مراد ام پور جاتے وقت مراد آباد میں سرسید کو اطلاع دی تھی اور نہ آتے وقت انہیں مطلع کیا لیکن سرسید کو اطلاع مل گئی تو وہ غالب کو سرائے سے اٹھا کر مکان پرے گئے۔ غالب پانکی سے اترے تو ان کے ہاتھ میں بوتل تھی جسے انہوں نے سرسید کے مکان میں ایسی جگہ پر رکھ دیا۔ جہاں ہر ایک آتے جانے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے بوتل اٹھا کر سیاب کی کوٹھڑی میں رکھ دی۔ غالب کو بوتل اپنی جگہ پر نظر نہ آئی تو وہ بہت گھبرائے لیکن سرسید نے اطمینان دلایا کہ بوتل موجود ہے۔ اور دوسری جگہ رکھی ہوئی ہے۔ غالب نے اس کے دیکھنے پر اصرار کیا تو سرسید نے اندر لے جا کر دکھا دی۔ غالب نے بوتل اٹھائی تو دیکھ کر کہا کہ اس میں خیانت ہوئی ہے۔ چچ بناؤ کس نے پی ہے۔ حاقظ نے سچ کہا ہے کہ

واعظاں لکین جہلہ بر مجرب منہ سرے کنند

چوں بہ خلوت سے روز آں کار و گیرے کنند

دو ایک دن سرسید کے مکان پر پھٹ کر غالب دہلی چلے آئے۔ خواجه حالی نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد ہمیشہ کشیدگی رہی ہوگئی چونکہ اس زمانے میں غالب منشن کی بندش کی وجہ سے بہت مضطرب



ممکن ہے سرسید نے اس ملاقات کے بعد ہی نیشن اور دربار خلعت کی بجالی کے لئے گوشش شروع کر دی ہو نیشن غالب کو ستمبر ۱۸۶۶ء میں مل گئی اور دربار خلعت ستمبر ۱۸۶۶ء میں جمال ہوسے چونکہ نیشن حکام دہلی کی رائے کے خلاف صدر کے احکام کی بنا پر جمال ہوئی تھی۔ اس لئے اغلب ہے کہ اس بجالی میں سرسید کی سعی اس کے بڑھ کر موثر ہوئی ہو۔

غالب اور غدر ان نسبت مضمون کا اقتضایہ ہے کہ غالب نے لارڈ کیننگ کے رابرٹ ٹنگمری اور بعض دوسرے انگریزوں کے قصیدوں میں اپنے متعلق اور غدر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے بھی یہاں درج کر دیا جائے۔

لارڈ کیننگ کے قصیدے میں فرماتے ہیں ۵

بہ کو دی شدہ ام یزہ چین خوان نوال      نہا لم از شرپیش رس بہ بار آمد  
وے ازاں ہمہ مال و منال تو قیعی      کم است آنچه بہ تحول خاکسار آمد  
زیک و وجہ فزوں فروز بخت بہ خلق      قبح بہ درت من از دست رعشہ ار آمد  
بہ پیریم نلقا خائے طبع اوج کرے      خیال در شہنشاہ روز کار آمد  
پھر فرماتے ہیں کہ ملکہ و کٹوریہ کی طرح میں قصیدہ بھیجا۔ وہاں سے خوشنودی کے خط آئے لیکن آسمان کہہ رہا تھا کہ دیکھیں تو کس طرح گوشت خور و چال کھوتا ہے۔ اسی اثنا میں غدر برپا ہو گیا ۵

بہ ناکرفت چناں صرصے وزید بہ وہر      کزاں بہ آئینہ آسماں عبا ر آمد  
شرارہ بار عبا رے ز منفر خاک انگیخت      سیاہ رو سپے کاندیں دیار آمد  
تو گوئی آنچه من اں را عبا رے گویم      ز بہر کشت من ابر تنگ ر بار آمد  
دریں جگہ گسل آشوب کر صوبت اں      سپاہ اسپہری بہ زینہار آمد  
گواہ دعوی غالب بہ عرض بے گنہی      ہمیں بس است کہ ہر گونہ تنگ ر آمد  
خطاب خلعت و نیشن ز شاہ سے خواہم      ہم از سخت بدیں دایہ اہم تر آمد  
پس از سال کہ در صبح و چہ و تاب گزشت      سرگزارش اندوہ انتظار آمد  
ٹنگمری کے قصیدے میں لکھتے ہیں :-

ذکر ایں فتنہ کہ برخواست زانہوہ سپاہ  
 بہ زبانی کہ قلم راست سر اسرار دارد  
 چوں دیں شہر تم بہر کہ عاشق ملی است  
 دیدم آشوب کہ ہنگامہ شہر دارد  
 بندہ سے غم بہت کہ بیرون دوا باوجود  
 نتوانست کہ از گوشہ قدم بردارد  
 ماند و آئین وفا داشت و رآں عمدہ بنور  
 نیز آں قاعدہ با خویش مقدر دارد  
 جز شناسے و دعائے کہ ہمہ گفت گفت  
 و انچہ گفت درین وقت ہم از بردارد  
 و گرایں نیز تصور بہت کہ تدبیر نہ کرو  
 چہ کند آں کہ نہ گنجینہ شک دارد  
 بو با بندہ در آن روز و ہم امروز یک است  
 خشت و خاکے کا ازاں باش مقبر دارد  
 خود بریں قول کہ ماتم زوہ و مودہ دل است  
 دو گواہ از لب خشک مرثہ تر دارد  
 بہ گواہان و گریہ نگراقت حاجت  
 دم سر دویخ زر و دوقن لاغر دارد  
 از تو جز دوا و نخواستہم کہ و را بین دوا  
 ایں چنین کار نہ پا دیش نہ کیفر دارد  
 ہوس کار و گریہ بہ جز شعر و شرب  
 اینت حرفے کہ بسم بال لب ساغر دارد  
 اس مقصدہ کے آخر میں بھی یہی لکھتے ہیں کہ مکمل و کٹھوریہ کا قصیدہ لکھ کر بھیجا وہاں سے دو  
 خوشنودی نامے آئے نیز گورنروں نے خط بھیجے۔

ایڈمنشن صاحب کے قصیدے میں فرماتے ہیں :-

از حضرت شہنشاہ خاطر نشان بہن بڑ  
 در مزد و سنجی صد گونہ کامرانی  
 ناگہ دستہ بادے کاں خاست و قلمرو  
 بہ ہم نواں بنار نیل زنگ آسمانی  
 در وقت فتنہ بود غم نگین و بود بہن  
 زاری و بے نوائی پیری و ناتوانی  
 حاشا کہ بودہ باشم باغی بہ آشکارا  
 حاشا کہ کردہ باشم ترک و فغانانی  
 از تہمتے کہ بریں بستند بد سگالان  
 حکام راست با من یک گداز گران  
 در پیریم ازین غم جز مرگ چارہ نبود  
 خود پیر تہمتے من بودے اگر جوانی  
 وارم شکر عافے اندر گ و زیست  
 جاں گر چہ بہت شیریں تلخ بہت گانی

# گیارھواں باب

## عوارض اور وفات

ہزار خستہ ورنجور درجائے ری  
بچے ز غائب بوجہ خستہ تن یا آرزو

خواجہ حالی مرحوم غالب کی شکل و صورت کے متعلق فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے انہیں  
جوانی میں دیکھا تھا ان سے سنا گیا ہے کہ غفوان شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین و خوشرو  
لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی حسانت اور خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے  
قد و قامت اور بیل ذول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ لیکن آخری عمر میں خوراک کی قلت  
اور امراض کے هجوم کی وجہ سے وہ بہت نحیف و کمزور ہو گئے تھے۔ تاہم چونکہ ہار بہت چلا،  
قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس لئے اس حالت میں بھی نووارد تو رانی معلوم ہوتے تھے۔  
علیہ الغائب خود ایک خط میں جو میرزا حاتم علی بیگ تہر کے نام تھا۔ اپنی تصویر انفاظ میں کھینچی تھی  
جس سے ان کی جوانی اور بڑھاپے دونوں زمانوں کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

تمہارے شیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا یعنی عالم جوانی میں،  
تو میرا رنگ پتیلی تھا۔ اور دیدہ و رنگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ  
یا آئنا ہے تو چھاتی پر سانپ سالوٹ جاتا ہے۔ میں مجھ کو رشک نہ آیا اور میں نے خون جگر  
کھایا تو اس لکھ پر کہ دلہن کی خوشگئی ہوئی وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گزرتی تھی

شیخ علی خیر

۱۔ (1850-1851) (1850-1851) (1850-1851)

تادسترسم بود و دم چاک گریباں

شرمندگی از خستہ پشیمندہ دارم

جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے تیسرے دن چوہنی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دودانت ٹوٹ گئے ناچارسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رکھئے اس بھونڈے شہر میں ایک دروی ہے عام۔ ملا، حافظ، بسا پیچہ بند و صوفی، مفتا، بھٹیارہ، جولامہ، کنیر، امنہ پڑا بھی، سر یہ بال، فقیر نے جس دن اٹھی رکھی اسی دن سر سندا یا۔

یہ مکتوب ۱۸۵۹ء کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس کے آخر میں جارج فرڈرک ایڈنسن صاحب لفٹنٹ گورنر صوبیات متحدہ کو دستنبوڈز بھیجے گا ذکر ہے۔ ”دستنبو“ کی طباعت نومبر ۱۸۵۸ء میں مکمل ہوئی تھی۔ اور ایڈنسن صاحب جنوری ۱۸۵۹ء میں لفٹنٹ گورنر بنے۔ اس مکتوب کے ظاہر تو اس ہے کہ:-

(۱) غالب کشیدہ قاسم تھے۔

(۲) ان کا رنگ چنبی تھا۔

(۳) جوانی میں ڈاڑھی منڈاتے تھے۔

(۴) جب سر اور ڈاڑھی میں سفید بال آگئے تو سر منڈانا شروع کر دیا اور ڈاڑھی چھوڑ دی۔

(۵) جوانی میں می استعمال کرتے تھے۔

(۶) باسٹھ تریسٹھ برس کی عمر تک ان کے آگے کے دودانت اکھڑ چکے تھے۔ اس کے

ساتھ ہی انہوں نے مستی کا استعمال ترک کر دیا تھا۔

ابتداء میں صحت بہت چھی تھی | غالب کی صحت شروع میں بہت اچھی تھی۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ

ہے کہ ان کی ابتدائی تحریکات میں بیماریوں اور زخموں کا ذکر قریباً ناپید ہے۔ صرف مولوی محمد علی خاں صدر دین باندہ ہونڈیل کھنڈ کے نام کے ایک خط میں جو کلکتہ جانے کے دوران میں لکھا گیا

تھا۔ یہ ذکر ملتا ہے کہ انہیں باندہ کے قیام کے دوران میں بخار آگیا تھا۔ فرماتے ہیں :-

مذہب اللہ کہ رحمت صلیع (دوسرا) وحی (بخار) ہم انہما اثرے در طبع نگذاشتہ ضعف

اگر باقی است تزدوے نیست۔ چہ این رفیقے است کہ از وطن کمر ہری بستہ است۔

تپ لرزہ | اوروہ خطوط میں سب سے پہلے بیماری کا ذکر نشی ہر گوپال تفتہ کے نام کے ایک خط

میں آیا ہے جو ۲ مارچ ۱۸۵۴ء کا مرقومہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ۲۶ فروری

۱۸۵۴ء کو بیمار تپ لرزہ بیمار ہوئے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

میں چار دن سے لرزہ میں مبتلا ہوں۔ اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا

کھانا طلق نہیں کھا یا۔ آج تپشبنہ پانچواں دن ہے کہ نہ دن کو کھانا میسر ہے نہ رات کو

شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی اس طرفہ کو کھیتو

کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے ہرگز بھوک نہیں لگی۔ اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ غالب حفظ صحت کے لئے سہل بھی لے لیا کرتے تھے تفتہ کو ایک خط میں

لکھتے ہیں :-

میں سہل میں ہوں۔ یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں حفظ صحت کے واسطے سہل لیا ہے

تولج | ستمبر ۱۸۵۴ء میں تولج کا سخت حملہ ہوا۔ تفتہ کو لکھتے ہیں :-

بھائی وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا تو حق زبست کی نہ رہی۔ تولج او

پھر کیسا شدید کہ پانچ پر مغ نیم سہل کی طرح ٹپا کیا آخر عصارہ ریوند اور اندھی کاتیل پیا اس

وقت تولج گیا۔ مگر قصع نہ ہوا بختر کتنا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔

دس دن میں دو بار آدمی آدمی غذا کھائی۔ گو یا دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ مگر اب امی

کا پٹا اور انو بخارہ کا افشردہ اس پر د اور رائل سے خوف نہ گ کیا ہے اور صورت زبست کی

نظر آتی ہے۔ آج صبح کو ۴۴ مئی ۱۸۵۴ء بعد دو اپنے کے تم کو خط لکھا ہے یقین تو ہے

کہ آج ہیٹ بھر کروٹی کھا سکوں۔

چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا | دسمبر ۱۸۵۷ء میں قلم بنانے وقت چاقو سے ہاتھ زخمی ہو گیا تھا فرماتے ہیں :-

قلم بنانے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور دم کرایا۔ چار دن روٹی ٹہنی شکل سے

سے کھائی گئی ہے بہر حال اب اچھا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ غالب کی صحت شراب کے تباہ کی۔ ان کا جسم طبعاً قوی تھا۔ جوانی کے عالم میں شراب کے بڑے اثرات دے رہے۔ لیکن جب زندگی کا آفتاب نصف النہار سے آگے بڑھ کر زوال کی طرف مائل ہوا۔ اور بڑھا پائے لگا تو غالب کی جسمانی طاقت گھٹتی گئی اور بیماریاں بڑھتی گئیں مختلف آزارہ مستقل و پائدار ہوتے گئے۔ جسے کہ غالب کی زندگی کے آخری نو دس سال کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جس میں ان کو اپنی صحت کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی اطمینان نصیب ہوا۔ اور غالباً جسمانی و مالی پریشانیوں کے اسی ہجوم کے باعث وہ آخری عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے۔

۱۸۶۰ء | ستمبر ۱۸۶۰ء سے ان کے خطوط میں ضعف، نفاہت، قلت غذا اور ہجوم امراض کا ذکر ایک

عام چیز بن گیا تھا۔ میاں سیف الحق تیساح کو ۱۳ دسمبر ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

نا توانی زور پر ہے۔ بڑھا پے لئے کما کر دیا ہے ضعف، ہستی، کاپلی، اگر بجانی۔ رکاب

میں پاؤں ہے۔ باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور و درازہ پریش ہے۔ زادراہ موجود نہیں خالی

ہاتھ جاتا ہوں، اگر نا پر سیدہ بخش دیا تو خیر باگر با ز پرش ہوئی تو سفر مقرر ہے اور لاویہ زادراہ ہے

دور رخ جاوید ہے اور ہم ہیں نائے کیا کسی کا اچھا شعر ہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کہہ صبر جائیں گے

۱۸۶۱ء | ستمبر ۱۸۶۱ء کے ایک مکتوب میں ذاب علامہ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

روٹی کھانے کو باہر کے مکان میں سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے۔ جاتا ہوں تو

ہندوستانی گھڑی بھریں دم ٹھہرتا ہے۔ اور یہی حال دیوان خاں میں آکر ہوتا ہے دلی

رام پور نے مرشدزادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدوم محض ہوں۔  
سیاح کو نومبر ۱۸۶۱ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

ان دنوں صحت و باغ اور دوران سر میں اتنا مبتلا ہوں کہ والی رام پور کا بہت سا کام  
بھی یونہی دھرا ہوا ہے۔ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔

۱۸۶۱ء کے اواخر میں ہاتھ پر پھوٹا ہو گیا تھا جس نے نہایت غلیف وہ صورت اختیار کر لی  
اور اس کے علاج میں ہندوستانی جراحوں سے مایوس ہو کر غالب نے انگریزی ڈاکٹر کی طرف توجہ کی  
سر فرنا حسین کو لکھتے ہیں :-

رجب کے مہینے میں سید سے ہاتھ پر پھنسی ہوئی پھنسی پھوٹا رہی پھوٹا پھوٹ کر زخم بنا جو کچھ  
خارج ہو گیا۔ اب بہ قدر ایک کف دست وہ گوشت مروا ہو گیا۔

۱۸۶۲ء ۱۳ مئی ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں منشی شیو زائن آرام کو لکھتے ہیں :-

چھٹا مہینہ ہے کہ سید سے ہاتھ میں ایک پھنسی نے پھوڑے کی صورت پیدا کی پھوڑا  
پک کر پھوٹا اور پھوٹ کر ایک زخم زخم کا ایک غار بن گیا۔ ہندوستانی جراحوں کا علاج رہا  
مگر ہٹا گیا۔ دو مہینے سے کالے ڈاکٹر کا علاج ہے۔ سلطانی دوا رہی ہیں۔ ستر سے کٹ  
کٹ رہا ہے۔ میں دن سے انفاق کی صورت نظر آنے لگی ہے۔

اس کے بعد اپنی پیشین گوئی کے کھلنے، جمع شدہ روپیہ ملنے اور دوبارہ وقعت کے بحال ہونے  
کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آخر فروری ۱۸۶۲ء میں فوٹو گورنر پنجاب نے آئے  
انہوں نے چہرہ سی بھیج کر بلایا۔

میرا یہ حال ہے کہ علاوہ اس دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں ادبائیں ہاتھ میں

ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجی میں پیشاب کرتا ہوں اٹھا بیٹھا دھوا رہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پھوڑوں نے بڑھ کر عارضہ فساد خون کی شکل اختیار کر لی تھی اور  
غالب کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ بالخصوص ٹانگوں کے پھوڑے بہت غلیف وہ ہو گئے۔

تھے۔ یہ تکلیف کافی دیر تک غائب کیلئے وبال جان بنی رہی۔

۱۸۶۳ء | ۱۶ اگست ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں منشی بہر گوپال نفٹہ کو لکھتے ہیں :-

ایک برس سے عوارض خفا و غن میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سڑنا لگا ہو گیا۔ طاقت کے جواب دے دیا۔ دن رات لیٹا رہتا ہوں۔ کھانا کھانے وقت پٹنگ پر سے اٹھ بیٹھتا ہوں کھانا کھا کر اٹھ دھو کر پھر پڑ رہتا ہوں۔ حاجتی پٹنگ کے پاس حاجتی اُتر کر پیشاب کیا جاتا ہے۔ بیت الخلا جانا ایک مصیبت ہے۔ طشت چرکی ہسی مگر کئی قدم جانا پھر آنا کیا آسان ہے۔ ایک کم ستر برس کی عمر ہوئی۔ اب نجات چاہتا ہوں، بہت جیا کہاں تک جیوں گا۔

چودھری عبدالغفور سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

شورو اور امراض خاص اور برنج عام یہ ایک اجمال و سرسرا جمال سنو کہ میدنا بھر سے صاحب فراش ہوں صبح سے شام تک پٹنگ پر پڑا رہتا ہوں محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے۔ پر کیا امکان ہے جو جاسکوں صبح کو نو بجے کھانا نہیں آ جاتا ہے پٹنگ سے کھسٹ پڑا اٹھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر اٹھ دھوئے کئی کی۔ پٹنگ پر جا پڑا۔ پٹنگ کے پاس حاجتی لگی نہ تھی ہے۔ اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کیا۔ اور پڑا مدتوں سے یہ مرض ہے۔ کہ پیشاب جلد آتا ہے۔ اس صاحب فراش ہونے کو دیکھو اور دم بہ دم تقاضائے بول کو دیکھو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غائب کو تسلسل بول کا عارضہ تھا جو ذیابیطیس پر دال ہے۔ پھوڑے پھنسیوں کا جسم پر نکلنا اور مدت تک اچھا نہ ہونا بھی اسی کا مؤید ہے۔ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں :-

پاخانے اگرچہ دن رات میں ایک دفعہ جانا ہوں مگر صوبت کو تصور کرو ایک پھوڑا دہیں پہنچے ہیں جس کو ساعدہ کہتے ہیں۔ وہ پھوڑے بائیں پہنچے ہیں۔ سیسل میں بائیں پاؤں میں کھٹ پا



درپشت پاسے لے کر آدھی پنڈلی تک درم اور درم بھی سخت روادعات و محلات۔  
 داوہ کو ہٹانے اور تشکیل کرنے والی دوائیں اسے کچھ نہ ہوا۔ اب بخورینہ ہے کہ نیم کا بھرتا باندھتے  
 جب بچے پھوٹے تب مرہم لگائیے۔ کہو کف پائیں جرحت کا ل ہوا تو قیام کا کہاں ٹھکانا  
 پھر زچہ و صہری صاحب ہی کو لکھتے ہیں۔

برس دن سے فنا خون کے عوارض میں مبتلا ہوں بخور داوہ مرا کم لدا ہوں برس دن  
 میں ادوجاع سستے سستے روح تکمیل ہو گئی نیست و بر فاست کی طاقت نہ ہی اور پھوٹے  
 تو غیر مگر وہ نون پنڈلیوں میں ہڈیوں کے قریب دو پھوٹے ہیں کھڑا ہوا اور پنڈلیوں کی  
 ہڈیاں چڑانے لگیں۔ اور گیس پھٹنے لگیں۔ باتیں پاؤ پر کف پاسے جاں وہ پھوٹا ہے  
 پنڈلی پر درم ہے۔ رات دن بڑا رہتا ہوں پنڈ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے کھیل پڑا جعفر  
 حاجت پھر لیٹ رہا۔ اسی صورت سے روٹی کھاتا ہوں۔ اشعار کی اصلاح یک قلم ہو خوف،  
 خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں دو خط چوہری صاحب کے آئے اور ایک خط شاہ عالم کا  
 اور دو خط حضرت صاحب کے آئے (یعنی صاحب عالم ہارہری)۔۔۔ جواب نہ لکھ سکا۔  
 آج اپنے کو طعنے دے کر مر دینا یا جب یہ عبارت لکھی۔

ایک خط میں فارسی شاعری کی مختلف طرزوں پر بحث کرتے ہوئے اردو کے چند اچھے شعر  
 نمونہ لکھے ہیں جن میں ایک شعر تیرتی کا ہے۔ دوسرا سودا کا۔ تیسرا حاتم کا اور چوتھا متین کا پھر لکھتے ہیں  
 ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش ہاں بیشتر تیز تر موجود ہیں۔ مگر ان کا کوئی شعور اس وقت یا  
 نہیں آتا۔ یاد کیا آئے یثا ہوا ہوں دم بہ دم بانو کے درم کی ٹپس ہوش اڑاے دی ہے۔  
 قاضی عبدالجلیل صاحب بریلوی کے نام کے ایک خط میں بھی ان آلام کا ذکر ہے۔  
 معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے مرنے کی پیشگوئی کی تھی۔ اور تاریخ وفات بھی نکال  
 لی تھی۔ سو اتفاق سے اسی سال وادی میں ہیضہ کی وبا شائع ہوئی۔ غالب نے اپنی پیشگوئی کی تفسیر پر

ایک دوست کو ذرا تعفن یہ بات لکھی تھی کہ دبائے عام میں میرے لئے مرنا باعث ہنس تھا  
قاضی عجمیل کو لکھتے ہیں:-

۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا۔ مگر اس میں برس میں اس سے  
معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۸۵ھ یا ۱۲۸۶ھ میں لکھا گیا تھا۔ ہر روز مرگ نوکا منہ پھٹتا رہا۔  
حیران ہوں کہ کوئی صورت زیست کی نہیں پھر میں کیوں جیتا ہوں۔ روج اب میرے جسم میں  
اس طرح گھبراتا ہے جس طرح طائر نفس میں کوئی شغل کوئی اختلاط کوئی جمع ہند نہیں کرتا۔  
سے نفرت جسم سے نفرت۔ روج سے نفرت جو کچھ نکھارے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز گزین منزل ویرانم

نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے کہ بایں پاؤں میں ورم کھ پات سے پشت پا کو گھیرتا ہوا  
پنڈلی تک چلا گیا ہے۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی گیس پھٹنے لگتی ہیں۔ کھانا دیوانخانہ میں منگوا لیتا ہوں  
بیشاب کہ کیوں کر نہ اٹھوں۔ حاجتی رکھ لی۔ بیزار و کڑو بیٹھے بات نہیں بنتی۔ پانخانہ کو اگرچہ دوسرے  
تیسرے دن جاؤں مگر جاؤں تو سی۔ پسب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی آغا  
فتح مزید علیہ یا ستر راج

پیری و صد عیب چہیں گفتمہ اند

اپنا یہ مصرعہ آ بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار

پھوٹروں اور پھنسیوں سے شفا یاب ہوئے تو ضعف اور بھی بڑھ گیا۔ قاضی عجمیل کو لکھتے ہیں:-

اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے کہ خدا کی پناہ

اور ضعف کیوں کر نہ ہو برس دن سے صاحب فراش ہوں ستر برس کی عمر ہے۔ جتنا غن

بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر خلیا گیا سن کہاں جواب پھر تولید و دم

صالح ہو۔ پھر حال زندہ ہوں اور ناتوان اور آپ کی پس شہائے دوت نہ کا ممنون

۱۸۶۵ء مختلف خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالبؒ ۱۸۶۵ء تک فساد خون یا حراق خون کے امراض میں مبتلا تھے بشکلاً حکیم غلام محنف خاں صاحب کے نام کے ایک خط میں پھوڑوں، ناطاتی کا ذکر ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ قبض انہما کو پہنچ گیا ہے۔  
ذاب انورالدولہ بہادر کو لکھتے ہیں :-

مہربان، نہ اسہال، نہ قلع، نہ نقوہ ان سب کے بڑا ایک صورت پسکورت  
یعنی اتراق کا مرض مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے ہر پھوڑے پر ایک نیم ہر نیم پر ایک  
ہر روز بے سبالد بارہ تیرہ پھاتے اور پاؤں بھر مرہم و رکاز فوس میں بے خور و خواب رہا  
ہوں اور شب و روز بے تاب، راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی دو گھنٹی غافل  
ہوں گا۔ کہ ایک آدھ پھوڑے میں میں ابھی جاگ اٹھا ترپا کیا پھر سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔  
سال بھر میں تین حصے دن یوں گزرے پھر تخفیف ہوئے لگی۔ دو تین مہینے رٹ پوٹ کر  
اچھا ہو گیا نئے سرے سے روح غالب میں آئی اہل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔  
اسی خط میں آگے چل کر اپنی حالت یوں بیان کرتے ہیں :-  
حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیریں اٹھتا ہوں کہ بتنی چریق آدم  
دیوار اٹھے۔

ذاب انورالدولہ نے کسی سے سنا تھا کہ غالبؒ کا انتقال ہو گیا ہے اس واقعہ کا انہوں نے  
غالباً اپنے خط میں بھی ذکر کر دیا تھا غالبؒ لکھتے ہیں :-

آپ کی پسنش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا زمانہ سائیری خبر نہ لی میری  
مرگ کے خبر کی تقریر دیشلہ میری یہ تحریر آدمی سچ اور آدمی جھوٹ و در صورت مرگ نہم مودہ  
اور در حالت حیات ہم زندہ

دکشا کش ضعف نگسد رواں از قن،

ابن کہ من نے میرم ہم نہا تو انہماست

۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۹ء تک یہ میں غالبؒ کی وفات کی خبر شہر ہوئی تھی ڈاکا چنڈا بادی نے تاریخ و نجات بھی کہہ دی تھی  
(ملاحظہ ہو خاں خاں صفحہ ۲۰۹)

۱۸۶۵ء میں ان کی مجبوری و معذوری بہت بڑھ گئی تھی۔ ۲۴ جولائی ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

تین برس عوارض اذوق خون میں ایسا مبتلا رہا ہوں کہ اپنے جسم و جان کی بھی خبر نہیں رہی..... میں اپنی زبان سے کیوں کر کہوں کہ چھابوں مگر بارہو عوارض میں گزرتا نہیں ہوں۔ بوڑھا۔ بہرا۔ اپاہج، بدحواس، ناتوان فلک زدہ آدمی ہوں۔

اکتوبر ۱۸۶۵ء میں غائب نواب کلب علی خاں مرحوم کے جن منشی میں شرکت کی غرض سے رام پور گئے تھے۔ وہاں ہی پہلو دا با وینچ کر رہا یہ ہو گئے اور پانچ روز وہیں صدر لکھنؤ صاحب کے مہمان رہے۔ ۱۸۶۶ء میں ان کی تحقیق عمر کی زیادتی کے ساتھ بڑھتی گئیں۔ اور آخر ۱۸۶۶ء میں نواب میر غلام بابا خاں سورتی نے مسرت آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے جواب میں ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:-

بہ سواری ریل روانہ ہونے کی سہولت میں آئی۔ پاؤں سے اپاہج اکاؤں سے بہرا  
بصارت، ضعف و بخل، ضعف دل، ضعف معدہ ان سب ضعفوں پر ضعف طالع کیوں کر تصدیق  
کر دے تین چار شبانہ روز قفس میں کس طرح بسر کروں (پنج بادل کے سفر میں) گھنٹہ بھر میں بارہ شب کی جٹ  
ہوتی ہو، کیفیت و کیفیت نے بعد نگاہ قویج کے دورے کی شدت ہوئی ہے۔ طاقت جسم میں۔  
حالت جان میں نہیں۔ آنا میرا مسرت تک کسی صورت چیز مکان میں نہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں کی دعوت جن میں شرکت کے لئے تھی اس کے متعلق ایک خط میں سیاح کو لکھتے ہیں:-

بھئی میں بہرہوں گانا کیا سنوں۔ بوڑھا ہوں ناچ کیا دکھوں۔ فدا چھ ماشے اٹا۔ کھانا  
کیا کھاؤں یہی مسرت میں انگریزی شہر میں ہوتی ہیں اگر وہاں آجا اور شراب خور ہوتا  
تو بیہوش رہتا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا جید آبادی کو ۱۲ مئی کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

۱۵ اردوئے معلیٰ صفحہ ۸۳۔

آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں آگے بہر تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں سلام پو کے سفر کا رہ آورو ہے رعشہ وضعف بصر ہاں چار سطر لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں۔ حرف سو جھنے سے رہ گئے۔ اکثر برس جیا بہت جیا اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

تم میری بابت پوچھتے ہو۔ مگر میں کیا لکھوں۔ ہاتھ میں رعشہ انگلیاں کہنے میں نہیں ایک آنکھ کی بنیائی دال۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے تو اس سے خطوط کا جواب لکھو دیتا ہوں مشورہ یہ بات کہ جو کوئی کسی اپنے عزیز کی فاختہ دلاتا ہے موتے کی روح کو اس کی بونچتی ہے۔ ایسے ہی میں سو نگہ لیتا ہوں غذا کو پہلے مقدار غذا کی تولوں پر منحصر تھی۔ اب ماشوں پر ہے۔ زندگی کی توقع آگے مہینوں پر تھی اب دنوں پر ہے۔

اکتوبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :-

بہتر برس کا آدمی، پھر بخور دانی۔ غذا بھلا مفقود۔ آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں نہ روٹی نہ بوٹی نہ پلاؤ نہ خشک آنکھوں کی بنیائی میں فرق۔ ہاتھ کی گیرائی میں فرق۔ رعشہ مستولی، حافظہ معدوم۔

۴۴ رو مئی ۱۸۶۶ء کے ایک مکتوب میں رقم فرماتے ہیں :-

اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے ہتھرواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات ام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ دو پہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی، قریب شام کبھی کبھی تین تے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گتے پانچ روپے بھر (ایک چھٹا نمک) شراب خانہ سنا اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال کہ آٹھ نہیں سکتا۔ اگر دو نو ہاتھ ٹپک کر خفاہ بن کر اٹھتا ہوں تو پنڈیاں لڑتی ہیں۔ ہمنادوں بھر میں دس بارہ بار اور اسی قدر رات بھر میں پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے۔ اٹھا اور پیشاب کیا

اور پڑا۔ اسباب حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بد خواب نہیں ہوتا۔ بعد ازاں  
بول بے توقف زندہ جاتی ہے۔

ان خطوط سے ظاہر ہے کہ احتراقِ خون کے مرض میں جو کم و بیش تین برس مسلسل رہا تھا،  
بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ذیابیطس کا عارضہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ رات دن میں میر  
پچیس بار پیشاب کی حاجت ہوتی تھی۔ کانوں سے بہرے ہو چکے تھے۔ بصارت بہت  
کم ہو گئی تھی۔ بلکہ ایک آنکھ کی بنیانی کلیتہً زائل ہو چکی تھی۔ غذا کی مقدار بے حد گھٹ گئی تھی۔  
قیض کی شکایت شدید تھی اور وقتاً فوقتاً قریح کا سخت دورہ ہوتا تھا۔ لہتوں پر عشاء طاری تھا۔  
۱۸۶۷ء | اب ۱۸۶۷ء کی کیفیت سنے ۲۲ اپریل کے ایک خط میں منشی میاں داد خاں سیاح  
کو لکھتے ہیں :-

میں اب محض نکما ہو گیا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پچاس جگہ سے اشعار واسطے اصلاح کے  
آئے ہوئے کبس میں دھرے ہیں..... جس دن ذرا آفاق پاؤں گا ان سب کا غذا کو دیکھو گا  
جون ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں :-

بھائی میرا حال اسی سے جاؤ کہ اب خطائیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا اب  
رعشہ وضعف بصارت کے سبب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ جب حال یہ ہے تو کمر حجاب  
میں اشعار کو اصلاح کیوں کر دوں۔ اور پھر اس موسم میں کہ گرمی سے سر کا بھیچا پگھلا جاتا  
ہے۔ دھوپ کے دیکھنے کی تاب نہیں۔ رات کو صحن میں سوتا ہوں صبح کو دو آدمی لہتوں  
لے کر دالان میں لے آتے ہیں۔ ایک کو ٹھہری ہے اندھیری اس میں ڈال دیتے ہیں  
تمام دن اس گوشہ تاریک میں پڑا رہتا ہوں۔ شام کو پھر دو آدمی بدستورے جا کر پنگ پر  
صحن میں ڈال دیتے ہیں۔

منشی حبیب اللہ خاں نوکا لکھتے ہیں :-

میں اب قریب مرگ ہوں۔ خدا باطل مفقود اور مرنے ستولی پتھر برس کی عمر نامزد و نااہلہ اجو

پھر لکھتے ہیں:-

ستراہتر اور توجہ پر خزانہ ہے۔ میری تہتر برس کی عمر ہے بس میں خوف ہوا۔ حافظہ گویا کبھی بچھا ہی نہیں۔ سامعہ بال بہت دن سے تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی حافظہ کی مانند مدوم ہو گیا۔ اب مینہ بھر سے یہ حال ہے کہ جو دوست آتے ہیں رسمی پرشش مزاج سے بڑھ کر جو بات ہوتی ہے وہ کاغذ پر لکھ دیتے ہیں۔ غذا مفقود ہے۔ بیج کو قذا اور شیرہ باد اہم تر۔ دوپہر کو گوشت کا پانی سرشام تلے ہوئے چار کباب سوتے وقت پانچ روپے بھر شراب اور اسی قدر کلاب خرف ہوں۔ پوچ ہوں۔ عاصی ہوں۔ فاسق ہوں۔ رویا ہوں۔ یہ شعر میر تقی کا میرے تب حال ہے۔

مشہور ہیں عالم میں مگر ہوں بھی کہیں ہم

القضہ نہ دوپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

۱۸۶۶ء ۶ اپریل ۱۸۶۸ء کے ایک خط میں میر غلام بابا خاں کو لکھتے ہیں:-

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہند کی شرح کے بعد جو مجھ غمائے نہانی کا ذکر کیا کرو

جیسے ابریاہ چھا جاتا ہے۔ یا ٹڈی دل آتا ہے بس اللہ ہی اللہ ہے۔

اسی حالت میں ۱۸۶۸ء ختم ہوا۔ اور ۱۸۶۹ء شروع ہو گیا۔ غالب اگرچہ ہمہ تن مجبورۃ اض

بن چکے تھے لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ موت کا فوری سبب کون سا مرض بنا۔

مرض الموت | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ مرنے سے چند روز پیشتر یہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی کہ بے

ہو جاتے۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے آفاقہ ہوتا پھر بے ہوش ہو جاتے۔ وفات

سے ایک روز پیشتر خواجہ حالی عیادت کو گئے۔ تو کئی پہر کے بعد آفاقہ ہوا اٹھا اور نواب

علی الدین احمد خاں کو خط لکھوا رہے تھے۔ نواب صاحب نے حالت پر بھیجی تھی اس کے

جواب میں لکھوا یا۔

میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ایک آدھ روز میں مہایوں سے پوچھنا۔

اسی خط میں ایک شعر بھی لکھوایا تھا جس کا صرف ایک مصرعہ خواجہ حالی کو یاد رہا :

نہ کرد ہجر مدارا بہن سر تو سلامت

آخری عمر میں اپنا یہ شعر اکثر پڑھتے رہتے تھے ۔

دم واپس بر سر راہ ہے

عزیز و اب اللہ ہی اللہ ہے

وفات | غرض ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق آخری قعدہ ۱۲۸۵ھ) کو ادب شعر کا یہ درخشاں ستارہ جس کی عالم تابی دہو ہوا ضیہ کے لئے سرمایہ ناز اور ترون آئندہ کے لئے منار ہدایت تھی ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون ۔

تمام اکابر شہر جنازے میں شریک ہوئے شیعہ حضرات اپنے طریق پر مراسم بہنیر و کفن ادا کرنے کے خواہاں تھے۔ لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے جو غالب کے مذہبی خیالات و مسلک کے سب سے بڑھ کر راز دان تھے۔ اس کی اجازت نہ دی۔ اور تمام مراسم طریق اہل سنت کے مطابق ادا کئے۔ دہلی دروازہ کے باہر نماز جنازہ پڑھی گئی۔ اور حضرت شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے قریب نواب الہی بخش خاں معروف کے مزار کے پاس دفن کئے گئے۔ بد اللہ تعالیٰ مضجعہ حالی۔ مخرج اور دوسرے شاگردوں نے پروردگار شہید لکھے۔

مزار | غالب جس احاطہ میں مدفون ہیں۔ اس میں کم فٹ چوبیس قبریں ہیں احاطہ کے ارد گرد قریباً پانچ فٹ اونچے دیوار ہے۔ تمام قبروں کے متعلق ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کس کس کی ہیں لیکن یقینی طور پر معلوم ہے کہ غالب کے علاوہ اس احاطہ میں نواب الہی بخش خاں معروف، میرزا علی بخش خاں رنجور، نواب زین العابدین خاں عارف، میرزا باقر علی خاں کاکل، اوسگیم صاحبہ غالب بھی دفن ہیں بقیہ قبریں بھی یقیناً اسی خاندان کے افراد کی ہوں گی۔

غالب کی قبر پر چوڑے کا پستر ہے۔ سر نے سنگ مرمر کی ایک لوح نصب ہے جس پر ہے

رنگ عونی دفتر طالبد اسد اللہ خان غالب مرد



کے علاوہ میرمدی مجروح کا یہ قطعہ تابیخ کندہ ہے ۷

گل میں غم و اندوہ میں باخاطر مخروں      تھا تربت اُستاد پہ بیٹھا ہوا غمناک  
دیکھا جو بھٹکے سر میں تابیخ کے مجروح      ہاتھ لے کر گنج معانی سے تہ خاک

دستی مزار کی کوششیں اربیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم جب اپنے مشہور اخبار کا مرید "کوہلکیتہ" سے دہلی لائے تھے۔ تو انہوں نے مزار غالب کے لئے چندے کی تحریک فرمائی تھی۔ انوس کہ حضرت مولانا اپنی وسیع سیاسی مصروفیتوں کے باعث اس تحریک پر پوری توجہ نہ فرما سکے۔ حال میں خواجہ حسن نظامی صاحب اور بعض دوسرے ارباب علم و ادب نے "غالب سوسائٹی" کی بنیاد رکھی ہے۔ مزار غالب کے دستی کے علاوہ ایک غالب ہال بھی بنانا چاہتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اس باب میں سعی یلین فرما رہے ہیں۔ غالب کے احاطہ مزار کے پاس ایک قطعہ زمین تھا جسے حکیم حاجی عبدالحکیم صاحب مالک بہمدرد و اخانہ دہلی (خازن غالب سوسائٹی) نے اپنے پاس سے معقول قیمت دے کر خرید لیا اور غالب سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔

ایک اور قطعہ زمین بیگم صاحبہ حکیم محمد واصل خاں مرحوم دربار کلون مسیح الملک حکیم اجل خاں مرحوم نے حکیم محمد احمد خاں صاحب کی سفارش سے عطا فرمایا۔ غالب ہال کے لئے دس ہزار روپے کی ضرورت بتائی جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب فراہمی زمین مصروف ہیں۔ مناسب رقم جمع ہو جانے پر مزار کی توسیع بھی کی جائے گی اور اہل کی تعمیر کا کام بھی شروع کر دیا جائے گا۔



## بارھوال باب

### خلاق عادات اور تفرق حالات

نہ بخشندہ شاسے کہ بارم دہد بہ ہر بار ز پیل بارم دہد

کتاپیل زانجا بزانگیرے زرش بگدایاں فروزیرے

غالب کے اخلاق کا بات بہت وسیع ہے لیکن ان کی نظم و شعر کے سمندر میں سے ان شہوار موتیوں کو اکٹھا کرنا بے حد مشکل ہے۔ اگر راستے کی دشواری سے بے پروا ہو کر اس منزل کو طے کرتے تو قصہ کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا دفتر تیار ہو جائے گا جس میں غالب کی نظم و شعر کے اکثر حصے بہ ترتیب مختلف شال کرنے پڑیں گے۔ بلکہ بعض حصوں کو مختلف عنوانوں کے تحت کئی کئی مرتبہ نقل کرنا پڑے گا۔ لہذا میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس لذیذ حکایت کے چند نمایاں عنوانات اختصار کے ساتھ پیش کر دوں تاکہ شخص غالب کا ایک عام خاکہ انکھوں کے سامنے آجائے۔

سادہ دل و درست گفتار | غالب نے ایک فارسی خط میں سر سراج الدین احمد خاں کو لکھا ہے :-

تہ محمد کہ سادہ دل و درست گفتارم آفریدہ اندر ہرچہ در دل و دہم بہ زبان باگو فرستم۔

ان چند لفظوں میں ان کے اخلاق کی پوری تصویر آگئی ہے۔

ایشا رو کرم | اُر و مکاتیب میں ایک جگہ فرماتے ہیں :-

قلندری و آزادگی و ایشا رو کرم کے جو دو امی میرے خالق نے مجھ میں بھروسے بقصد ہزار ایک نمود

میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی نہ لاطنی نہ تھیں لوں اس میں شطرنجی اور ٹین کا ایک ٹولہ نہ تو

کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ چل دوں کبھی شیرازہ جانتا کبھی مصر میں جا ٹھہر کبھی بھٹ جا پہنچا،

لے کلیات نظر غالب صفحہ ۳۴۰۔

نہ وہ دشتگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ کسی جس ٹھہریں ہو  
اس شہر میں تو بھوکا نکٹا نظر نہ آئے۔

یہ شاعری نہیں سخن طرازی نہیں یہ بالغہ آرائی نہیں، بلکہ حقیقت و واقعیت ہے اور عجب  
کی داستان حیات کا ہر ورق اس پر گواہ ہے۔

اسی طرح ٹھنڈی برگہ پائیں بے سلسلہ نماجات اشد تھالے کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ  
میرے کردار و افعال کا حساب نہ لے۔ اگر محاسبہ ناگزیر ہو تو پھر مجھے بھی اجازت دے تاکہ جو جو  
حسرتیں دل میں باقی رہیں انہیں تفصیل سے بیان کر دوں۔ تیرے حکمِ عدل و انصاف کی طرف سے جو جرم  
میرے ذمے ثابت ہو۔ اس کے مقابلے میں حسرتوں کی ایک صف کھڑی کر دوں۔ اس طرح تجھے  
آشکارا ہو جائے گا کہ میرے جرموں کے مقابلے میں میری حسرتیں زیادہ ہیں۔ اس ضمن میں  
اپنے جذبات و دواعی کو نہایت موثر طریق پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ہانا تو دانی کہ کا فر نیم	پرستار خورشیدِ آذر نیم
نہ کشتم کسے را بہ اہرنی	نہ بردم ز کس مایہ دہرنی
مگرے کہ کش بگو دم آدو	بہنگامہ پروازم و دم آدو
من اندو گھینے اندہ رہا	چہے کہ دم اسے بندہ رہا
حسابے ورا مشق نگ بو	نہ جہشید بہرام و پرویز
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند	دل دشمن و چشم بد بختند
نہ ازمین کہ اژتابے گاہ گاہ	بد دیوزہ رخ کردہ باشم سیا
نہ بتاں سرے نہ نیجا	نہ دستانے نہ جانا
نہ رقص پری پکیں بریاں	نہ غوغا ہے ریشگران بریاں

بے نواؤں سے ہمدردی | پھر فرماتے ہیں کہ زندگی میں جو کچھ مجھ پر گذری اسے کیا بیان کروں بیان

کرنے کا وقت ہی نہ رہا۔ بہاریں آئیں لیکن میں کسروسامانی کا ماتی رہا، نفی پرشادمانی افزہ بادل چھا  
لیکن میرا جام سفالیں شراب سے خالی رہا۔ اگر عیش کا کوئی لمحہ نصیب بھی ہوا تو اس کی حیثیت قصہ سل  
کی سی تھی۔ رشتہ درست ہوا تو گوہر ٹوٹ گیا۔ شراب مہیا ہوئی تو پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

گیتی درم بے نوا دشتی      دلم را سیر ہوا دشتی

نہ بخشندہ شاہ ہے کہ بارم      بہر بار ز رسیل بارم دید

کہ چوں پل ز انجیر انگیز      ز درش برگدایاں فرویز

گویا اگر دولت اور صلہ کی خواہش تھی تو اپنی ذات کے لئے، اپنی آسائش کے لئے اور  
اپنی راحت کے لئے نہ تھی بلکہ آرزو یہ تھی کہ پادشاہ بلائے، ہر مہم تہہ ماتھی پر لاؤ کر زرو جو اہر عطا کر  
غائب ماتھی کرے کہ یا ہر نگلیں اور زرو جو اہر فقیروں پر ساتے جائیں۔  
پاکیز حسن اخلاق | خواجہ عالی اپنے مشاہدات کی بنا پر فرماتے ہیں :-

مرزا غالب اس کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو ان سے ملنے جاتا  
تھا بہت کٹاوردہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ ان سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ ان  
ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی  
خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ ان کے دوست ہر ملت اور مذہب کے نہ صرف  
دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے جو خطوط انہوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں  
ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غنوار ہی دیکھا گت پکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط  
کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمے فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے  
جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے  
تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگ دل نہ ہوتے تھے۔ غزلوں کی اصلاح کے  
سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے۔ اور وہ غالباً  
ان کی تعمیل کرتے تھے۔ مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بہ درجہ غایت تھا۔ اگرچہ

مرزا کی آمد فی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے لنگڑے ٹرے اور پانچ مرو و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمد فی کچھ اور پڑیٹھ سو روپیہ ماہوار ہو گئی تھی اور کھانے پینے کا خرچ بھی کچھ لمبا چڑاند تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے۔ اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے۔

فراخ حوٹگی خواجہ حالی نے ان کی فراخ حوٹگی کے دو واقعات لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ غدر کے بعد انہیں لفٹنٹ گورنر کی طرف سے سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا۔ لفٹنٹی کے چہرے اسی اور بعد ارتقا کے مطابق انعام لینے کے لئے آئے۔ غالب کو پہلے ہی سے معلوم تھا کہ انعام دینا ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے چہرے کیوں کو ایک الگ مکان میں بٹھادیا اور خلعت مع رقوم جواہر بغرض فروخت بازار بھیج دیا۔ جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب چہرے کیوں کو انعام دے کر رخصت کیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ غالب کے ایک امیر دوست جن کی حالت غدر میں بہت سقیم ہو گئی تھی چھینٹ کا فعل پہنے ہوئے ملنے آئے۔ غالب نے انہیں کبھی مالیدہ یا جامہ دار کے چنوں کے سوا انہیں دیکھا تھا چھینٹ کا فعل دیکھ کر غالب کا دل بھر آیا۔ امداد کا خیال پیدا ہوا لیکن دوست کی ولداری کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسے طریق پر سلوک کیا جائے کہ اسے اپنی بیچارگی اور بے بسی کا احساس نہ ہو۔ اور پیش کردہ ہدیہ کو قبول کرتے ہوئے عار نہ آئے۔ غالب نے اس غرض کو مد نظر رکھ کر چھینٹ کے فعل کی بے حد تعریف کی۔ پوچھا کہ چھینٹ کہاں سے لی ہے۔ اور درخواست کی کہ مجھے بھی اسی کا فعل بنوا دیا جائے۔ دوست نے بلا تکلف کہا کہ اگر آپ کو یہ بہت پسند ہے تو یہی لے لیجئے۔ غالب نے کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ آپ سے ابھی چھین لوں لیکن جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے۔ آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے اس کے ساتھ ہی اپنا مالیدہ کا نیا چنہ انہیں پہنا دیا، ایک نازک دل اور نازک احساسات والے

شاعر کی شان دوست نوازی ایسی ہی ہونی چاہئے تھی۔

احسان لینا گوارا نہ تھا | غالب کسی کا فدا سا احسان بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ”دوست بنو اور  
کے گھرے دوستوں اور شاگردوں (حقیر تہرا و تفتہ) کے زیر اہتمام ان کے دیر بہ  
نیا و مند (منشی شیو زان) کے مطبع میں چھپی تھی پچاس جلدوں کی قیمت رائے امید سنگھ اندہ  
وائے نے ادا کر دی تھی۔ ان میں سے بیشتر جلدیں غالب کو مل گئی تھیں۔ ان جلدوں کے  
غالب نے ”دوست بنو“ کی جتنی جلدیں منگائیں قیمت بھیج کر منگائیں تفتہ کو لکھتے ہیں :-

میں نے ایک بار سات روپے کی ہنڈی بھیج کر بارہ جلدیں اور بختری ان سے منگوائی۔

پھر ان کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنو کو ان کے ہاتھوں سے وہیں بھجوا دیں  
اور اس کے بعد اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سروہنے بھجوائیں مدغرض  
اس تحریر سے یہ سہ کہیں بعد اس پچاس جلد کے سولہ جلدیں اور ان سے بے چکا ہوں۔

مگر نقد قرض میں نے نہیں منگوائیں۔

اسی طرح انہوں نے اپنی کلیات کے جتنے نسخے منشی نو لکشور سے منگوائے ان کی قیمت کی  
دوستوں کی خدمت | دوستوں کی ہر خدمت کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ منشی ہر گوپال تفتہ  
نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ اور نواب ضیا الدین احمد خاں نیر کی تعریف میں قصیدے لکھ  
تھے۔ غالب نے تفتہ کو ان کا صلہ دلوا یا۔ وہ خود تفتہ کو لکھتے ہیں :-

تم کو معلوم رہے کہ ایک مدوح تمہارے یہاں آئے ہیں ان کو میں نے تمہارے فکر اور تلاش

کا مداح پایا جنوری ۱۸۶۲ء میں کچھ تمہاری خدمت میں بھیجیں گے تم کو قبول کرنا ہو گا سمجھے یہ کون؟

یعنی نواب مصطفیٰ خاں صاحب دوسرے مدوح یعنی نواب ضیا الدین احمد خاں وہ آخر دسمبر

۱۸۶۲ء یا اوائل جنوری میں حاضر ہوں گے۔

ہندوستانی مشورہ انگریزی کرہ | دوستوں کی امداد میں کبھی انہوں نے تامل نہ کیا۔ ان کی آرزو ہمیشہ یہ رہی  
کہ جو لوگ ان سے وابستہ تھے وہ زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں۔ وہی کے مستقل ڈپٹی کلکٹر

رخصت لے کر ہاڑ پڑ گئے اور ان کی جگہ ریٹی گن صاحب عارضی طور پر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے نہیں  
 پسندوستانی شعرا کا ایک انگریزی تذکرہ لکھنے کا خیال تھا۔ غالبؔ بھی مدد مانگی۔ غالبؔ نے نواب  
 ضیاء الدین احمد خاں سے شعرا کے تذکروں کی سات کتا میں مستعار لے کر ریٹی گن صاحب کو  
 بھجوائیں اور زندہ شعرا کے حالات خود لکھ کر ان کے پاس بھیج دیئے۔ ان میں منشی ہر گوپال  
 کے حالات بھی لکھے تھے۔ ریٹی گن صاحبؔ نے غالبؔ کو خود بھی تفتہ کو خط لکھا تھا تفتہ کے دل میں خیال  
 پیدا ہوا کہ اگر غالبؔ خود ریٹی گن صاحبؔ کے پاس جا کر سفارش کریں گے تو ان کے متعلق زیادہ اچھے  
 الفاظ لکھے جائیں گے۔ انہوں نے ایک خط کے ذریعہ سے غالبؔ پر اپنا یہ خیال ظاہر بھی کر دیا تھا  
 لیکن اس اثنا میں ریٹی گن صاحب عارضی ڈپٹی کلکٹری کی مدت پوری کر چکے کے بعد عدالت خفیفہ  
 کے جج ہو گئے تھے۔ اور شہر سے باہر فاصلہ پر رہنے لگے تھے۔ غالبؔ تفتہ کی خاطر پھر بھی ان کے  
 پاس جانے کے لئے تیار تھے۔ وہ خود تفتہ کو لکھتے ہیں۔ کہ ریٹی گن صاحبؔ کے منشی منظر الحق جی صاحب  
 آئیں گے ان سے

حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمہاری صلاح کا موجب ہوگا تو ضرور (ریٹی گن صاحبؔ کے

پاس) جاؤں گا۔

سفارشوں کے لئے مستند | سفارشوں کے باب کے میں وہ بڑے مستعد تھے۔ نواب میر علی نقی خاں بڑے

عالی خاندان آدمی تھے۔ نواب ذوالفقار خاں اور نواب اسد خاں عالمگیری کی اولاد میں سے

تھے۔ وہ نوکری کی جستجو میں نکلے تو غالبؔ نے سید بدر الدین احمد کو سفارشی خط لکھا فرمائے ہیں:۔

آپ ان کی (علی نقی خاں کی) تنظیم و توثیق میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں۔ اور سراج کمال

سب ان پر ظاہر کریں۔ اور انہیں اعلیٰ سرکار سے ملا دیں۔ اور بابو صاحبؔ جو ان کو ملوایئے

نومیرا یہ خط جو آپ کے نام ہے جناب بابو صاحب کو پڑھوا دیجئے۔ کیا خوب ہو کہ یہ سرکار میں نوکر

ہو جائیں۔ اور اگر نوکری کی صورت نہ پئے تو راج سے ان کی رخصت بہ آئین شائستہ عمل ہو سکے

ذاب اسد خاں عالمگیر کے وزیر تھے۔ اور فرخ سیران کا چچا یا ہوا تھا۔ جب فرخ سیران نے ذوالفقار

کو مار ڈالا تو اذرو تے کتب تو ایسے ظاہر ہے کہ سلطنت کیسی برہم ہو گئی۔ اور خود فریج پر کیا گزری۔ قصہ کوتاہ ان کی تقریب میں جو دایچ آپ صرف کریں گے اور جس قدر آپ کی بہبود کی کوشش کریں گے احسان بھر پور ہو گا۔

تواضع اور انجلیح مقاصد خلق | صاحب عالم مارہروی نے غالباً لالہ گو بند پر شاہ صاحب کو سفارشی دے کر بھیجا تھا۔ اور غالب کو براہ راست بھی لکھا تھا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-  
لالہ گو بند پر شاہ صاحب ہنوز میرے پاس نہیں آئے ہیں۔ دنیا دار نہیں فقیر خاکسار ہوں  
تواضع میری خوشے انجلیح مقاصد خلق میں حتی الوسع کمی کروں تو ایمان نصیب نہ ہو۔  
انشاء اللہ العزیز وہ فقیر سے رہی خوشنود رہیں گے۔

خط کشیدہ الفاظ سے غالب کے کمال حسن اخلاق اور جذبہ خدمت خلق کی حیثیت نہایت اچھی طرح آشکارا ہو سکتی ہے۔

قیدیوں کی سفارش | نواب انور الدولہ نے غالباً دو قیدیوں کے لئے سفارشی خط طلب کیا تھا۔ انہیں لکھتے ہیں کہ حکم بطیب خاطر بجا لاتا ہوں مگر یہ فرما دیجئے کہ کیا لکھوں اور خط کس کو بھیجوں نیز سفارش کر مقصود کیا یہ ہے کہ قیدی ہندوستان میں رہیں اور انڈیان نہ جائیں یا یہ ہے کہ کالکار ہا ہو جائیں  
آخر میں فرماتے ہیں:-

ہر حال اس خط کے ساتھ ایک اور لفافہ آپ کے نام کاروانہ کرتا ہوں۔ اس میں صرف ایک خط مرسومہ منشی صاحب (جن کے پاس سفارش بھیجانی منظور تھی) ہے کھلا ہوا۔ اس کو پڑھ کر میاں امیر الدین کے پاس بھیج دیجئے جگا گوندنگا کر (یعنی بند کر کے) اگر یہ منظور نہ ہو تو میری طرف سے منشی صاحب کے نام کا خط لکھ کر میرے پاس بھیجے اور لکھ بھیجے کہ اس مسودہ کو صاف کر کے کہاں بھیجوں۔

دوست فداوی | نواب حسین مرزا کی ہر چیز غدر میں تباہ ہو چکی تھی۔ ان کے بھائی مظفر الدولہ مارے جا چکے تھے۔ انہیں ایک خط میں لکھتے ہیں:-



اگر کون کر میری جان بھی تمہارے کام آئے تو میں حاضر ہوں۔ یہ کہنا مختلف محض ہے کون کسی کی جان مانگتا ہے کون جان دیتا ہے مگر جو فکر مجھ کو منہا دی ہے۔ اور جو میری دسترس ہے اس کو میرا خدا اور میرا خداوند (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) جانتا ہے۔ دسترس کو تم بھی جانتے ہو۔ انشا را فضل ماہ آئند یعنی فرسین خطہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۹ء کا مرقومہ ہے۔ تیر (صنیار الدین احمد خاں) والا مقدمہ درست ہو جائے۔

اس کے بعد یہ ذکر ہے کہ نواب حسین مرزا کے ساتھ کار کو مختلف طریقوں سے سمجھایا کچھا کر اس بات پر رضی کیا ہے کہ وہ نواب صاحب کو کچھا اور روپیہ بھیج دے۔  
منشی شیو زائن کو لکھتے ہیں :-

سریاں عبد الحکیم بہت نیک بخت اور اثر وافر اور ہنرمند آدمی ہیں۔ ولی گزٹ میں حزنوں کے چھاپے کا کام کرتے تھے چونکہ وہ چھاپہ خانہ اب آگرہ میں ہے۔ یہ بھی وہیں آتے ہیں۔ تمہارے پاس حاضر ہوں گے ان پر ہر بانی رکھنا۔ وہ شہر بنگالہ ہے ان کو تمہاری خدمت میں شن سائی رہے گی۔ تو اچھی بات ہے صحافی کا کام بھی بقدر ضرورت کر سکتے ہیں۔ شاید اگر ولی گزٹ میں ان کا طور درست نہ ہو تو اس صورت میں بشرط گنجائش اپنے مطبع میں رکھ لینا۔

امیر نیانی مرحوم | منشی شیو زائن نے ایک رسالہ "معیار الشعراء" کے نام سے نکالا تھا جس میں مختلف شعرا کی غزلیں چھپتی تھیں۔ امیر نیانی مرحوم و منفور نے بھی اپنا کلام بغرض اشاعت بھیجا تھا لیکن منشی شیو زائن نے "معیار الشعراء" میں ایک عبارت شائع کر دی کہ جب تک ان کا پورا نام و نشان معلوم نہ ہو گا ان کا کلام چھپا پائیں جائے گا۔ غالب نے "معیار الشعراء" میں یہ عبارت دیکھی تو فوراً منشی شیو زائن کو لکھا کہ :-

یہ میرے دوست ہیں۔ امیر احمد ان کا نام ہے۔ اور آمیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے دی غزٹ باشندوں میں ہیں۔ اور وہاں کے پادشاہوں کے روشناس اور صاحب رہے ہیں اور اب وہ رام پور میں نواب صاحب کے پاس ہیں ان کی غزلیں تمہارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے تمہارے پاس بھیجیں۔ اور اس کے غالب کے لکھنے سے ان کا نام امیر مرحوم کا نام اور ان کا حال معلوم ہوا..... اس کو "معیار الشعراء" میں چھاپ کر ایک ویتہ

یا چارہ رتہ رام پوران کے پاس بھیج دوا اور سرنامہ پر لکھو کہ در رام پور پر دولت حضور رسیدہ سجد  
مولوی امیر احمد بٹند اور جھ کو اس کی اطلاع دو۔

شعر معاہدہ رقابتوں کے لئے خاص طور پر رسوا ہیں۔ بالخصوص جب ان کا دائرہ متعنا ہو  
ایک ہو تو ایک دوسرے کی مشرت و ناموری کے لئے کوششوں کی توقع ہی نہیں رکھنی چاہئے  
لیکن غالب کی ذات ایسی رقابتوں سے باطل بالاحتی۔ اگرچہ امیر مرحوم بھی غالب کی طر  
سرکار رام پور کے متوکل تھے لیکن غالب کو ان کی تعریف و تحسین میں قطعاً تامل نہیں ہوا  
یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ غالب کے رقعات میں دو ستوں اور متوسلوں کی امداد کی  
مثالیں بہت ملتی ہیں۔ یوسف علی خاں عزیزان کے ایک نخلص شاگرد تھے متعدد خطوط میں  
ان کے محاسن بیان کئے ہیں خود بھی باوجود قلت مدخل ان کی امداد میں دیرین نہیں فرماتے  
دوستوں کی فرمائش دوستوں کی فرمائش پوری کرنے میں وہ بڑے سرگرم تھے ان کے پاس ہر نیکو  
اور نیکم کندہ کرانے کی فرمائشیں بہت آتی تھیں خطوط میں ان فرمائشوں کی تکمیل کا ذکر  
کئی جگہ آیا ہے۔ وہی سے جوئے اور ٹوپیاں بھی دوستوں کو بھیجتے رہتے تھے۔

انکسار غالب اپنی مدح و ستائش سے بہت گھبراتے تھے ان کے دوست ابر شاگون کو  
مدح میں قصیدے لکھتے تھے۔ تو جواب میں حد درجہ کا انکسار فرماتے تھے صاحب عالم مارقم؟  
کی ایک مدحیہ نظم کے جواب میں لکھتے ہیں:-

خدا کی ہندہ نوازیں ہیں کہ مجھ تنگ آفرینش کو اپنے خا صمان باگاہ سے بھلا کھلو آسے۔ بظاہر امیر  
مقدیر میں یہ سعادت تھی (یعنی صاحب عالم کا مدحیہ قصیدہ کہ اس دیانے عام میں جیتا بچا اللہ  
اللہ انکشتی و سوغتی کو یوں بچایا اور پھر اس رتے کو پہنچا یا کبھی عرش کو اپنا شمیم قرار دیتا ہوں اور  
کبھی بہشت کو اپنا پائیں باغ تصور کرتا ہوں وہ اسطے خدا کے اور اشارہ فرمائیے گا ورنہ بندہ ضلّی  
کا دعویٰ کرنے میں مجاہد کرے گا۔

قاضی عبدالجلیل بریلوی نے تعریف میں قصیدہ لکھ کر بھیجا ان کو لکھتے ہیں:-

اگر مجھے قوتِ لاطفہ پر تصرف باقی رہا ہوتا تو قصیدہ کی تعریف میں ایک قطعہ اور حضرت کی طرح میں ایک قصیدہ لکھتا۔

ایک اور خط میں قاضی صاحب ہی کو لکھتے ہیں :-

وہ رباعی جو آپ نے اس بنگ آفرینش کی طرح میں لکھی اس کا جواب بندگی سے اور کونش اور ادب تیسرے خط میں لکھتے ہیں :-

مجھے کیوں شرمندہ کیا میں اس ثنا و دعا کے قابل نہیں۔ مگر چھوٹا کاشیوہ ہے ربوں کو اچھا کہنا اس طرح گسٹری کے عوض میں ادب بجا لاتا ہوں :-

تفتہ نے یکجا نہ روزگارِ استادا کی طرح میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے جواب میں فاتحہ میں حضرت اس قصیدہ کی جتنی تعریف کر دیں کم ہے۔ کیا کیا شعر نکلے ہیں لیکن اندس کر بے محل اور بے جا ہیں اس طرح اور اس مدوح کا بعینہ وہ حال ہے کہ ایک نر بلبل پر سیب کا یا بی کا درخت لگ جائے خدا تمہیں سلامت رکھے۔ دکان بے مدق کے خرید لہو۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں :-

میرزا تفتہ کیا کہنا ہے نہ تمیر کا پتہ ہے نہ غالب کا مدح (تفتہ) شائستہ صدرِ آفرین اور مدوح (غالب) سرزادِ ارشدِ نفیر۔

مروت | مروت کا یہ عالم تھا کہ اگرچہ آخری عمر میں بہت کمزور ہو گئے تھے اور آلامِ جسمانی کا ہجوم تھا۔ لیکن جو لوگ بلاِ وقفیت و شناسائی بھی ان کے پاس کلام بھیج دیتے تھے۔ اس کو بغیر دیکھے اور اصلاح کئے واپس نہیں فرماتے تھے۔ تکلیف کی حالت میں چھوٹوں بڑوں سب کے ساتھ یکساں کرتے تھے مثلاً جن دنوں ضعفِ دماغ اور دورانِ سر میں مبتلا تھے۔ ان دنوں جہاں عام شاگردوں کا کلام نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہاں نوابِ رام پور کے کلام کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا تھا حالانکہ وہ سرکارِ رام پور سے مستقل وظیفہ پاتے تھے ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اپنی بیچارگی کی کیفیت مکمل الاجار اور اشرف الاجار میں چھپوادی تھی۔ اور خطوں کے جواب یا اصلاح اشعار سے مجتہد

چاہی تھی لیکن لوگ بہ دستور انہیں خواہجیتھے نیز اشعار اصلاح کے لئے آتے تھے اور وہ شہزادہ ہوتے تھے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ منشی شیو مرآت سے ”دستنبیو“ کے جتنے نسخے اُمید سنگھ اندور والے کے پاس نہجوں سے زائد ہو گئے قیمت دے کر ہو گئے لیکن جب میانہ اوفاں سیاح نے کتابوں کے لئے روپے بھیجے تو بہت ناراض ہوئے فرماتے ہیں :-  
صاحب تم نے یہ پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ہیں میں نہ کتاب فروش نہ دلال یہ حرکت مجھے پسند آئی تم نے بہت بُرا کیا

نذر تبرک [شہزادہ بشیر الدین سیوری نے غالب کی تصانیف طلب کی تھیں نیز ان کی قیمت پوچھی تھی، اس وقت غالب کے پاس فارسی دیوان اور ”دستنبیو“ کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ دونوں میں بھیج دیں اور شہزادہ کو لکھا :-

حرف پریش مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت ہنجا رنوازش نیاز مندان بے لاف نہ این است سرمایہ  
نہ فرومایہ بخورم نہ سوداگر نہ نوبہ پوشم نہ کتاب فروش نہ پیرزیدہ عطا کم نہ گیرندہ ہما۔ ہرچہ آنا دکان  
شہزادگان فرستند نہ است و ہرچہ شہزادگان بہ آنا دکان بخشند بیک بیع و شراست چون دچا  
نست ہرچہ فرستادہ ام از خان است و ہرچہ بھام فرستاد از خان خواہد بود۔

کتابیں مستعار لیتے تھے | غالب نے مطالعہ کے لئے کبھی کتاب نہیں خریدی، ہمیشہ کتابیں مستعار لے کر پڑھ لیا کرتے تھے اور واپس کر دیا کرتے تھے وہ خود لکھتے ہیں :-

و دہر کر رضی الدین میثا پوری کا کلام ایک شخص بچپا ہوا لایا میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں لیکن  
حافظ [میر ہمدی مجروح کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے ”مصلح الشیخ“ مستعار  
ہنگامی تھی۔ نواب علاء الدین احمد خاں دہلی لوہارو سے فرہنگ لغات و سائر ہنگامی تھی۔ حافظ  
بلا کا تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے۔ اس کے تمام اہم اور ضروری حصے ذہن میں محفوظ رکھتے  
لے آ رہے تھے صفحہ ۱۷۷۔

تھے۔ اساتذہ کا کلام بڑی بے تکلفی کے ساتھ سندیں پیش کیا کرتے تھے۔ قاطع برہان انہوں نے محض حافظہ کی بنا پر مرتب کر دی تھی۔ اس زمانے میں برہان قاطع اور وساتیر کے سوا ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔

کتابِ نبی اکتابِ فہمی اور مطالبِ رسی کے متعلق خواجہ حالی نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شریف شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ایک رسالہ دیکھ رہے تھے جو حقائق و معارف کے قیمتی مسائل پر مشتمل تھا۔ ایک مقام سمجھ میں نہ آیا۔ اسی اثنا میں غالب آگئے۔ نواب صاحب نے وہ مقام غالب کی دکھایا۔ انہوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کی ایسی عمدہ تشریح کر دی کہ شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے بہتر بیان نہ فرما سکتے۔

شعروں کی داد کا طریق | غالب کا عام طریقہ یہ تھا کہ جب تک واقعی اچھا شعر نہ ہوتا وہ تعریف نہ کرتے بلکہ خاموش بیٹھے رہتے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اس بنا پر ان کے بعض معاصرین ان سے آزرہ رہتے تھے۔ اور ضد میں آکر ان کی شاعری پر طح طح کی مکتہ چنیاں کرتے تھے۔ غالب اگرچہ طبعاً صلح جو تھے۔ شخص کی دلاری کا انتہائی خیال رکھتے تھے۔ مگر اشعار کی داد دینے میں راہ حق بال برابر بھی انحراف گوارا نہیں کرتے تھے۔

سلامتِ طبع | وہ نہایت سلیم الطبع تھے۔ خواجہ حالی نے بال صحیح لکھا ہے کہ ان کی سلامتی طبع ہی کا اقتضا تھا کہ ابتداً متشوق سخن میں جو ناہمواری اور ٹیڑھائی نہیں بلکہ غلط راستہ اختیار کیا تھا اسے بغیر کسی ہیر اور بغیر کسی استاد کے خود بخود ترک کر کے صحیح راستے پر آگئے۔ سلامتی طبع کا اندازہ مسئلہ متنیغ نظیر خاتم النبیین سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مولانا شاہ ہمایل مہمدی اور مولانا فضل حق خیر آبادی میں بڑے رو و کد کا موضوع بن گیا تھا۔ شاہ صاحب اس بات کے قائل تھے کہ خاتم النبیین کا نظیر متنیغ بالغیر ہے بالذات نہیں مولانا فضل حق نظیر کے متنغ بالذات ہونے کے قائل تھے۔ مولانا غالب کے نہایت گہرے دوست تھے انہوں نے غالب کو بھی اس بحث میں لپیٹ لیا اور ان کے جبراً ایک مثنوی لکھوائی جو غالب کے فارسی کلیات میں موجود ہے۔ غالب کی عمر اس وقت زیادہ

سے زیادہ چھپیں تائیں برس کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے اور شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی ۱۸۲۳ء میں جہاد کے لئے دہلی سے روانہ ہو چکے تھے۔ مولانا فضل حق نے اپنا نقطہ نگاہ مع دلائل چھی طرح غالب کے ذہن نشین کر دیا تھا۔ لیکن غالب اس مضمون کو نظم کرنے لگے تو قدرت باری تعالیٰ پر کوئی پابندی عائد کرنے کی صورت ان کے ذہن میں نہ آ سکی۔ لہذا انہوں نے یہ پہلو اختیار کیا کہ اس عالم میں تو خاتم النبیین کا نظیر پیدا نہیں ہو سکتا ہاں اللہ تعالیٰ دوسرے جہان پیدا کر سکتا ہے۔ اور ان جہانوں میں نئے خاتم بنا سکتا ہے۔

یک حق تہست یک خاتم نبیؐ      قدرت حق را نہ یک عالم است

خدا ہزار ہر ذرہ آرد عالمی      ہم بود ہر علی را خاتمے

ہر کجا ہنگامہ عالم بود      رحمۃ اللعالمین سے ہم بود

کثرت ابداع عالم خوب      یا بیک عالم دو خاتم خوب

مولانا کو یہ استدلال پسند نہ آیا۔ اور کہا کہ اس حصے کو مثنوی سے نکال دو اور لکھو کہ کتنے ہی عالم

پیدا ہو جائیں۔ خاتم ایک ہی رہے گا۔ غالب نے امثال امر کے طور پر لکھ دیا ہے۔

غالب این اندیشہ نہ پذیریم      خورده ہم بر خویش سے گیم

نشا ایجا دہر عالم کیست      گرد و صد عالم بود خاتم کیست

یہ غالب کی سلامتی طبع کا کرشمہ تھا کہ اصل مضمون میں استدلال کی جو خامیاں تھیں ان پر وہ

بھڑھنے سکے۔ اگرچہ مثنوی ایک عزیز دوست کی فرمائش پر ایک خاص مقصد کے لئے لکھی گئی تھی۔

غلطی کا اقرار۔ غالب اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس کے اعتراف میں ہرگز تامل نہیں کرتے

تھے۔ مثلاً قاطع برہان میں انہوں نے "افسوس" کو عربی الاصل مانا جو ڈاکٹر آصف قرادیا تھا لیکن جب

ان پر غلطی واضح ہو گئی تو فوراً اس سے رجوع کر لیا۔ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

"افسوس" کو میں نے عربی جانا۔ عربی نہیں ہے اب مانا کہ یہ ایک سہو طبیعت تھا۔

نامہ غالب میں میرزا رحیم بیگ کو لکھتے ہیں :-

آویزہ و افسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور پیرا دوست میاں  
داؤد خاں دیلج (ٹٹرسا) ہے۔

غالب کی مثنوی درودوں میں ایک شعر تھا کہ

خوک شد و پنچہ زون ساز کرد

باسرور و عسیدہ آغاز کرد

گل محمد خاں ناظمی کارنی کے پاس کلیات کا نسخہ پہنچا اور انہوں نے مثنوی دیکھی تو لکھا کہ خوک کے سہم ہوتا ہے  
پنچہ نہیں ہوتا۔ اگر سہم و پنچہ کا اطلاق ایک محل پر شعرا کے نزدیک جائز ہے تو ظاہر فرمایا جائے۔ غالب  
اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

راست سے گویم ویزواں نہ پسند و جز راست حرف ناراست سرودن روش اہرست

بہ تیزی دم و ذوق و بہ فروغ گوہر حیدر کرار سو گند کہ ہست پائے خوک در نظر بنودہ است۔ اگر طبع

آفرینش را در ویرانہ و خرابہ باب یار دیدہ ام۔ اما شوق گہی بہ کار تبرہ اسم گمان من این بود کہ خوک ہم

سگ و گریہ پائے دار و اکنوں از روئے نوشتہ شاد در نظر جلوه کرد کہ خوک سہم دار و پنچہ دار و کاش

شامش ازاں کہ کلیات نقش اطلال پذیر و بمن رسیدے۔

کون اس تبہ تکلفی کے ساتھ اپنی غلطی یا کسی خاص معاملے کے متعلق اپنی بے خبری کا  
اعتراف کرتا ہے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ فارسی محاتیب غالب نے خود جمع کر کے چھپوا  
تھے وہ چاہتے تو آسانی کے ساتھ اس خط کو حذف کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اسے بچینے

چھپوایا بھلیا تھے دوسرے ایڈیشن میں یہ شعر بدل کر یوں بنا دیا گیا کہ

خوک شد و بد نفسی ساز کرد

باسرور و عسیدہ آغاز کرد

اصلاح قبول کر لی | خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ ایک قصیدہ کا پہلا مصرعہ یہ تھا کہ -

کلیات شرف غالب صفحہ ۲۴۵۔

عید اٹھنے پہ سر آغا ز زمستان آمد  
نواب مصطفیٰ خاں شیفہ کے کہنے پر عید اٹھنے کی جگہ عید قربان بنا دیا۔  
ایک اور قصیدہ کا ایک شعر یہ تھا

ہم چاہاں در تن غیب نمودے دارند

بہ وجودے کہ ندارند ز خارج عیاں

مولانا فضل حق خیر آبادی کے کہنے پر نمودے کی جگہ نہوتے بنا دیا۔

اعترافات کے دیکھنے کا | غالب کی اعترافات کا خوف بھی بہت تھا۔ اور اعترافات کے دیکھنے کا شوق  
شوقِ ادراکِ خوف بھی بے حد تھا۔ دستنبی میں انہوں نے غاص فارسی لکھنے کا التزام کیا تھا۔

اور عربی کا ایک لفظ بھی نہیں آئے دیا تھا لیکن ایک جگہ نہیب کا لفظ لکھ گئے۔ مسودہ چھپنے  
کے لئے اگرہ بھیج دیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ نہیب عربی ہے تو اس کی جگہ "نوا" بنانے کے لئے  
انہوں نے نقتہ اور نشی بنو راقن وغیرہ کو متعدد اضطراب آمیز خط لکھے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

نہیب لفظ عربی ہے۔ اگرہ جائے گا تو کچھ پر اعتراض کریں گے نیز چاقوی نوک سے نہیب

لفظ چھیدا جائے اور اسی جگہ نو لکھ دیا جائے۔

اودھ اخبار میں انہوں نے دیکھا تھا کہ ایک صاحب نے غلام امام شہید کے کلام پر عرض  
کیا ہے۔ اور شہید کے شاگرد وضع نے اس کا جواب یا ہونشی حبیب اللہ خاں دتھا جہ آبادی کو  
لکھتے ہیں:-

آپ کے اس ردود کی تفصیل اور جواب و اعتراض و عرض کے نام کا طالع ہوں۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب اخبار بالا تہیاب پڑھا کرتے تھے۔

غلامت محمد دو گز | جن اشخاص کی فارسی دانی میں غالب کو کلام تھا۔ ان کے خلاف رقعات میں

جاکجا سخت الفاظ ملتے ہیں۔ مثلاً قتیل۔ عبدالواسع ہاشمی، ملا غیاث الدین رام پوری صاحب  
غیاث اللغات۔ ملا نور الدین واقف بٹالوی۔ ان کے خلاف درشت گوئی کی وجہ معلوم ہوتی ہے



کراول جن لوگوں نے کلکتہ میں غالب کے کلام پر غلط اعتراضات کو کے ہنگامہ بپا کیا تھا وہ سب اپنی اشخاص کے متفقہ تھے اور انہی کی سندیں پیش کرتے تھے۔ حالانکہ غالب ان لوگوں کو شائبہ اتقنا نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے قاطع برہان کے سلسلے میں جو ہنگامہ بپا ہوا تھا اس میں بھی غالب کے مخالفین کا مرجع زیادہ تر یہی اشخاص تھے لیکن عام طور پر مخالفین کے باب میں غالب کا مسلک عفو و درگزر تھا سیف الحق سیاح کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بڑوہ نے غالب کے خلاف برصغیر الفاظ استعمال کئے تھے۔ سیاح نے غالب کو اطلاع دی۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

قاضی صاحب بڑوہ کو معاف رکھو۔ اگر کوئی وجہ اپنے پران کے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرنا اور اپنا گناہ معاف کروانا جب سبب ملال کا نظر نہیں تو میں کیا کروں۔ تم برائے مانو۔ کس واسطے کہ اگر میں برابریوں تو اس نے سچ کہا۔ اور اگر میں اچھا ہوں تو اس نے بڑا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کر دو۔

غالب برائے مان جو دشمن بڑا کہے

ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جے

جو لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے ان کی بازو دیکھا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس بات کو گوارا نہیں فرماتے تھے کہ کسی کا آنا ان کے ذمے رہ جائے۔

نواب مصطفیٰ خاں نے غالب کی قید کے زمانے میں بڑی مدد کی تھی جس کا اعتراف انہوں نے خود اپنے ”جسیرہ“ میں کیا ہے۔ غدریں نواب صاحب پرائیڈ آف ان اور وہ قید ہو گئے۔ غالب کو جب ان کی رہائی کی اطلاع ملی تو ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ پہنچے اور نواب صاحب سے مل کر مطمئن ہوئے۔

تاریخ کے مادوں سے نفرت | غالب نظم و نشر کے بادشاہ تھے اصناف نظم و شعر میں سے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس میں ان کے فکر و خیال کی بہتر سے بہتر نگاریاں موجود نہیں۔ غزل، مثنوی، قصیدہ،

رباعی قطعہ، نوحہ اشرفیہ، علمی مباحث، قدرتی مناظروں، تاریخ، تقریظ و تنقید سب کچھ موجود  
لیکن تاریخ کے مادے تلاش کرنے سے وہ ہمیشہ پیچھے تھے۔ ان کے نہایت عزیز دوست  
منشی بنی بخش حقیر کا انتقال ہو گیا، تفتہ نے تاریخ وفات کے لئے اصرار کیا جو اب میں لکھتے ہیں۔

میں تاریخ کو دوں مرتبہ شاعری جانتا ہوں اور ہماری طرح میرا یہ بھی عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ

وفات لکھنے سے اداسے حق محبت ہوتا ہے۔ بہر حال میں نے منشی بنی بخش مرحوم کی تاریخ

رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا منشی قوالدین مادے اپنے کیا قطعہ یہ ہے۔

منشی بنی بخش کہ با حسن خلق داشت مذاق سخن و غم تیز

سال و فائش ز پئے یادگار بادل نوار و مژدہ و جلد رہنہ

خواسم از غالب آشفته سر گفت مدہ طول و بکور ستیز

سیاح کو لکھتے ہیں :-

بھائی ہمارے جان کی قسم اور اپنے ایمان کی قسم میں فن تاریخ گوئی اور معاشے بنگا نہ بخش

ہوں۔ آرد وہ زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی ستارسی دیوان میں دو چارتا یکنیں

ہیں ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اور کما ہے اشعار میرے ہیں تم سمجھ کر میں کیا کہتا ہوں حساب

سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں

ابک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ ڈھونڈ دیتے تھے موزوں میں کہ تا

اس کے بعد اپنی چند تاریخیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ ان کے قلمیہ اور تخریج کس درجہ

خندہ آور ہیں۔

نواب علامہ الدین خاں کے صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے تاریخ وفات

کے لئے لکھا اس کے جواب میں بھی غالب نے یہی عند پیش کیا کہ میرے مادہ اے تاریخ بیشتر لکھنا

کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے کلیات میں تاریخ کے متعدد قطعات موجود ہیں اور

بعض ایسے قطعات بھی ہیں جو کلیات میں شامل نہیں ہوئے۔

مردوں میں مرثیہ کی فرمائش خواجہ آجائی نے لکھا ہے کہ ایک تہہ غالب اردو زبان میں میرزا میں وغیرہ کے انداز پر مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ غالب نے تین بند لکھے اس کے بعد معذرت کر دی کہ مجھے اس میدان میں مشاقتی کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ایک عمر چاہئے۔

فرمائی اشعار | غالب دو سنتوں کی فرمائش پر بھی شعر کہہ دیا کرتے تھے اور ہر قسم کے فراموشی اشعار فرمائش کنندہ کے حوالے کر دیا کرتے تھے اپنے نام سے منسوب نہیں کرتے تھے تفتہ کو لکھتے ہیں

ایک میرادوست اور تمام اہل دروہے اس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بٹا کر لیا تھا۔ اشعار

انہیں برس کی عمر، قوم کا کھتری خوبصورت و ضعیف اور جوان ۱۲۷۶ھ میں سیار ٹھہر گیا۔ اب اس کا

باب مجھ سے آزد کرتا ہے کہ ایک تاریخ اس کے مرنے کی لکھوں ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ

مرثیہ ہو تاکہ وہ اس کو بڑھ پڑھ کر دیا کہے سو بھائی اس سال کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکر شعر تیرے

مہذابہ واقعہ ہمارے حسب حال ہے تفتہ کا بیٹا مرچکا تھا جس کی وفات پر ڈھائی تین سو شعر

کا مرثیہ لکھا تھا وہ ان کے مطبوعہ فارسی دیوان میں موجود ہے جو پنجپاں شعر تم غالو گے مجھ سے

کہاں غلیں گے۔ یہ طریق ثنوی ہیں میں شعر لکھ دو۔ مصرعہ آخر میں مادہ تاریخ ڈال دو نام اہل برج

تھا اور اس کو بابو بابو کہتے تھے چنانچہ میں ہرج مسدس بخون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں..... ۵

برم چوں نام بابو برج موہن

چکد خون دل ریش ازل بھن

معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ نے اُستاد کے حکم کی تعمیل میں کچھ اور پرانسی شعر کا مرثیہ لکھ بھیجا تھا لیکن غالب نے خود ہی باتیں شعر کہہ کر فرمائش پوری کر دی اور تفتہ کو لکھ دیا کہ اپنے اشعار کسی اور کو دے دو تفتہ نے لکھا کہ میرے اشعار میں سے کیوں ایک شعر بھی نہ لیا۔ کیا وہ اشعار تقسیم تھے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

وہ شعر سب دست و گریباں تھے۔ ایک کو ایک ربط ایک۔ یاد و شعر اس میں سے کیوں کر

لئے جاتے۔ اشعار سب میرے ہند۔ بے ستم۔ بے عیب۔



اس تدبیر سے غالب آئندہ کے لئے اس ناخوشگوار شقت سے محفوظ ہو گئے۔  
میلر برہم علی خاں سورتی نے شجرہ منکوم اصلاح کے لئے بھیجنے کی خواہش ظاہر کی تھی  
اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

میرے قبائلیہ و کنبہ واسطے خدا کے شجرہ منکومہ ارسال فرمائیے تاکہ اس کی اصلاح میری مدد سے

سے باہر ہے۔ یہ میرا شیوہ نہیں۔

ذائق طباعت | غالب کا ذائق طباعت بہت اعلیٰ تھا۔ لیکن اس کا فیصلی ذکر و ستنبہ اور بعض  
دوسری تصانیف کی طباعت کے سلسلے میں آجائے گا یہاں اسے مکرر زیر بحث لانا غیر  
ضروری ہے۔

ہجو | خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ غالب نے کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ یا قصیدہ نہیں لکھا۔ ہجو  
ایک قطعہ ان کے فلمی مسودات میں دستیاب ہوا ہے جو مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں اس کے  
دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے ایک امیر کی مدح میں ایک فارسی قصیدہ مع عرضداشت  
ارسال کیا تھا۔ اس کا جواب مدت دراز تک نہ ملا تو تقاضے کے طور پر یہ قطعہ بھیجا جس کو مشکل  
ہجو بیچ کہا جاسکتا ہے۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ قطعہ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کی خدمت  
میں بھیجا گیا تھا۔ لیکن خواجہ حالی کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ غالب نے کبھی کسی کی ہجو میں کوئی قطعہ  
نہیں لکھا۔ ان کے فارسی کلیات نظم میں کم و بیش چار قطعے ایسے ضرور موجود ہیں جنہیں  
بہر حال ہجو ہی کے ماتحت لانا پڑے گا۔ البتہ یہ درست ہے۔ ان کی ہجو سودا یا انشایا فارسی  
کے بعض ہجو گوشتوں کی طرح سرقیت اور فضل سے لوٹا نہیں ہوتی تھی۔

تقریظ نگاری | خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ غالب پر تقریظوں کی بے انتہا فرمائشیں ہوتی تھیں اور وہ  
اجاب کی دلداری کی خاطر عمدہ ان کی فرمائشوں کو پورا کرتے تھے۔ لیکن تقریظ نگاری میں ہجو نے

یہ قطعہ سب صحت میں موجود ہے اور سب صحت میں غالب کی زندگی میں چھپ گئی تھی معلوم نہیں خواجہ مرحوم نے اسے

قلمی کس بنا پر فرمایا۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔

ایسا طریقہ اختیار کیا تھا کہ کوئی بات راستی کے خلاف نہ ہو نیز صاحب کتاب خوش ہو جائے  
مثلاً تقریظ کا زیادہ حصہ تمہید میں یا مصنف کی ذات، اس کے اخلاق، یا اس کی محبت اور  
دوستی کے بیان میں صرف کر دیتے تھے۔ کتاب کی نسبت صرف چند جملے لکھتے تھے جو صلیت  
سے خالی نہ ہوں۔

غالب خود اپنی روش کی نسبت تفتہ کر لکھتے ہیں :-

وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ باطل بھاٹوں کی طرح بکنا  
شروع کر دیں۔ میرے فیصدے دیکھو تہنیتی کے شہرت پاؤ گے۔ مدح کے شکر کمتر نثر میں بھی  
یہی حال ہے۔ مضافاتِ خاں کے تذکرہ نگاروں کی تقریظ بلا خطہ کروان کی مدح کتنی ہے  
میرزا رحیم الدین بہادر جی شخص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی موجب  
فرمائش جان جا کوپ بہادر کے لکھی ہے اس کو دیکھو۔ کو نقطہ ایک بیت میں ان کا نام دیوان کی  
مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔

تفتہ نے اپنے دیوان کی تقریظ کے مدحیہ الفاظ کی قلت کا شکوہ کیا تھا۔ محوہ بالا بحث کے  
بعد غالب فرماتے ہیں :-

واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھنا۔ تو اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمہاری  
مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر چہ چاہتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے تھے۔ مگر تمہاری خاطر ایک  
فقہہ تمہارے نام کا بلی کر اس کے عوض ایک اور فقرہ لکھ دیا ہے اس سے زیادہ بھٹی میری خوش

آئین اکبری کی تقریظ | سر سید احمد خاں نے آئین اکبری کی تصحیح کی غلطی تو دہلی کے دوسرے مشاہیر  
کے علاوہ غالب نے بھی مثنوی میں اس کے لئے تقریظ لکھی تھی لیکن غالب اول الفضل کے  
انداز تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرے ابو الفضل کے پیش کردہ آئین کو انگریزی آئین کے مقابلے  
فرد تر جانتے تھے۔ سر سید کے ساتھ اگرچہ ان کے تعلقات بہت گہرے اور عزیزانہ تھے۔ اور

۱۰ بادشاہ غالب صفحہ ۷۰۔

ان کی ولداری بھی بذریعہ غایت متطور تھی لیکن تقریباً میں اپنے حقیقی خیالات چھپانے کے اور صاف لکھا کر سید کی ہمت بلند کئے لئے آئین الہی کی تصحیح قطعاً باعث فخر نہ تھی اور ایسے کام کی ستائش وہی کر سکتا ہے جس کا پیشہ رہا ہو۔

بن کہ آیتن ریا را دشمنم درو خاندا زده دبان خودم  
 گردیں کارش ندیکیم فرجے آن اردو کہ جو یکم فریں  
 پھر فرماتے ہیں کہ اگر آیتن کی بنا پر کتاب ستائش کی مستحق ہے تو انکھیں کھول کر دیکھو  
 حالت دیکھو اور نگریں ہی کے آیتن ملاحظہ کرو کہ انہوں نے کیسی کیسی چیزیں ایجاد کی ہیں

آتشے کرسنگت وی آوند  
ایں ہنرمندان خس چوں آوند

تا چافسون اندہ اندانان  
دو کشتی را ہیے راندوز آب

کہ دغاں کشتی بہ چوئیں بہرہ  
کہ دغاں گرد و قہاموں بہرہ

غلطیکوں بگرداند و خاں نرہ گھاوہ سب مانند خاں

از وہاں زورق بہ قمار آمد

نغمہ رابے زخمہ از ساقاؤند  
حرف چوں طائر بہ پرواز آوید

ہیں جسے مینی کہ اس انا گروہ ۱

مے زند آتش بیاہ اندر ہے      مے درخشاں باد چوں غلگہ ہے

روپہ ہند کا نذرانہ خشنودہ

کاروبار مرد و مشایخ ہیں در ہر آئین صد آئین کا ہیں

پیش این آئین کہ وارد روزگار گشته آئین دیگر تقویم پار

پھر فرماتے ہیں کہ اگر کناب کو طرز تحریر کے لحاظ سے شایانِ ستائش قرار دیا جاوے

ہر خوشی را خوشتر ہم بودہ است  
گر میر بہشت فخر ہم بودہ است

بید آفیاض را بشمار نیل  
نوز می ریزد و طربان نیل

مردہ پر درون ہمال گاہیت خود بگو کال نیز خرقہ گناہ

یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ غائب کی یہ رائے صحیح تھی یا غلط اور اسے علی الاطلاق درست ماننا چاہئے یا اس میں تراش خراش کرنی چاہئے لیکن ایک حقیقت ظاہر ہے کہ غائب کے فکر و نظر کا اسلوب عام لوگوں سے الگ تھا۔ وہ شخصیت پرست نہ تھے بلکہ ناموں سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ ہر شے کی افادہ حیثیت کا مستقبلاً اندازہ کرتے تھے اور اندازہ کے بعد اس کی اچھائی یا برائی کا حکم لگاتے تھے۔ سرسید کے خاندان کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ بلکہ رشتہ داری بھی تھی لیکن ان تعلقات کی بنا پر انہوں نے اپنے دل کی بات صاف صاف اور بلا تعلف کہنے میں تامل نہیں کیا۔ سرسید نے اس تلخ تقریب کو شامل کتاب نہ کیا بلکہ مشہور ہے کہ اسی بنا پر سرسید اور غائب کے دیرینہ تعلقات بکدر ہو گئے تھے جو رام پور کے پہلے سفر سے واپسی پر مراد آباد کی ملاقات میں از سر نو درست ہوئے جہاں سرسید اس زمانے میں یہ طور صد الصدور مامور تھے۔

سردیوں میں سوپ | ان کی روزانہ زندگی کے متعلق تفصیلی حالات معلوم نہیں ہو سکے مگر تیس سے ظاہر گریوں میں ٹٹی۔ ہوتا ہے کہ وہ کم از کم ایک وقت کا کھانا لازماً گھر میں کھاتے تھے ان کے متعدد خطوں میں ان کا ذکر ہے سردیوں میں دھوپ میں بیٹھتے تھے۔ گرمیوں میں خن کی ٹٹی لگاتے تھے مثلاً ایک خط میں جو جاڑے کے موسم میں لکھا گیا تھا فرماتے ہیں:-

دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یہ سب علی خاں ولالہ میرا سنگھ بیٹھے ہیں کھانا تیار ہے۔ خط لکھ کر بند کر کے آدمی کو دوں گا۔ اور میں گھر جاؤں گا۔ دلوں ایک دالان میں دھوپ آتی ہے اس میں بیٹھوں گا۔ ہاتھ تھنہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ دوسرے خط میں جو گرمیوں کے آغاز کا لکھا ہوا ہے فرماتے ہیں:-

کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آ رہی ہے۔ پانی کا جھروا ہوا ہے۔

حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔



آگ تاپنا سر دیوں میں آگ بہت تاپتے تھے۔ چنانچہ کسی جگہ اس کا بھی ذکر موجود ہے مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں :-

ہمارے پاس شرب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو نری انکھی پر گزارا ہے۔ بونل گلاس موقوف۔

قصص کاٹنے کے مطابق کاٹوق معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو قصوں کی کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا صاحب عالم مارہروی نے انہیں مارہرو بلانے کی بہت کوششیں کی تھیں۔ ایک مرتبہ آموں کا لالچ دیا۔ ایک مرتبہ لکھا کہ مارہرو تشریف لائیں گے تو بوستان خیال پڑھیں گے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ بھڑ میں اتنی طاقت پرواز کماں کہ بلا سے اگر بھینس جانوں دام پر کر کے دانہ زمین سے اٹھا لاؤں۔ میر مہدی خجرج کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں بہت خوش ہیں۔ بچاس ساٹھ جری کتاب میر خضرہ کی دہنا کی اور اس قدر جم کی ایک جلد بوستان خیال کی اچھے آگئی ہے۔ سترہ بتیں بادشاہ کی ڈنگ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں رات بھر شرب پیاتے ہیں۔

کسے کا میں مراد میں سر بود

اگر ہم نہ باشد سکندر بود

غذا خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ غالب کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی وہ ایک وقت بھی بغیر گوشت کے نہیں رہ سکتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلسل کے دن بھی انہوں نے کھجڑی یا شوکھی استعمال نہیں کیا۔ آخری عمر میں ان کی خوراک بہت کم رہ گئی تھی جب وہ چلنے پھرنے سے بڑھی حد تک عاری ہو چکے تھے تو گھر سے ان کے لئے دن کو جو کھانا آتا تھا اس میں خواجہ حالی کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل چیزیں ہوتی تھیں :-

(۱) پاؤں سیر گوشت کا قورمہ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا۔

(۲) ایک پیالے میں پھلکے کا چھلکا شوربے میں ڈوبا ہوا۔

(۳) ایک پیالے میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی۔

(۴) ایک پیالے میں دو تین پیسہ بھر دی۔

شام کو کسی قدر شامی کباب یا سب کے کباب۔

غائب خود و ممبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں اپنی غذا کے متعلق فرماتے ہیں:-

صبح کو سات بادام کا شیرہ قند کے شربت کے ساتھ وہ پیر کو سیر پھر گوشت کا کاٹھا پانی،  
قریب شام کے کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے پانچ روپے بھر شراب خانہ  
اور اسی قدر عرق شیر۔

و ممبر ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:-

غذا بہ اعتبار دو برج مفقود یعنی کو بان سات بادام کا شیرہ۔ بارہ بجے آب گوشت  
شام کو چار تلے ہوئے کباب یا سب آگے خدا کا نام۔

ناؤ نوش | شراب کے متعلق کچھ عرض کرنا یا کوئی عذر پیش کرنا بالکل فضول ہے۔ یہ علت ابتدائے  
شباب سے ان کی زندگی کا لاینفک جڑ بن چکی تھی اور آخر دم تک رہ چھٹی۔ ان کے خلوص سے  
معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر ولایتی شراب پیتے تھے جس کا نام ان کی اصطلاح میں "فرنج" تھا۔  
غدر کے بعد ولایتی شراب بہت گراں ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ بابو گوہر ہمائے سے کاس شیلین اور  
اولڈ نام کا فرنج پوچھتے آئے۔

ایک خط میں فرماتے ہیں:-

لیکھو ایک انگریزی شراب ہوتی ہے توام کی بہت لطیف اور نگہت کی بہت خوب اور  
طعم کی ایسی میٹھی جیسا قدر کا توام تھلا۔ لیکن اس لہنت کے معنی کسی فرنگ میں ہو تو۔

خواجہ عالمی لکھتے ہیں کہ شراب سونے وقت پیتے تھے۔ جو مقدار مقرر کر لی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے جس کبس میں بوتلیں بنتی تھیں۔ اس کی کچی داروغہ کے حوالے تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر عالم سرخوشی میں زیادہ پینے کا خیال ہو تو کچی نہ دینا۔

نواب سر امیر الدین احمد خاں فرما کر واسے داروغے سے معلوم ہوا کہ بوتلیں ان کے پاس دھری رہتی تھیں۔ نواب صاحب مدوح اس زمانے میں کم سن تھے۔ اور اکثر غالب کے پاس جایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے۔ والدہ محترمہ نے سخت تاکید کر رکھی تھی کہ غالب کی بوتلوں کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ شراب کی بوتلوں کے علاوہ کہیں باوام بھی ایک دو بوتلوں میں بھرے رہتے تھے جنہیں گزرک کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

غالب شراب میں عرق شیر یا گلاب ملا کر پیتے تھے وہ خود ایک غزل کے مطلع میں کہتے ہیں

آسودہ بادو خاطر غالب کہ حقے پوست

ہم میخنن بہ بادہ صافی گلاب را

سے نوشی کا التوا | یہ نہیں کہا جاسکتا کہ غالب روزانہ شراب پیتے تھے یا کبھی کبھی بغیر پئے بھی گزرا کر لیتے تھے۔ ممکن ہے غدر کے بعد نشن کی بندش کے زمانے میں بھی انہیں کسی وقت شراب نہ ملی ہو۔ خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے ۲۲ جولائی سے لے کر ۱۰ ارجولائی تک شراب کلیتہً ملتوی رکھی تھی۔ اس کی وجہ وہ خود بیان فرماتے ہیں :-

انکم یکس جدا، چو کیدار جدا، سود جدا، سول جدا، بی بی جدا، ایکچے جدا، شاگردیشہ جدا، آمد

بہی ایک سو باسٹھ تنگ آگیا، گزرا نکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا، سوچا کہ کیا کرے

کہ اس گنجائش خالوں، قرد و ریش بر جان درویش صبح کی تیرہ بیترک۔ چاشت کا گوشت آدھا

رات کی شراب گلاب سو قوت۔ ایس بائیس روپے مینا بچاؤ ترمرہ کا خچ چلایا۔ یاروں نے

پوچھا تیرہ و شراب کب تک نہ پیو گے۔ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا نہ پیو گے تو

کس طرح جو گئے۔ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے بارے میں پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پو سے علاوہ وجہ معذرتی کے روپہ آگیا۔ قرض تحفظ ادا ہو گیا۔ بہت فتنہ رانا خیر ہو صبح کی تہذیب رات کی شرب جاری ہو گئی۔ مگر شہ پورا آئے لگا۔ چونکہ بھائی (ذواب امین الدین احمد خاں رئیس لارو) نے وجہ موافقی و بجا کی پوچھی تھی۔ ان کو یہ عبارت پڑھا دینا اور مزہ خاں کو بعد سلام کہنا

اے بے خبر لذت شرب ملام

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔

آموں کا شوق | میووں میں سے وہ آم کو بے حد پسند کرتے تھے۔ آموں کی تعریف میں ان کی مثنوی بھی اُردو دیوان میں ہے۔ ان کے دوست و دروڑ سے انہیں آم بہ طور تحفہ بھیجتے تھے۔ وہ خود بھی دوستوں سے آم منگاتے تھے۔ ان کے فارسی کا تیب میں سب سے پہلا خط ذواب اکبر علی خاں طباطبائی ممتزلی امام باڑہ ہو گئی کے نام ہے اس میں آم طلب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مختے شکم بندہ ام و قدرے ناتواں ہم آرائش خواں جو ہم آرائش جان خرد و دل  
خواند کہ ایں ہر دو صفت بد اندہ است۔ و اہل کلکتہ بر آند کہ قلم و انہ جو لگی بند است۔  
ایک نفل کے قطع میں فرماتے ہیں :-

ہمہ گرمیہ فرووس بہ خونت باشد

غالب آں انہ بنگالہ فراموش مباد

سیح نے بیٹی سے آم بھیجنے کا خیال ظاہر کیا تھا اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

آم مجھ کو بہت مرغوب ہیں۔ مگر سے کم عزیز نہیں۔ لیکن بیٹی اور سوت سے یہاں پہنچنے کی

کیا ضرورت؟ مالذہ کا آم یہاں ولایتی اور پونڈی کر کے مشہور ہے۔ اچھا ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے

کہ وہاں بہت اچھا ہوگا سوت سے ولی آم بھیجا محض تلف ہے، روپے کے آم اور چار

روپے محمول ڈاک۔ پھر سو میں سے شاید دس پہنچیں۔ یہاں ویسی آم اولیٰ و اقسام کے بہت

پاکیزہ اور لذت اور خوش بوار غلط سے ہیں پیروی آم بھی بہت ہیں۔ رام پور سے نواب صاحب اپنے بلخ کے آموں میں سے اکثر یہ سبیل ارمنان بھیجتے رہتے ہیں۔ اسے لو آج بریلی سے ایک ہنگی ایک دوست (قاضی عبدالحلیم) کی بھیجی ہوئی آئی۔ دو ٹوکے۔ ہر ٹوکے میں آم کلہ دار و غدنے میرے سامنے دو نو ٹوکے کھولے۔ دو سو میں سے تراسی آم اچھے نکلے ایک سو ستترہ باطل مرٹے ہوئے۔

انبہ غوری کا طریق | صاحب عالم مارہروی نے کسی سے سنا تھا کہ غالب مارہرہ اگر آم کھانے کے آرزو مند ہیں۔ انہوں نے نہ محض دعوت نامہ ہی بھیجا بلکہ لکھا کہ مارہرہ آنے کی تاریخ سے مطلع فرمائیے۔ غالب جواب میں لکھتے ہیں کسی وقت بہ طریق تمنا کہا گیا تھا۔ کہ مارہرہ جاکر آم کھاؤں مگر اب وہ دل اور طاقت کہاں سے لاؤں۔

نارمنہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا نہیں جو کہوں بین الطلین۔ اُن آخر فرزند مضم سعدی آم کھاتے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تحلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا۔ کہ پیٹ بھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔

اسی طرح میر ہمدی بحر قح اور قاضی عبدالحلیم بریلوی کے نام کے خطوں میں آموں کے ہدیہ کا ذکر ہے۔

حقہ کشی | غالب حقہ بھی پیتے تھے۔ چنانچہ دو تین جگہ ان کے خطوں میں حقہ کشی کا ذکر موجود ہے۔ ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے سفر میں بھی حقہ ساتھ تھا۔ سوار ہو کر نکلتے تھے | اگرچہ وہ عموماً تنگ دست رہے اور ان پر کشائش کا دور کبھی نہ آیا لیکن وضع داری کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ سوار ہو کر نکلتے تھے۔ غدر کے بعد جب ان کی نشن بند تھی اور بے مقصدوری انتہا کو پہنچی ہوئی تھی تو اس زمانے میں بھی سواری کا سلسلہ بدستور قائم

تھا۔ مثلاً کشتہ دہلی کی خواہش کے مطابق دستبنو کے نسخے ان کے پاس لے کر گئے تھے۔  
تو سواری میں گئے تھے۔ چنانچہ خود میر خراج کے نام کے خط میں صاحب کے ملاقات کی کیفیت  
بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

میں نے کہا کہ میں حاضر ہوں۔ کہا منشی جیون لال کو دے جاؤ۔ وہ (صاحب) ادھر سوار  
ہو گئے ہیں ادھر سوار ہو کر اپنے مکان پر آیا۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

مصیبت عظیم یہ ہے کہ قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈنگی کے کنوئیں ایک قلم کھاری ہوئے  
خیر کھاری ہی پانی پیٹے۔ گرم پانی غلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت  
کرنے گیا تھا۔

اگر ان کے پاس سواری نہیں ہوتی تھی تو کسی بے تکلف دوست کے ہاں سے <sup>لے</sup> منگوا  
تھے۔ مثلاً ایک موقع پر نواب حسام الدین حیدر خاں کے ہاں سے منیس منگائی تھی۔

قلعہ میں جانے کا وقت | قلعہ میں بھی سوار ہو کر جاتے تھے۔ صبح جا کر پہرہ چڑھے واپس آ جاتے  
تھے۔ ان کے جانے کے بعد دو چار آدمی مکان پر رہتے تھے۔ ایک صاحب غالباً بریلی  
ملنے گئے تھے۔ لیکن ان کی آمد کے وقت غالب مکان پر موجود نہ تھے بعد میں انہیں معلوم  
ہوا تو نہ مل سکے۔ پرائس اور معذرت کا خط قاضی عبدالجلیل بریلوی کو بھیجا اس میں لکھتے ہیں:-

صبح کو میں ہر روز قلعہ کو جاتا ہوں۔ ظاہر مولوی صاحب اول روز آئے ہوں گے جب سوار  
ہو جاتا ہوں جب بھی دو چار آدمی مکان پر ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب بیٹھتے۔ حقہ پیٹے۔ اگر قلعہ  
جانا ہوں تو پہرہ چڑھے آتا ہوں۔

نصفے خود بناتے تھے | غالب خطوں کے لفافے اپنے ہاتھ سے بنایا کرتے۔ تھے منشی شہباز  
کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے سمجھا کہ شاید ان میں لفافے خریدنے کی استطاعت نہیں

اور لکھا کہ میں لفافے بھجواتا ہوں اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔  
یہ ہر حال جب لفافے پہنچ جائیں گے ہم آپ کا شکریہ بجالائیں گے۔

لفافے پہنچے۔ سعادت مند شاگرد نے غالب کی سہولت کے لئے لفافوں ”پرز مقام“  
اور ”مقام“ ”تاریخ“ ”ماہ“ وغیرہ بھی چھپوا دیئے تھے لیکن غالب اس قسم کی چیزوں کو پسند نہیں فرماتے  
تھے انہوں نے لفافے دوستوں میں بانٹ دیئے مینٹی شونز ان نے دوبارہ ایک پکیٹ  
بھیجا۔ غالب نے پکیٹ واپس کر دیا اور لکھا :-

بھائی میں اپنے خراج سے لاجام ہوں۔ یہ لفافے از مقام دور مقام و تاریخ و ماہ مجھ کو پسند نہیں  
آئیں گے۔ جو تم نے بھیجے تھے وہ بھی میں نے دوستوں میں بانٹ دیئے اب یہ لفافوں کا لفافہ  
اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کی عوض وہ لفافے جو از مقام اور دور مقام سے خالی ہیں جن میں  
تم نے ہنپے خط بھیجا کرتے ہو مجھ کو بھیج دو اور یہ لفافے اس کے عوض مجھ سے لے لو۔ اگر اس طرح  
کے لفافے نہ ہوں تو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔

بیزنگ خطوط کا قاعدہ | غالب اکثر خطوط بیزنگ بھیجا کرتے تھے۔ خصوصاً اہم خطوں پر کٹ لگانا  
نورمن فی جیٹا ط تصور کرتے تھے۔ اور اپنے دوستوں سے بھی یہی کہتے تھے کہ بیزنگ خط بھیجا  
کرو۔ ایک خط میں نکتہ کو لکھتے ہیں کہ بیزنگ خط بھیجو اس لئے کہ ڈاک والے بیزنگ خط کو جلد  
پہنچاتے ہیں سیف الحق سیلج کو لکھتے ہیں :-

پڑ خط گاہ کا تعف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر کہ بیزنگ خط بھیجتا ہوں تاکہ ضائع نہ ہو  
کا احتمال تو یہ ہے۔

چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی کو لکھتے ہیں :-

ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اس کو منظور کیجے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اٹھ جائے  
اور رزبٹری کا دوسرا جاتا رہے گا آؤدہ آتا نہ سہی ایک آتا سہی۔ آپ بھی خط بیزنگ بھیجا کیجے اور

میں بھی بے رنگ بھیجا کروں بیڑا خطوط کھٹا ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے کا جیسا کہ میں واضح ہوا ہوں بادلی دشمنی کرنے والا بھی ہوا اور خطیر رنگ بھیجا۔

شہرت و ناموری کا حساس | غالب تنگ دل اور تنگ حوصلہ تھے لیکن انہیں اپنی شہرت اور ناموری کا بہت احساس تھا۔ اور ان کی یہ جیس بہت نازک تھی۔ اگر کوئی شخص ان کے مکان کا پتہ پوچھتا تھا۔ یا ان کے نام کے خط پر پتہ دینے میں زیادہ تفصیلات بیان کرتا تھا تو ان کے دل میں مٹایہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ انہیں گناہ یا کم شہر سمجھا گیا ہے۔ ان کے خطوط میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں مثلاً ایک خط میں فرماتے ہیں:-

میں گناہ آدمی ہوں مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں تلف نہیں ہوتے بعض فارسی خطوں پر مجھے کا پتہ نہیں ہوتا اور انگریزی خطوں پر تو ہوتا ہی نہیں صرف شہر کا نام ہوتا ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

میرے نام کا تلف نہ جس شہر سے چلے اسی شہر کے ڈاک گھر میں رو جاوے تو رہ جائے ورنہ قی کے ڈاکخانہ میں پہنچ کر کیا امکان ہے کہ تلف ہو۔

نواب علار الدین احمد خاں نے مکان کا پتہ پوچھا تھا انہیں فرماتے ہیں:-

قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے۔ کراس کی عزت اور نام آدمی جو میرے نزدیک ثابت و متحقق ہے۔ اور تم جانتے بھی ہو مگر جب تک اس سے قطع نظر نہ کرو۔ اور اس شخص کو گناہ و ذیل نہ بھڑکتیں چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے وہی میں رہتا ہوں۔ ہزار اخطا طرف و جواب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ مجھ سے نہیں لکھتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ مجھ سے سابق کا نام لکھ دیتے ہیں حکام کے خطوط فارسی و انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام یہ سب مراتب تمام جانتے ہو۔ اور ان خطوط کو دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو اپنا مسکن بتاؤ۔ اگر میں تمہارے نزدیک امیر نہیں ذمہ دار ہوں بلکہ صرف مجھ سے



نہیں ہوں۔ کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے۔ ہر کارہ میرا پتہ نہ پائے۔ آپ صرف  
 دلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجئے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

مذہب غالب کی تحریرات میں شیعیت کی جھلک نمایاں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی  
 شیعیت محض تفضیل تک محدود تھی۔ ان کا خاندان جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں سنی تھا۔ ان کے  
 سسرال کا سارا خاندان بھی سنی تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی شیعیت ان کی "ایرانیت" سے  
 پیدا ہوئی۔ فارسی زبان کے متعلق بھی ان کی روش وہی تھی جس پر بعد میں اہل ایران شدت  
 اور غلو کے ساتھ کاربند ہوئے یعنی عربیت سے بعد۔ اسی چیز نے غالب میں ایرانیت کے تھا  
 خاص شیعیت کی پیدا کردی تھی۔ اور غالب اسی شیعیت کی ناتیجہ یہ تھا کہ ان کے مذہبی اعتقادات بھی ایرانی  
 رنگ میں رنگے گئے۔

تصوف تصوف سے انہیں خاص مناسبت تھی وہ بقول خواجہ حالی اہل حال میں سے نہ تھے۔  
 لیکن عرفا اور صوفیاء کے کلام سے پوری طرح واقف تھے۔ اور توحید و وجودی یا بہ اصطلاح عام  
 وحدت الوجود کے قائل تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:-

یہاں لا موجود الا اللہ کے باوجود ناب کارٹل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام اور نور  
 و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔

سبجا غیر و کو غیر و کو نقش منیر

روی اللہ و اللہ فی الوجود

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:-

دریہ کے بنیوں کے ٹوٹنوں کو چڑھا کر مولیٰ مشہور ہونا اور مسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائل  
 حین و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفاء کے کلام سے حقیقت حق وحدت وجود کو اپنے دل  
 کرنا اور ہے مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں مشرک وہ ہیں  
 جو سیکلہ کو نبوت میں ختم المسلمین کا شریک گردانتے ہیں۔ مشرک وہ ہیں جو ذر مسلمان کو اولاد

کا ہمسرا نہ تھے ہیں۔ مرنے والے لوگوں کے واسطے ہے میں موعود خالص اور مومن کامل  
ہوں زبان سے لا الہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ اور لا موشرفی لا وجود الا اللہ  
سمجھے ہوئے ہوں، انبیاء سب واجب العظیم اور اپنے وقت میں سب مقرر ض الطاعت  
محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی یہ ختم المرسلین اور رحمۃ للعالمین میں مقطع نبوت کا مطلع است  
اور امامت مذا جماعی بلکہ سن اللہ ہے۔ اور امام من اللہ علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین  
مدی موعود علیہ السلام ع

بریں زیستہم ہم بریں بگزرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت و زہد قہ کو مرد و شراب کو حرام و اپنے کو عاصی  
سمجھتا ہوں اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلتا مقصود نہ ہو گا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن  
بنوں گا۔ اور دوزخ کی آگ کو تیز کر دوں گا تاکہ شرکین و منکرین نبوت مصطفوی و امامت  
مرتضوی اس میں جلیں۔

مسلمانوں سے محبت اگرچہ عمل کے اعتبار سے متقی اور پرہیزگار نہ تھے بلکہ خاص اسلامی عبادات  
کے بھی پابند نہ تھے لیکن اسلام اور مسلمین سے انہیں بدرجہ غایت محبت تھی۔ اور مسلمانوں  
کی ذرا سی دولت پر بھی تڑپ اٹھتے تھے۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ایک مرتبہ خود غالب نے کہا  
مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مجھ کو کیوں قند  
نابخ و ناسف ہوتا ہے۔

نصیب سے باطل پاک تھے اس کے باوجود حد درجہ صلح کل اور تعصب و ناروا داری سے باطل  
پاک تھے ہندوؤں مسلمانوں کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ تفتہ پاشی بھاری لال  
یا فشی شیو زائن یا ہیر سنگھ و جواہر سنگھ یا ان کے والد رائے جھیل کے ساتھ انہیں جتنی محبت  
و افست تھی۔ ان کا کوئی مسلمان شاگرد نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے ساتھ مذکورہ بالا افراد کے  
مقابلے میں زیادہ محبت کرتے تھے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں :-

میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔ اور اپنا بھائی گنتا ہوں مگر  
 مانے یا نہ مانے باقی رہی وہ عزیز داری جس کو اہل دنیا قرابت کہتے ہیں اس کو تو م اور  
 ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب و مدارج ہیں۔

لباس | لباس کے متعلق خطوط و تحریرات سے تحقیقی طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ قصا ویر سے  
 ظاہر ہوتا ہے کہ کھلا پاجامہ، لمبا چنچہ اور پوست کی کلاہ پہنتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹوپی خراب  
 ہو گئی تھی تو سر کے لئے پٹا درمی لنگی بھی منگائی تھی منشی جواہر سنگھ کو لکھتے ہیں:-

کلمے از پوست بردہ د شتم آں را کرم خود و سرم بے کلاہ ماندا اگرچہ کلمے جو ہر مالنگت منشی  
 چنا کد و ریشا و دوستان سازند و عیان آں فکر و بر سر بچندے خواہم مانگے کہ رنگمائے شوخ  
 نہ دہشہ باشد و حاشیہ تیغ نبردہ منہ ابد از مائے ناک و طراز مائے لغو دشتہ باشد و تار مائے  
 زرو سیم را در آں صرف نہ کر وہ باشند۔

پھر ایک اردو خط میں لکھتے ہیں:-

کیوں صاحب وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی بہت دن ہو جب تم نے لکھا تھا کہ  
 اسی جفتے بھجوں گا۔

جانوروں کا شوق | انہیں کہا جا سکتا کہ غالب کو جانور پالنے کا شوق تھا یا نہیں لیکن ان کے  
 گھر میں مختلف قسم کے جانور رہتے تھے۔ مثلاً طوطا تھا جس کے متعلق یادگار غالب میں ایک  
 لطیفہ بھی درج ہے کہ میاں مٹھو تم مارے نہ جو رو نہ بچے تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو۔  
 رام پور کے سفر کے دوران میں جو خط لکھے گئے ان میں سے ایک میں ذکر ہے کہ باقر علی خاں  
 اور حسین علی خاں رام پور سے مرغ لے کر ولسی اردو نہ ہوئے۔ ایک مرتبہ نواب اہل الدین احمد  
 خاں والی لاہور سے برسات کے لئے مکان مستعار مانگا تھا لیکن پھر اس میں منتقل ہونے  
 کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سلسلے میں نواب صاحب موصوف کو جو خط لکھا تھا۔ اس میں موصوف  
 کہتے ہیں: "دنبہ، بکری اور گھوڑوں کا ذکر ہے کلیات نظم فارسی میں ایک قطعہ ملی کی تعریف میں ہے۔"

دارم به جمال گریه پاکیزه نوا  
 کز یال پریاد بود مبع ریم او  
 سمرست ادا چوں به زین باز خرامد  
 از خاک و دغچه نقش متدم او  
 چوں صورت آینه انا فرام لطافت  
 آید به نظر بچه اود شکم او  
 هر شیر زیا ننه که به بینی به گلستان  
 دار و سر دیوزه غشش ز دم او  
 گر جانور سے مرده را بیند سرده است  
 از پاکی طینت نخورده سر غم او  
 هر کچه که کنج شک بوسه باز سپارد  
 در پرورش او نخورده جز قسم او  
 آری بود از غیبت انداز خرامش  
 بر کبک تذرو است اگر خود ستم او  
 رنشنده او تم فاش از لطف زبانش  
 گوئی به اثر تاب سبیل است نم او  
 جوش گل و بالیدگی موجه رنگ است  
 دم لایکس ال آمدن و مبدم او  
 در عربده چو بند ز دم باز کش آمد  
 لرز و شکن طره خواباں ز جسم او

تمامه کش صفی افلاک بود و سر

باد اکت است من و پشت شکم او



# تیرھواں باب

## تصانیف

نہ رنجم گریہ صورت او گدایانِ دہم غائب  
یہ دارالملک معنی سے کسم فرما زوہیا

متداول تصانیف | غائب کی تصانیف یہ صورت موجود حسب ذیل ہیں :-

(۱) کلیات نظم فارسی جس میں قطعات، ترکیب بند، ترجیع بند، نوحہ جات، ٹنویاں، قصائد، غزلیات اور رباعیات شامل ہیں۔

(۲) کلیات نثر فارسی جو ”سچ آہنگ“، ”مرئیر“ اور ”تنبہ پرست“ ہے۔

(۳) دیوان اردو جس کے مختلف ایڈیشن اور مختلف نسخے مروج ہیں۔

(۴) اردو کے معنی اس کے بھی مختلف ایڈیشن ملتے ہیں۔

(۵) عود ہندی جس میں نامہ ”غائب“ بھی شامل ہے۔

کیا تصانیف | جو تصانیف آج کل بہت کیا ہیں۔ اور غائب کی وفات کے بعد دوبارہ

شائع نہیں ہوئیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) ”قاطع برہان“ جو غائب کی زندگی ہی میں دوسری بار ”دش کاویانی“ کے نام چھپی تھی

(۲) ”سبد چیں“ جس میں غائب کا وہ فارسی کلام چھپا گیا تھا جو کلیات نظم فارسی کی اشعار کے بعد سے لے کر غائب کی وفات سے تھوڑی مدت پیش تک کہا گیا یا جو پہلے

کہا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے کلیات میں شامل نہیں ہو سکا تھا۔

(۳) ”تیر تیز“ جس میں ”قاطع برہان“ پر اعتراض کرنے والوں کے جوابات دئے گئے۔

(۴) نکات و رقعات غالب جس میں فارسی زبان کے چند اصولی قواعد شامل اور زبان میں بیان کئے گئے تھے اور آخر میں پانچ آہنگ کے آہنگ پنجم میں سے غالب کے ہندو فارسی مکاتیب شامل کر دیئے گئے تھے۔

(۵) مثنوی ابرگر بابہ یثمنوی یہ حالت موجودہ کلیات نظم فارسی کے حصہ مثنویات کی آخری مثنوی ہے لیکن ایک الگ نسخہ بھی کلیات نظم کی اشاعت کے بعد ۱۲۸۸ء میں چھپا تھا۔ اس میں غالب کے چند فارسی قصیدے اور قطعات وغیرہ بھی شائع ہوئے تھے جو نہ تو بعد ازاں کلیات نظم فارسی میں شامل ہو سکے اور نہ سید عین میں آئے۔ (۶) قادیان نامہ۔ اس کتاب کا ایک نسخہ جو ۱۸۷۳ء کا چھپا ہوا ہے میں نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا ہے۔ پیشتر کا دعویٰ ہے کہ یہ کتاب غالب کی تصنیف ہے لیکن مجھے اس دعویٰ کی صحت میں کلام ہے۔ یہ خالق باری کے رنگ میں پچل کے نصاب کی کتاب ہے جس میں سہولت حفظ کے لئے مترادف الفاظ نظم کئے گئے ہیں اس کا پہلا شعر یہ ہے ۵

قادر اقد اور یزدان ہے خدا  
ہے بنی مرسل ہمیں رہنا

اس کا نام قادیان نامہ غالباً اس وجہ سے رکھا گیا کہ پہلے شعر کا پہلا لفظ قادیان ہے۔ (۷) گل رعنا غالب نے اپنے عزیز دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک منتخب مجموعہ اس نام سے مرتب کیا تھا اور اس کے ویباچہ اور خاتمہ کی شریں فارسی زبان میں لکھی تھیں جو ان کے کلیات شرفا میں موجود ہیں لیکن میں جس حد تک معلوم کر سکا ہوں یہ مجموعہ کبھی شائع نہیں ہوا اور نہ اس کا کہیں سے پتہ مل سکا ہے

غالب کی اردو اور فارسی تحریرات میں اردو دیوان، کلیات نظم فارسی پانچ آہنگ اور تہذیب

کے حالات کم ملتے ہیں۔ قاطع برطان "اور دستنبو" کے حالات زیادہ ملتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ معلوم  
یہاں دیج کیا جاتا ہے۔

کلام کی فداہی معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظم و شعر خود ان کے پاس کبھی جمع نہیں ہوئی ان کے  
بعض دوستوں اور نیاز مندوں نے ان کی تحریرات کے جمع کرنے کا اہتمام کیا تھا جن میں  
سے نواب ضیاء الدین احمد خاں نیرکس لوہارو اور ذوالفقار الدین حیدر حسین مرزا خاص  
طور پر قابل ذکر ہیں۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے غدر سے قبل غالب کی سب تحریرات  
اہتمام کے ساتھ جمع کر کے ان کی ترتیف جلدیں بندھوا لی تھیں۔ لیکن پیچھے غدر میں لٹ  
سکتے۔ غالب منشی شیونان اکبر آبادی کو لکھتے ہیں:-

ضیاء الدین خاں جاگیر دار لوہارو میرے سہیلی بھائی اور میرے شاگرد رشید ہیں۔ نظم و شعر میں  
جو کچھ لکھا انہوں نے لے لیا اور جمع کیا۔ چنانچہ کلیات نظم فارسی چون پھین جو اور پنج آہنگ  
اور مرثیہ روز۔ اور دیوان ریختہ سب مل کر سو سو اسو جزو مطلقا اور مذہب اور انگریزی دہری کی  
جلدیں کوئی ڈیڑھ سو اور سو روپے کے صرف میں بنوائیں۔ میری خاطر جمع کہ میرا کلام سب کجا  
فراہم ہے۔ پھر ایک شہزادہ نے اس مجموعہ نظم و شعر کی نقل کی اب دو جگہ میرا کلام اکٹھا ہوا کہاں  
سے یہ فتنہ غدر برپا ہوا۔ اور شہر لٹے اور دونوں جگہ کا کتاب خانہ خراب ہوا گیا۔ ہر چیز میں  
آہی و وثارتے کہیں سے ان میں سے کوئی کتاب بچنے نہ آئی وہ سب قلمی ہیں۔ غرض اس  
تحریر سے یہ ہے کہ قلمی فارسی کا کلیات۔ قلمی ہندی کا کلیات۔ قلمی پنج آہنگ۔ قلمی مرثیہ  
اگر ان میں سے کوئی نسخہ بکنا ہو انظار آئے تو اس کو میرے واسطے خرید کر لینا اور مجھ کو اطلاع کرنا  
میں قیمت بھیج کر دیکھا لوں گا۔

یہ جنوری ۱۸۵۹ء کا مکتوب ہے اپریل ۱۸۵۹ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

اگر دو کے دیوان کے چھاپے ناقص ہیں بہت غزلیں اس میں نہیں ہیں قلمی دیوان جو  
اتم و اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکنا ہو انظار آئے اسے لکھ کر بھیجنا۔

بہر حال ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ:-

(۱) غالب کی تحریرات ان کے پاس جمع نہیں ہوتی تھیں۔

(۲) جو چیزیں مختلف دوستوں کے پاس بالخصوص نواب عبدالحق الدین احمد خاں کے پاس جمع تھیں۔ وہ تمام تر غزلیں لٹ گئیں۔

غدر کے بعد جو کچھ جمع کے چھا پا گیا۔ اس میں بلاشبہ انتہائی اہتمام کیا گیا ہو گا کہ کوئی چیز باہر نہ رہ جائے۔ غالب کی موجودہ شائع شدہ تحریرات میں اگرچہ کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہو کہ بعض چیزیں چھپنے سے رہ گئیں لیکن ان کا جو غیر مطبوعہ کلام نسخہ حمیدؔ کے علاوہ متفرق طور پر ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ اس کا اچھا خاصہ حصہ قطعی طور پر غدر سے پیشتر کا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ فراہم نہ ہو سکا۔ یا غالب نے اسے خود ناقابل اشاعت سمجھ کر نظر انداز کیا۔

اردو دیوان تصانیف میں سے ہم سب سے پہلے اردو دیوان کو لیتے ہیں جو غالب کی موجودہ شہرت و عظمت کا حقیقی مدار ہے۔ اگرچہ غالب اسے اپنے مہی کات کا صحیح منظر نہیں جانتے تھے بلکہ اسے باعث ننگ دیکھتے تھے۔

اپریل ۱۸۵۹ء کے جس کتب کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۵۹ء سے پیشتر غالب کا اردو دیوان ایک زیادہ مرتبہ چھپ چکا تھا غالب سید بدر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

دیوان اگر ریختہ کا منتخب کہتے ہو تو وہ اس عرصہ میں دلی اور کان پور و جگہ چھاپا گیا۔ اور تیسری جگہ اگر میں چھپ رہا ہے۔

۵ وہ خود ایک قطعہ میں ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

راست سے گویم دل از رہت سز تو اس کشید ہرچہ در گفتار فخرت آن رنگ من است  
خارسی میں تا بیٹی نقشہائے رنگ رنگ بگذرا و مجرعه زود کہ بیزنگ من است



اس خط پر تاریخ درج نہیں لیکن بعض خطوں سے جن کے اقتباسات آگے چل کر پیش کئے جائیں گے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان اردو انفروری ۱۸۶۷ء اور ۳ جون ۱۸۶۷ء کے مابین اگر وہ میں منشی شیو زائن مالک مطبع مفید خلافت کے پاس چھپنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید بدر الدین والا خط ۳ جون ۱۸۶۷ء کے بعد لکھا گیا تھا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۶۷ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ میں دیوان کی طباعت میں تاخیر ہو جانے سے غائب نے یہ سمجھا تھا کہ منشی شیو زائن دیوان چھاپنا نہیں چاہتے اور اس وجہ سے انہوں نے دلی میں دیوان چھپوایا تھا اس سے ظاہر ہے کہ سید بدر الدین والا خط جون ۱۸۶۷ء سے بعد کا اور ۱۰ جنوری ۱۸۶۷ء سے پہلے کا ہے۔

کمل دیوان کی شاعت | اپریل ۱۸۵۹ء والے خط سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ دلی اور کان پور دونوں جگہ کے چھپے ہوئے دیوان ناقص تھے۔ ان میں تمام غزلیں نہیں آئی تھیں۔ اور قلمی دیوان جو اتم و اکمل تھے وہ غدر میں لٹ گئے ۱۸۶۷ء میں کمل اردو دیوان چھاپنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کی تحریک میرٹھ کے ایک تاجر کتب عظیم الدین صاحب کی طرف سے ہوئی۔

غالب نے ۱۸۵۵ء میں اپنے اردو دیوان کا ایک نسخہ خوشخط لکھوا کر نواب سرف علی خاں کے لئے رام پور بھیج دیا تھا۔ جنوری ۱۸۶۷ء میں وہ رام پور گئے تو نواب ضیا الدین احمد خاں نے تاکید کی تھی کہ اس نسخہ کی ایک نقل لے کر بھجوا دی جائے۔ غالب نے یہ فرمائش پوری کر دی تھی رام پور کے قیام ہی کے دوران میں انہیں عظیم الدین میرٹھ کی طرف سے ایک درخواست موصول ہوئی جس میں دیوان کے چھاپنے کی اجازت طلب کی گئی تھی۔ غالب نے اس کا کچھ جواب نہ دیا جب وہ رام پور سے واپس ہوتے ہوئے میرٹھ پہنچے تو وہاں مصطفیٰ خاں شفیقہ کے مکان پر منشی بدایا علی صاحب میرٹھ عظیم الدین کے سفارشی بنے اور اصرار کیا کہ دیوان چھاپنے کے لئے دے دیا جائے۔ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شفیقہ مرحوم نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ لے لیا

غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر وہی نسخہ جو ذاب ضیاء الدین خاں کے پاس رام پور سے بھیجا تھا ذاب صاحب کے لیا اور ذاب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا۔ غلام الدین نے دیوان کا چھاپا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ اسی اثنا میں غالب کے عزیز دوست منشی شیونرائے صاحب نے اصرار شروع کر دیا کہ دیوان نہیں دیا جائے وہ خود اپنے مطبع میں اسے اہتمام کے ساتھ چھاپیں گے۔ غالب نے تقاضا کر کے دیوان غلام الدین سے واپس لیا اور اگر منشی شیونرائے کے پاس بھیج دیا۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں حسین خاں صاحب کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوایا۔

میرٹھ میں طباعت کا اہتمام غالب منشی شیونرائے کو لکھتے ہیں۔

میں رام پور میں تھا کہ ایک خط پہنچا۔ سرنامہ پر لکھا تھا عرضداشت غلام الدین احمد بن مقام میرٹھ والہ بادشاہ گریس جانتا ہوں کہ غلام الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے معلوم ہوا کہ ہندی دیوان اپنی سوداگری اور خاندانہ اٹھانے کے واسطے چھاپا چاہتے ہیں۔ میرٹھ ہوا جب میں رام پور سے میرٹھ آیا بھائی مصطفیٰ خاں صاحب کے اس آواز۔ وہاں منشی ممتاز علی صاحب میرے دوست قدیم مجھ کو لے آئیں گے کہ اپنا اردو کا دیوان مجھ کو بھیج دیجئے گا۔ غلام الدین ایک کتب فروش اس کو چھاپا چاہتا ہے۔ اب تم سنو۔ دیوان ریختہ اتم و اکمل کساں تھا۔ میں نے غدر سے پہلے لکھو کر ذاب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیج دیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رام پور جانے لگا تو بھائی ضیاء الدین نے مجھ کو تاکید کر دی تھی کہ تم ذاب صاحب کی سرکار سے دیوان لے کر اس کو کسی کا نسخہ لکھو اگر مجھ کو بھیج دینا۔ میں نے رام پور میں کا نسخہ لکھو اگر یہ سبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیج دیا تھا۔ مدد پر سرمد معائے سابق اب جو منشی ممتاز علی صاحب مجھ سے کہا۔

تو مجھے ہی کہتے بن آئی کہ اچھا دیوان تو میں ضیاء الدین احمد خاں سے لے کر بھیج دوں گا مگر کوئی کمی تصحیح کا ذمہ کون کرتا ہے؟ ذاب مصطفیٰ خاں نے کہا کہ میں، اب کہو میں کیا کرتا منشی اگر ضیاء الدین خاں سے دیوان لے کر ایک آدمی کے ہاتھ ذاب مصطفیٰ خاں کے پاس بھیج دیا

اگر میں اپنی خواہش سے چھوٹا کرتا ہوں گھر کا مطیع (یعنی مطیع منشی شیونان) چھوڑ کر پائے بھانے  
خانے میں کتاب کیوں بھجواتا۔ سچ اسی وقت میں نے تم کو خط لکھا۔ اور اسی وقت بھائی صاحب  
کو ایک خط بھیجا ہے۔ ان کو لکھا ہے کہ اگر چھاپا شروع نہ ہوا تو نہ چھاپا جائے۔ اور دیوان  
جلد بھیجا جائے مگر دیوان آگیا تو فوراً تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اگر وہاں کا پنی شروع  
ہو گئی ہے تو ناپا رہوں۔

مسودہ کی دہری پر ہر راز بہ ہر حال دیوان اور خراج یا دواں اپریل ۱۸۶۷ء میں میرٹھ بھیجا گیا ہو گا  
اس لئے کہ غالب راج ۱۸۶۷ء ہی میں رام پور سے واپس آئے تھے۔ منشی شیونان کے خط  
کے بعد غالب نے دیوان کی دہری کا تقاضا شروع کر دیا۔ ۱۱ جون ۱۸۶۷ء کے ایک خط سے  
معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دیوان واپس نہیں ملا تھا۔ وہ سیف الحق سیاح کو لکھتے ہیں :-  
دیوان کا چھاپا کیا۔ وہ شخص نا آشنا سو سوم۔ عظیم الدین جس نے مجھ سے دیوان نکال بھیجا آدمی  
نہیں ہے۔ بھوت ہے۔ پید ہے۔ غول ہے۔ قصہ مختصر سخت نامعقول ہے۔ مجھ کو اس کے طور پر  
انتباع دیوان نامطوع ہے۔ اب میں اس سے دیوان مانگتا ہوں وہ نہیں دیتا خدا کے ہاتھ  
آجائے تم بھی دعا مانگو۔

غالب کی تنک مزاجی ملاحظہ ہو کہ دیوان بہ ہر حال اور خراج یا دواں اپریل میں بھیجا  
گیا تھا چند ہی روز کے بعد واپسی کا تقاضا شروع کر دیا۔ اور ۱۱ جون تک وہ اتنے پریشان ہو گئے  
تھے کہ بیچارے عظیم الدین کو بھوت اور غول اور نامعقول کہتے ہوئے بھی مثال نہ تھے۔  
مسودہ اگر بھیجا گیا ۳۰ جون ۱۸۶۷ء کے ایک خط میں سیاح ہی کو لکھتے ہیں :-

میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ اردو کا دیوان غاصب نا انصاف سے مانگ  
آگیا۔ اور میں نے فرد چٹم منشی شید زراں کو بھیج دیا یقیناً تم سے کہ وہ چھاپیں گے۔ جہاں تم  
ہو گے ایک نسخہ تم کو پہنچ جائے گا۔

دیوان منشی شیونان کے پاس پہنچا تو انہوں نے غالباً لکھا کہ یہ تو مکمل نہیں ہے غالب فرماتے ہیں :-

میاں تھاری باتوں پر بھی آتی ہے۔ یہ دیوان جو میں نے تم کو بھیجا ہے اتم واکمل ہے۔  
وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں غزنی کے پاس ہیں اور اس دیوان  
میں نہیں۔ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر ہے۔

دہلی میں طباعت | لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے منشی شیونرائن کی طرف سے بھی دیوان کی  
طباعت میں تاخیر ہو گئی اور غالب نے دیوان دہلی میں چھپوا لیا۔ ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کے  
ایک خط میں منشی شیونرائن صاحب کو لکھتے ہیں:-

دلی میں ہندی دیوان کا چھپنا پہلے اس سے شروع ہوا ہے کہ ملکیم احسن اللہ خاں تمہارا بھیجا  
ہوا فرمائیے دیں اور وہ جو میں نے یہاں کے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی تھی سب کچھ کوئی  
منشی کر ب تمہارا ارادہ اس کے چھاپنے کا نہیں۔ خود کو دیر لٹکے چھاپے خاتمے والے محمد عظیم  
(عظیم الدین) نے کس عجز و اسحاق سے دیوان لیا تھا اور میں نے فکر تمہاری خوشی پر یہ جراس  
پھیر لیا۔ یہ کیوں کر ہو سکتا تھا کہ اور کو چھاپنے کی اجازت دوں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی شیونرائن صاحب بھی طباعت شروع کر چکے تھے۔ یہ نہیں  
کہا جاسکتا کہ انہوں نے چھاپا مکمل کیا یا نہیں کیا۔

اس باب میں ایک عجیب امر یہ ہے کہ جب اس نسخہ کے سوا جو غالب نے رام پور سے  
نقل کرا کے ذاب ضیاء الدین خاں کے پاس بھیجا تھا۔ دیوان کا اور کوئی نسخہ موجود نہیں تھا  
پہلی نسخہ ذاب صاحب سے مستعار لے کر میرٹھ ارسال کر دیا تھا بعد ازاں اسی کو واپس لوٹا کر اگر بھیج دیا  
تھا تو دلی والے مطبع میں کون سا نسخہ چھپا؟ یہ معلوم ہے کہ غالب نے منشی شیونرائن کو بھیجا ہوا نسخہ  
واپس نہیں لیا تھا۔ بلکہ اسے منشی صاحب ہی کے پاس رہنے دیا تھا۔ تو کیا دلی والے مطبع کے  
لئے رام پور کے نسخہ کی دوبارہ نقل چال کی گئی تھی یا نسخہ کو منشی شیونرائن کے پاس بھیجنے سے  
قبل اس کی کوئی نقل رکھ لی گئی تھی یا عدد کے گم شدہ نسخوں میں سے کوئی نسخہ لے لیا تھا؟

غالب کی تحریرات میں مجھے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔  
 دیوان کا ناقص چھاپا وقت | دلی میں جو دیوان چھپا تھا۔ اس کا چھپا بہت برا تھا۔ نیز اس میں غلطیاں  
 بہت رہ گئی تھیں۔ غالب خود میر جرح کو لکھتے ہیں :-

دیوان چھپ چکا ہے۔ لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسان پڑھا  
 حسن خط سے الفاظ کو چکا دیا۔ دلی پر اس کے پانی پر اس کے چھاپے پر لغت صاحبان  
 کو اس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کہتے کہ آواز دے۔ ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھانوی  
 کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکا حق تصنیف ایک مجھ کو ملا  
 غور کرتا ہوں تو وہ الفاظ جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہایت بجا غلط نام لکھا وہ  
 چھپا بہر حال خوش و ما خوش کئی جلدیں مول لوں گا..... نہ میں خوش ہوں نہ تم خوش ہو گے۔  
 اور یہ جو کچھ لکھتے ہو یہاں خریدارین قیمت لکھ بھیجیں۔ دلال نہیں بہتم مطبع نہیں مطبع احمدی  
 کے مالک محمد حسین خاں بہتم مرزا امویان۔ مطبع شاہدہ میں محمد حسین خاں دلی شہر آستان کے  
 کو ہے ہیں۔ مصوروں کی حویلی کے پاس قیمت کتاب چھ آئے بھول ڈاک خریدار کے ذمے۔

زمانے کی نیرنگیاں دیکھو کہ جس مجموعہ اشعار کے نسخے ہمارے زمانے میں او دو دو سو روپے  
 میں فروخت ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کا حق تصنیف غالب کو صرف ایک نسخہ ملا تھا جس کی  
 قیمت مع منافع ناشر و طابع صرف چھ آئے تھی۔ اور انہیں اپنے دوستوں میں نسخے تقسیم کر کے  
 لے بھی خود خریدنے پڑے تھے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نے مطبع احمدی والے ایڈیشن کی تائید "بنائے ریختہ"  
 اور "بیان ریختہ" خالی تھی۔ یوسف علی خاں غزنی نے لکھا تھا کہ  
 لکھی غزنی خستہ نے تائید الطبع  
 حاسد کے ہمر کو کاٹ کے دیوان ریختہ

کان پور میں دیوان کی عبت | مطبع احمدی والا نسخہ ۲ مجرم ۱۲۷۷ھ کو چھپا تھا لیکن چونکہ حد درجہ غلط چھپا تھا

اس لئے غائب نے اسے از سر نو کان پڑیں چھپوائے گا ارادہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قلم سے  
مطبوعہ نسخہ پر تمام غلطیاں درست کیں۔ اور اس کی پشت پر ایک رقعہ محمد حسین خاں مالک مطبع  
احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ ان کے پاس بھیج دیا۔ محمد حسین خاں نے اسے مطبع نظامی کان  
پڑا۔ اور ذی حجہ ۱۲۸۵ھ میں یہ دہائی سے چھپ کر شائع ہوا۔ غائب کا صحیح کیا ہوا نسخہ  
جس کی پشت پر محمد حسین خاں کے نام رقعہ لکھا گیا تھا۔ لکھنؤ کے بازار میں چند بیسے کو بچا۔ رقعہ  
مذکورہ درج ذیل ہے۔

جناب محمد حسین خاں کو میرا سلام پہنچے۔ دو رات، دن کی محنت میں میں نے اس نسخہ کو صحیح کیا  
ہے۔ غلط نامہ بھی اس میں دبیج کر دیا ہے۔ گویا اب غلط نامہ بیکار ہو گیا ہے۔ غائب کی عبارت  
کیا میرا بیان، کیا میرا قرالین کا اظہار اب کچھ ضرور نہیں۔ کس واسطے کو اب یہ کتاب اور مطبع  
میں چھاپی جائے گی۔ یہ جلد گویا سودہ ہے اس کو بھیج دیجیے۔ غائب ۱۲

میری معلومات کے مطابق غائب کی زندگی میں اردو دیوان کا اور کوئی ایڈیشن نہیں چھپا۔  
تفریق اردو اشعار غائب کی اردو شاعری کے متعلق مفصل تذکرہ آئندہ باب میں آئے گا جس میں  
بتایا جائے گا کہ انہوں نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کئے تھے  
اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے  
آگاہی حاصل ہوئی تو وہ اشعار ضائع کر دیے۔ صرف تھوڑے سے اشعار باقی رکھے ان اشعار  
کا ایک مجموعہ آنحضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرما کر اسے بھوپال کی توجہات عالیہ کی برکت  
سے نسخہ جلدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ غائب کے وہ اردو اشعار جو ان کے دیوان کی  
طباعت کے بعد کہے گئے یا تو ان کے رفات میں آگئے ہیں۔ یا بعض قلمی مسودات سے  
لے کر شائع کئے جا چکے ہیں۔ مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام نے اہل مال میں چھاپ  
دی

۱۔ رسالہ ہندوستانی بابت جنوری ۱۹۳۴ء صفحہ ۹۷ء ۱۹۳۵ء کو کہ مطبع احمدی واسے ایڈیشن میں غلطیوں کی کثرت کے  
باعث غلط نامہ شامل کرنا پڑا تھا غائب کی مراد یہ ہے کہ ساری غلطیاں درست کر دی گئی ہیں لہذا اب غلط نامہ کی ضرورت  
نہیں۔

تھیں کچھ اشعار دیوان غالب مطبوعہ مطبع نظامی میں چھپے ہیں کچھ اشعار اسی صاحب نے  
 مکمل شرح کلام غالب میں اچھلے ہیں لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے۔  
 ایک قلمی نسخہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں غالب کی ایک غیر مطبوعہ  
 غزل کا حوالہ دیا تھا جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں نہیں چھپی تھی۔ حضرت مولانا نے غزل  
 کی نقل نواب سید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے ملوکہ نسخہ سے حاصل کی تھی۔ میں نے حضرت  
 مدوح سے اس غزل کی نقل مانگی تو انہوں نے تحریر فرمایا کہ نقل الہلال کے دوران میں  
 حاصل کی گئی تھی۔ اور بغرض اشاعت دے دی گئی تھی۔ لیکن دفعۃً الہلال بند ہو گیا غزل شائع  
 نہ ہو سکی اور دوسرے مسودات کے ساتھ یہ بھی ضائع ہو گئی میں اس کتاب کو مکمل کر کے  
 کاتب کے حوالے کر چکا تھا۔ پرچہ ۹۳۶ میں ایک ضروری کام کے لئے دہلی گیا۔ تو مولانا مظہر الدین  
 صاحب شیر کوٹی مالک وائڈیٹر الامان و وحدت کی وساطت سے میں نے نواب طالب  
 مرحوم کے بعض غزلیوں سے ملاقات کی اور نواب صاحب مرحوم کا ملوکہ نسخہ دیوان غالب  
 دیکھنے کے لئے مانگا لیکن افسوس کہ اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ لیکن ایک صاحب نواب  
 شجاع الدین احمد خاں تالاباں مرحوم کی سنگم صاحبہ کے پاس سے ایک قلمی نسخہ دیوان غالب  
 لے آئے۔ جو بہ ظاہر رام پور واسے قلمی نسخہ کی نقل معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے کہ اس کے آخر میں  
 نواب ضیاء الدین احمد خاں کی لکھی ہوئی فارسی تقریظ بھی شامل ہے جس میں بیان کیا گیا ہے  
 کہ سارے دیوان میں ایک ہزار چھ سو نوے اور کچھ اشعار ہیں۔ اس کے حاشیہ پر جاہ جاوہ  
 اشعار مرقوم تھے جو غالب کے غیر مطبوعہ اشعار سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے ان تمام اشعار کی نقل  
 لے لی۔ ان میں سے بعض چیزیں شائع ہو چکی ہیں مثلاً

کیوں کہ اس جسے رکھوں جان عزیز  
 کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

لے مراد دیوان میں جو ہے۔

یا

بہت سی غم گیتی شراب کم کیا ہے  
علامہ ساقی کو تر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

یا

میں ہوں شتاقِ جہانچہ پہ چھا اور سی  
تم ہو بیداو سے خوش اس سوا اور سی

بعض چیزیں "الہلال" سے یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوانِ غالب کے نسخہ  
نظامی میں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً دالی رام پور کے غزلِ صحت، اردو قصیدہ، دو تین قطعات اور غزلیہ  
کائناتِ حیات دالی غزل۔

غیر مطبوعہ کلام | حوالہ بالا قلمی نسخہ کے بقیہ غیر مطبوعہ اشعار میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

آپ نے مسمیٰ انفسر کہا ہے تو سہی	یہ بھی اے حضرت ابوب کلا، تو سہی
رخ طاقت سوا ہو تو نہ بیٹیوں کیوں کر	نہیں ہیں غوثی تسلیم دھنا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر	نہ لے دو اگر روزِ بخرا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کہ چارہ گری	نہ سہی نیا تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھے کیا خوب بنائی اس نے	نہ سہی ہم سے پرس بت میں غلام تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال میں	کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی کیوں کہ ہے جلد ہی غا	شہرہ تیزی شمشیرِ قضا ہے تو سہی

مذا کے واسطے پردہ نہ کعبہ کا اٹھا د اغظ

کسیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافرِ عنتم نخلے



مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے  
یہ بندہ کمیسنہ ہمسایہ خدا ہے

.....

مکن نہیں ہے بھول کے بھی اُمید ہوں      میں دشت غم میں آہوئے صیاد ہوں  
ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو      گناہ کشیدہ کہ اشک چکیدہ ہوں  
جاں لب پائی تو بھی نہ شیر ہو اہن      از بسکہ تلخی غم ہجر اس چشیدہ ہوں  
مے سحر سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ      میں معرض مثال میں دستا بردہ ہوں  
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہو مجھ کو لاگ      نے دانہ فنا وہ ہوں دام حیدہ ہوں  
جو چاہتے نہیں وہ مری قدر و منزلت      میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں  
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہو مری جگہ      ہوں میں کلام نغزوئے ناشنیدہ ہوں  
اہل وع کے حلقے میں ہر جن ہو دل لیل      پر عاصیوں کے زمرہ میں میں گنیدہ ہوں  
پانی سے سب گزیدہ ڈوبے جس طرح آہد      ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مرہم گزیدہ ہوں  
حاشیے اور تن کے علاوہ اس قلمی نسخہ کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی  
کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے مثلاً یہ اشعار جو غالب لولہ وار  
والوں کی طرف سے تقاضے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے تھے

خوشی ہے یہ آنے کی رسات کے      نہیں باوہ ناب اور آم کھائیں  
سراغز موسم میں آمدھی ہیں ہم      کہ دلی کو چھوڑیں لولہ وار کو جائیں

۱۔ یہ نزل ایک مرتبہ ہمدرد میں بھی شائع ہوئی تھی جبکہ جریدہ شروع شروع میں ٹائپ میں دہلی سے نکلا تھا جس  
زمین میں غالب نے ابتدائی دور میں دو غزلیں کہیں جو نسخہ حمید میں موجود ہیں اور جن میں سے وہ شعر نسخہ نظامی میں بھی  
پسلا اشعار غیر مطبوعہ بھیجے ہیں۔ یہ دو شعر اس قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی موجود ہیں جس سے میں نے سندرہ بالا اشعار  
نقل کئے غالباً دو غزلوں میں سے غالب نے صرف یہی دو شعر قابل اندراج سمجھ کر محفوظ رکھے تھے۔

سوانح ہے جو کہ مطلوب جاں نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں  
 ہوا حکم باد چیلوں کو کہ ہاں ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پچائیں  
 وہ کھٹے کہاں پائیں امی کے پھول وہ کرٹوے کر لیے کہاں سے نمکائیں  
 فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار

کہو اس کی کیا کھا کے ہم خطا ٹھائیں

.....

خوانی بہ سوائے خویش ندانی کہ مردہم دانی کہ مردہ بارہ و رسم خرام نیست  
 نئے شیخ سد و ام نہ انجش مرگ من از عالم جنابت و مرگ حرام نیست

.....

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کی شادی کے موقع  
 پہلے کہے گئے تھے

ہم نہیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں بزم شادی ہے فلک کا ہشاں ہے سہرا  
 ان کو لڑیاں نہ کہو بکر کی موجیں سمجھو ہے تو کشتی میں و بے بحر رواں ہے سہرا  
 ہمارا جہ الور نے نکلتاں کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنج بخش سے لکھوایا تھا اور بہت  
 روپیہ اس کی تزئین پر صرف کیا تھا۔ ایک فارسی قطعہ تاریخ اس نسخہ کی تکمیل کے متعلق ہے۔  
 ایک غلط فہمی کا اناراد نسخہ نظامی کے صفحہ ۷۲ پر ایک غیر مطبوعہ غزل درج ہے جس کا مقطع یہ ہے

اب ہے ولی کی طرف کوچ ہمارا غالب

آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

جناب نظامی فرماتے ہیں کہ نواب سے نواب یوسف علی خاں والی رام پور کی طرف

اشارہ ہے۔

یہ وہ غزل ہے جو رام پور سے رخصت ہوتے وقت لکھی گئی چونکہ دیوان اس وقت مرتب

ہو کر چھپ چکا تھا۔ اس لئے دیوان میں شامل نہیں ہوئی۔

غالب نواب یوسف علی خاں کے زمانے میں جنوری ۱۸۶۷ء میں رام پور گئے تھے اور مارچ ۱۸۶۷ء میں واپس آئے تھے۔ دیوان کی طباعت کے جو حالات اور پر بیان کئے جا چکے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے نہیں مانا جاسکتا کہ مارچ ۱۸۶۷ء میں دیوان تب ہو کر شائع ہو چکا تھا۔ اس وجہ سے یہ غزل شال دیوان نہ ہو سکی۔ بلکہ دیوان اس سے کم و بیش ڈیڑھ برس بعد شائع ہوا۔ دوبارہ فریدوں ماہ بعد چھپا۔ میرا خیال ہے کہ نواب سے نواب یوسف علی خاں کی طرف نہیں بلکہ نواب کلب علی خاں کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ غزل ۱۸۶۷ء میں نہیں بلکہ ۱۸۶۷ء میں طباعت دیوان سے دو تین برس بعد کی گئی۔

بہر حال غالب کا اردو کلام ابھی تک بہت متفرق حالت میں ہے۔ اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ تمام چیزوں کو یکجا کر کے بہ صورت کلیات چھاپا جائے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ سارا کلام سامنے رکھ کر اس کا ایسا انتخاب مرتب کیا جائے جو غالب کے ذہن کا صحیح مرقع ہو۔

اردو کا تیب | خواجہ حالی مرحوم نے لکھا ہے :-

مرزا ۱۸۵۷ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ زمینی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور بہمن مہینہ ۱۲۷۵ھ کے لکھنے میں مصروف ہو اس وقت یہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی .... قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالب ۱۸۵۷ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے ہیں۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس لئے کہ اول مہینہ ۱۲۷۵ھ کو کوئی بڑی کتاب نہیں جس کی ترتیب میں غالب کے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہو گا۔ یہ کتاب انہوں نے کم و بیش پانچ برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہر اعتبار اور وسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ بچیس صفحات لکھتے رہے اور یہ غالب جیسے

قادر الکلام اور شائقِ شکر کے لئے کوئی بہت بڑا کام نہیں ہے جس کی تکمیل کی خاطر انہیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔ دوسرے خط و کتابت میں ان کا عام انداز ہے اور اُلجھا ہوا نہ تھا بلکہ جو کچھ لکھتے تھے عموماً بلا تکلف لکھتے تھے اردو خط و طح فارسی خط و طح میں بھی تکلفات سے آزاد گی ہر مقام پر ظاہر ہے انہوں نے خود پہنچ آہنگ کے آغاز میں شکر گاری کے جو خاص بیان کئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدا ہی سے صحیح راستہ پر گامزن تھے۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر فارسی خط کے لفظ لفظ پر گھنٹوں مصروف فکر رہتے تھے یا دوسرے ان کے فارسی مکتوب میں ایک خط منشی جو اہر سنگھ جوہر کے نام ہے جس میں سر کے لئے تنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس خط کے آخر میں مطبوعہ پہنچ آہنگ میں یکم دسمبر ۱۸۴۵ء مطابق چارم محرم ۱۲۵۱ء ثبت ہے۔ ہجری اور عیسوی تاریخ میں مطابقت نہیں ہوتی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم ایک تاریخ ضرور غلط ہے۔ اگر تاریخ ہجری کو ۱۲۵۱ء کے بجائے ۱۲۵۲ء رکھا جائے تو عیسوی تاریخ ۱۸۴۵ء ہوتی چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ان کے اردو خطوں کے ایک خط میں بھی منشی جو اہر سنگھ سے تنگی کا تقاضا موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

کیوں صاحب وہ ہماری تنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوئے جب تک لکھا تھا کہ اسی جفتہ پیچوں کا۔

یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں گے میرا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اردو نشر کو اہل علم زیادہ بلند پایہ نہیں دیتے تھے۔ اس لئے وہ خط و خط نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا۔ غالب کی خط و کتابت فارسی کے بجائے اردو میں زیادہ ہوتی گئی۔

اردو مکتوب کی شاعت گزرا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۸ء تک اردو مکتوب کا اچھا ذخیرہ مختلف دوستوں کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ اور وہ انہیں چھاپنے کا قصد کر رہے تھے جسے پہلے





منشی شیونرائن اکبر آبادی نے غالب کو لکھا کہ اردو مسکاتیب شائع کرنے کی اجازت دیجے غالب ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں منشی صاحب کو لکھتے ہیں :-

اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں۔ یہ بھی زامدیا ت ہے۔ کوئی رقمہ ایسا ہوگا جو میں قلم بھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر میری ہے۔ اس کی شہرت میری بخور کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔

غالب اپنے فارسی رقعات کو چھاپنے کے خلاف نہ تھے حالانکہ وہ بھی زیادہ تر ایسے معاملات سے متعلق تھے جنہیں ان کے اور ان کے دوستوں کے آپس کے معاملات کہنا چاہتے۔ اردو مسکاتیب کی اشاعت سے گریز کی حقیقی وجہ یہی تھی کہ اس زمانے میں اردو شکر کشنوری کی شہرت کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ آپس کے معاملات والا عذر عذر زائد تھا۔

مجموعہ مسکاتیب کی ترتیب | لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دوستوں کے پیہم اصرار کے باعث ان کی رائے بدل گئی تھی۔ چنانچہ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۶۱ء میں چودھری عبدالغفور خاں سرور مارہروی نے غالب کے تمام رقعات ”تہ غالب“ کے نام سے جمع کر لئے۔ اور ان کا دیباچہ لکھ کر غالب کے پاس بھیج دیا۔ غالب نے اس دیباچہ کی وادہ دی۔ یہ مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کی تحریک پر مرتب ہوا تھا۔ منشی غلام غوث خاں بخیر نے مزید رقعات کی ترتیب شروع کر دی۔ غالب ان خط میں منشی صاحب لکھتے ہیں :-

کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر میں کلکتہ میں۔ مولوی عبدالغفور خاں ان کا نام شائع ان کا تخلص ہے میری ان کی ملاقات نہیں۔ انہوں نے اپنا دیوان چھاپے کا موسم یہ دفتر بے مثال ”بھگت“ بھیجا اس کی رسید میں یہ خط میں نے ان کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعہ شکر اردو کے لائق ہے۔ آپ کے پاس

ارسال کرتا ہوں۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہی منشی ممتاز علی خاں صاحب جی چودھری عبدالغفور خاں کے پاس مارہرہ پہنچے تھے۔ اور مجموعہ خطوط کی ترتیب کی تحریک فرما چکے تھے۔ اس مجموعہ کو چھاپ رہے تھے اور خواجہ غلام غوث خاں بخیر کتاب کی ترتیب تکمیل میں منشی صاحبہ معاون تھے۔ غالب خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں :-

اں حضرت وہ مجموعہ جیسے کا بافتح یا جیسے کا باضم، چھپ چکا ہے تو فی التصفیف کی حقبتی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی بہت اقتضا کرے تھیں۔

ایک اور خط میں خواجہ غلام غوث خاں کو لکھتے ہیں :-

اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں سے یقین جانتا ہوں ایسی نثر کو آپ خود درج نہ کریں گے۔۔۔۔۔ کتاب کیسں صاحب بہادر افسر مدرّس غربہ شال کا یا جو عدم تعارف خطابہ کو آبا۔ کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا اس کا جواب لکھ بھیجا نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیج دیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا مگر یہ لکھا کہ طبعاً آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع دہاں سے منگاکر بھیج دوں گا۔

عود ہندی کی کیفیت | بہر حال منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے سرور نے اپنا مجموعہ خود مقدمہ لکھ کر منشی صاحب کے حوالے کیا خواجہ غلام غوث خاں صاحب بخیر نے بعض اور خطوط جمع کر دیے۔ اس وقت تک یہی خیال تھا کہ تمام خطوط شائع نہ کئے جائیں۔ بلکہ صرف وہ خطوط شائع کئے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو۔ اس لئے غالب خواجہ غلام غوث خاں کو لکھتے ہیں :-

اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں سے -

لیکن بعد ازاں جتنے خطوط مل سکے بجنسہ شال مجموعہ کر دیئے گئے اور عود ہندی



میں ایسے خطوط بھی موجود ہیں جن میں نہ عبارت کی کوئی خاص خوبی ہے اور نہ کوئی علمی نکتہ غالب کا دیباچہ کا مطالعہ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجہ غلام غوث خاں "عود ہندی" کا دیباچہ غالب ہی سے لکھوانا چاہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

مجموعہ نشر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے۔ تو اس مجموعہ کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا۔ بلکہ چھپ جانا بالضم چاہتا ہوں۔ سعدی مدبر الرحمة فرماتے ہیں :-  
 رسم است کہ مالکان تحسیر  
 آزاد کنند بندہ پیسر۔

آپ بھی اسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے۔  
 فنی ممتاز علی خاں کا بیان [فنی ممتاز علی خاں "عود ہندی" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غالب کی فارسی تصانیف تو بہت چھپ چکی ہیں۔ مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی حالانکہ غالب کی اردو نشر دوسروں کی فارسی سے بہتر ہے۔ مدت سے سیر خیال تھا کہ اردو نشر بھی مرتب کی جائے :-

میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد میتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انہوں نے جتنے خطوط میرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے سب کو ایک جاکر کے اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ حاجا سے اللہ مخیر ہے میرزا صاحب کی بہیم پہنچا میں۔ بڑی محنت اٹھائی تب ممتاز برائی..... خراجہ غلام غوث خاں بہادر بنجر تخلص جو جناب محلے القاب نصرت گو رہز بہادر مالک مغربی و شمالی کے پرنسپی او میر بہ محمد دم خاص اور حضرت غالب صاحب کے تخلص بالاختصاص ہیں اس تلاش میں میرے معین اود مدگار رہے بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت بہیم پہنچا اس کتاب کی فصل اول ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط امدان کا لکھا ہوا دیباچہ دوسری فصل میں میرے جمع کئے ہوئے رقعات اور خاتمہ میں چند نشریں ہیں جو جناب غالب نے

اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔

”عود ہندی“ کے ختم نام کی عبارت بہ طرز تقریظ حکیم غلام مولا صاحب قلیق ساکن میرٹھ نے لکھی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی ممتاز علی خاں روٹو سا میرٹھ میں سے تھے۔ غالبؒ یہ وہی بزرگ تھے جنہوں نے سفارشی بن کر اردو کا دیوان منشی عظیم الدین صاحب کتب فروش کو بنیض طباعت دلایا تھا۔

عود ہندی کی طباعت کوئی | اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عود ہندی کب چھپی؟ میرزا محمد عسکری صاحب مولف ”ادبی خطوط غالبؒ“ فرماتے ہیں کہ ”عود ہندی“ سب سے پہلے مطبع محبتانی میرٹھ میں غالبؒ ۱۲۷۸ھ میں یعنی غالب کی وفات سے سات برس قبل چھپی تھی۔

میں نہیں سمجھ سکا کہ میرزا محمد عسکری صاحب کے اس دعوے کی بنیاد کیا ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ دعوے ناقابل تسلیم ہے۔ اس کے وجوہ و برج ذیل ہیں:

(۱) ”عود ہندی“ میں ”نامہ غالبؒ“ بھی شامل ہے۔ اور ”نامہ غالبؒ“ ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ”عود ہندی“ ۱۸۶۵ء تک نہیں چھپی تھی۔

(۲) غالبؒ نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو مولوی عبدالغفور خاں نسخ کے دیوان ”دفتر بیتال“ کی تقریظ بھی عود ہندی میں شامل کرنے کے لئے بھیجی تھی اور اس میں لکھتے ہیں کہ ”مجوعہ نشر اردو جس کا نام اس وقت تک تجویز نہیں ہوا تھا۔ چھپے گا یا چھپے گی“ یعنی اس تقریظ کی ترتیب تک ”عود ہندی“ نہیں چھپی تھی۔ اور تقریظ میں غالبؒ اپنی عمر ایک کم تر بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تقریظ ۱۲۸۱ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں لکھی گئی تھی۔

(۳) ”عود ہندی“ میں ایسے مکاتیب موجود ہیں جو یقینی طور پر ۱۲۷۸ھ کے بعد لکھے گئے مثلاً خواجہ غلام غوث خاں صاحب بیخبر کے نام کا وہ مکتوب جو ”عود ہندی“ کے صفحہ ۱۱۹

ہر وجہ سے اس میں غالب مجموعہ نثر اردو کے نہ چھپنے کی شکایت کرتے ہوئے یہ لکھتے ہیں کہ لارڈ لینگ کی مح میں قصیدہ لکھا تھا۔ وہ سکرٹری صاحب نے یہ کہہ کر وہیں کہہ دیا کہ تم ایام غد میں پادشاہ کے صاحب تھے پھر لارڈ لینگ کی مح میں قصیدہ بھیجا آخر میں فرماتے ہیں کہ جب لارڈ لارنس وائسرائے بنے تو ۱۳ فروری ۱۸۶۳ء کو ان کی خدمت میں قصیدہ بھیجا۔ آج تک کہ مارچ ہے اس کا جواب نہیں آیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مارچ ۱۸۶۳ء تک عود ہندی نہیں چھپی تھی۔

۴) خواجہ غلام غوث خاں کے نام کے ایک خط میں جو جولائی ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا ہے۔ نواب کلب علی خاں والی رام پور کی مح میں ایک قصیدہ درج ہے۔ یہ معلوم ہے کہ نواب کلب علی خاں اپریل ۱۸۶۵ء میں مسند نشین ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ جولائی ۱۸۶۵ء تک "عود" شائع نہیں ہوئی تھی۔

۵) عود کا پہلا ایڈیشن | غالب کی تحریرات کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عود ہندی ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی تھی اس لئے کہ اس کی اشاعت کا کہیں ذکر نہیں لیکن میں لاہور واپس آیا تو میرے محترم اور فاضل دوست مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اور ٹیل کالج لاہور نے بعض دوسری ضروری چیزوں کے علاوہ مجھے اکتوبر ۱۹۳۵ء کا رسالہ ہندوستانی بھی مر فرمایا جس میں "عود" کی ترتیب کے متعلق منشی ہمیش پرشاد صاحب مولوی فاضل بنارس یونیورسٹی کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ "عود" ۲ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یعنی غالب کی وفات سے ٹھیک چار ماہ قبل شائع ہوئی تھی۔ لیکن اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اور غالب نے اسے "مہل" قرار دیا تھا اس مضمون سے "عود" کے متعلق جو مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ انہیں خلاصہ کیاں پیش کرتا ہوں۔

(۱) چودھری عبدالغفور خاں صاحب سرور مارہروی کے مجموعہ کے علاوہ خواجہ غلام غوث خاں پیر نے مختلف خطوط کے جمع و ترتیب میں سخت محنت اٹھائی تھی لیکن

زیادہ تر خطوط صرف ان رشتوں کے لئے جو صوبجات متحدہ میں رہتے تھے مثلاً کاپی کے  
نواب انور اللہ، گورکھ پور کے عبدالرزاق خاں شاکر، اگرہ کے حاتم علی بیگ،  
بریلی کے قاضی عبدالحلیم۔

(۲) خواجہ صاحب نے پورا مجموعہ مرتب کر لیا اصل اپنے پاس رکھا اور اس کی نقل ۱۸۶۶ء  
میں بغرض طباعت منشی ممتاز علی خاں کے پاس بھیج دی یہ بھی لکھا کہ طباعت سے  
قبل مسودہ غالب کو دکھایا جائے۔

(۳) پوری کتاب چھپ گئی لیکن طابع صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں آخری صفحہ  
روک رکھا اور کتاب بہ دستور نام تمام پڑی رہی۔ اخبار جلوہ طوڑمرا و آباد کے ختم  
نے اسی حالت میں پچیس جلدیں لیں۔ خواجہ غلام غوث خاں صاحب کو کیفیت  
معلوم ہوئی تو انہوں نے منشی ممتاز علی صاحب کو لکھا کہ قطعہ تاریخ فرض نہیں  
اس کا انتظار نہ کیجئے اور کتاب مکمل کر کے شائع کرو دیجئے۔

(۴) یہ نسخہ میرٹھ میں چھپا تھا اگرچہ غالب سمجھ رہے تھے کہ یہ مطبع الہ آباد میں چھپا ہے  
(۵) اس کی تقطیع  $9 \times 4$  (سج تھی کاغذ سفید تھا اور حجم ۱۸۸ صفحہ تھا۔

حد کا مختلف ایڈیشن | منشی ہمیش پرشاد نے "عود ہندی" کے مختلف ایڈیشنوں کی تفصیل بھی بیان  
فرمادی ہے۔ جسے میں یہاں درج کرتا ہوں:-

(۱) مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ء (۲) رجب ۱۲۸۵ھ

(۲) مطبع نارینی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۶۸ء (۲۰ صفر ۱۲۹۵ھ)

(۳) مطبع نوکشتورکان پور ستمبر ۱۸۶۸ء (۱ رمضان ۱۲۹۵ھ)

(۴) مطبع سفید عام اگرہ مئی ۱۹۱۰ء

(۵) مطبع نوکشتورکان پور ۱۹۱۳ء (بار چہارم)

۱۔ عود ہندی صفحہ ۱۶۔

(۶) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ء

(۷) فینل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ء

(۸) مطبع انوار احمدی الہ آباد

(۹) مطبع کرمی لاہور

(۱۰) مطبع گلزار ہند سٹیم پریس لاہور

منشی صاحب کا اندازہ ہے کہ اس وقت تک مختلف مطابع میں عود ہندی کے بارہ ہزار نسخے شائع ہو چکے ہیں۔

پانچ ۱۹۳۶ء میں مجھے دہلی کے ایک کتہ فروش سے عود ہندی کا ایک نسخہ ملا جس کے اول و آخر کے چند صفحات غائب تھے منشی ہمیش داس نے عود کے پہلے ایڈیشن کی کیفیت بیان فرمائی ہے اسے پیش نظر رکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ یہ عود کا پہلا ایڈیشن ہے۔ اس میں دو جگہ حاشیہ پر بعض عبارتیں موجود ہیں جو خطوط کے بعض حصوں کی تشریح سے متعلق ہیں۔ اردوئے معلّے کی ترتیب عود کی طباعت میں تاخیر ہو گئی تو غالب کے بعض غزلیہ شاعر اگر دہلی میں اردو مکتب کے چھاپنے کا ارادہ کر لیا۔ غالب نواب علامہ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:-

مطبع اکل المطابع میں چند اصحاب میرے مسودات اردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اظہارِ وجہ فرام کئے ہیں میں خود نہیں رکھتا جو لکھا وہ جہاں بھیجا ہوا بھیج دیا۔ تین ہے کہ خامیرے تمامے پاس بہت ہوں گے اگر ان کا ایک پارس بجا کر بیل ڈاک بھیج دو گئے۔ یا آج کل میں کوئی ادھر آئے والا ہو اس کو دے دو گئے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔

اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ دہلی میں ترتیب مجموعہ مکتب کا کام کب شروع ہوا۔ نواب علامہ الدین احمد خاں نے غالب خطوط کے بھیجنے میں تاہل کیا انہیں پھر لکھتے ہیں:-

۱/۱۰/۱۹۳۵ء ۱/۱۱/۱۹۳۵ء

منو بھائی۔ اگر ان خطوط کا تم کو انھا منظور ہوا، در شہرت منافی طبع ہو تو ہرگز نہ بھیجو قصہ تمام ہوا  
اور اگر ان کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی  
مستعدی سے نقل آتو اگر جاہر کسی کے ہاتھ جاہر سبیل پارل ارسال کرو۔  
نواب صاحب نے خطوط بھیج دیئے تو انہیں لکھتے ہیں :-

خطوط کے ارسال کو مکرو نہ لکھنا ازراہ طلال نہ تھا۔ طالب کے فوق کو سست پا کر میں توقف  
ہر گیا تھا۔ متوسل ایک حلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے، اپنا نفع نقصان سوچنے  
کا۔ لاگت بچت کو جانچنے کا میں متوسط کو متمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا میں  
رقعہ ایک جگہ سے لے کر ان کو بھیجے، اس کی رسید میں تقریباً انہوں نے طلبہ قعات تک تلف  
سوداگر لکھی اور اس سوداگر کو مفقود و خیر لکھا۔ ظاہر کتابیں لے کر کہیں گیا ہوگا..... تینیس<sup>۲۲</sup> نے  
اور چونتیس<sup>۲۳</sup> خطوط دستور میرے کس میں موجود و محفوظ ہیں گئے اگر متوسطہ نقاضا طلب  
کیس نکا ان خطوط کی نقلیں اس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمہارا سہ بھیجے ہوئے کا خدمت کم  
پہنچ جائیں گے۔

اس خط پر ۳۱ مئی ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں  
مجموعہ خطوط کی طباعت کا ارادہ ۱۸۶۳ء میں ہوا تھا۔  
اردوئے معلیٰ کی طباعت دہلی والے مجموعہ کا نام آرووئے معلیٰ قرار پایا میرمدی مجروح نے اس کا  
دیباچہ لکھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ منشی جاہر سنگھ جوہر کی کوششوں سے فراہم ہوا  
تھا۔ غائب کی زندگی میں اس کی طباعت اکل المطابع میں فخر الدین کے دیرا ہتمام شروع  
ہو چکی تھی۔ خاتمہ کی عبارت قربان علی بیگ سائیک نے لکھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غائب  
مجموعہ کی طباعت مکمل ہونے سے قبل وفات پا چکے تھے۔ سائیک نے جو تاریخ طبع کسی اس کا آخری  
شعریہ تھا۔

سہی ہی سال طبع سال وفات آج ان کا سخن تمام ہوا،

غالب کی اپنی تحریر | غالب نے اردو سے پہلے کاشی ملکیت حکیم غلام رضا خاں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان کی اصلی تحریر جو صرف پہلے ایڈیشن کے ساتھ چھپی تھی یہ ہے :-

پیکر بے روح و مردہ الٰہیہ رسالہ غلام رضا خاں غالب تخلص بیچ دیا کتنا ہے۔ اور لکھ دیتا ہے کہ یہ اردو سے پہلے تصنیف فقیر مطیع الملک المظاہر دہلی میں چھاپا ہوا سو میں نے اذراہ قسط محبت اپنا حق تالیف و ترجمہ قبال نشان حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے۔ اور اس حق کو خاص ان کا حق کیا ہے اور کوئی صاحب اگر مالک الملک المظاہر حکیم غلام رضا خاں کے بے اطلاع اردو سے پہلے کے چھاپے کا قصہ کریں تو موافدہ سے محفوظ نہ رہیں گے اور فوراً حسب نشار قانون مجرم بن جائیں گے۔

خود ہندی کی طرح ”اردو سے پہلے“ کے بھی مقدمہ و ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بعض ایڈیشنوں میں غالب کے مزید رقعات شامل کئے گئے ہیں لیکن میں سارے ایڈیشن جمع نہیں کر سکا اس لئے ان کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔

نجات و رقعات | اردو کی بقیہ تصانیف میں سے ”تیغ تیز کا ذکر قاطع برہان“ کے ضمن میں آئے گا۔ اس لئے کہ وہ ”قاطع برہان“ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے البتہ نجات و رقعات کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ اگرچہ یہ کتاب فارسی زبان کے بعض اصول و قواعد سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں رقعات بھی سب کے سب فارسی ہیں لیکن اصل کتاب اردو میں ہے۔ خود غالب فرماتے ہیں کہ یہ پنج آہنگ کا اردو ترجمہ ہے :-

اکثر برس کا ناتوان آدمی دنیا میں عزت اور عقے میں نجات کا طالب ترک سلجھتی اسلامہ غالب غالب کہتا ہے بیس برس پہلے میں نے اپنی نثریں جمع کیں۔ اور اس کا نام پنج آہنگ رکھا چالیس برس کی عمر میں وہ رسالہ لکھا۔ اب اکتیس برس کے بعد یہ ارادہ کیا ہے کہ پنج آہنگ کی چوتھی آہنگ جس میں فارسی کی صرف کا بیان ہے اس کا اردو ترجمہ کیا جائے تاکہ وہ ادراک

لے بہ ترتیب موجودہ آہنگ چارم تقریظوں وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اور مصداقہ وغیرہ کا بیان پنج آہنگ کی آہنگ سوم میں ہے۔

حضور پر نور قبلہ حاجات غلق اور بعد مال انام نائب مسیح علیہ السلام جامع دانش و دوا دار کے  
مرجی اور علمائے استاد جناب علی القاب میکلوٹ صاحب بہادر فرمانروائے وسیع ملک پنجاب نظام  
نواب نصرت گورنر بہادران کا خطاب اور فی الحقیقت سلطان ملک خوش ہال رکاب کی مد  
کئے جائیں۔ عذر اسے مجھ تک جاہل کا بیان حضرت گچہ پتہ آئے۔ اور یہ رسالہ ان کی زبان سے  
”نجات غالب“ کا نام پائے۔

لیکن میری رائے میں اسے ”ترجمہ“ قرار دینا صحیح نہیں۔ بہر حال یہ کتاب فروری ۱۸۶۷ء  
میں پیارے لال صاحب اسٹنٹ ماسٹر مدرسہ دہلی نے چھپوائی تھی۔ اس کے میں  
صفحات نجات کے لئے وقف ہیں سولہ صفحوں میں پندرہ خطوط چھپے ہوئے ہیں ایک شتی  
غلط نامہ کا تھا۔ اس کے صرف پانسو نسخے چھپے تھے۔ دوبارہ یہ کتاب نہیں چھپی۔

اردو کی کتاب | ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب نے غالب نشی شیونرائن کی وساطت سے فرمائش کی  
تھی کہ غالب اردو کی ایک کتاب لکھ دیں۔ غالب نشی شیونرائن کو لکھتے ہیں :-

جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو بھی میں خد نہیں لکھ سکتا۔ ان کی فرمائش ہے اردو کی  
نثر کی۔ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں مگر بھائی تم عذر کرو اردو میں اپنے  
قلم کا زور کیا صرف کروں گا اور اس عبارت میں معافی نازک کیوں کر بھروں گا۔ سوچ رہا  
ہوں کہ کیا لکھوں، کون سی بات، کون سی کہانی، کون سا مضمون تحریر کروں۔ تمہاری رائے  
میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ  
پھر لکھتے ہیں :-

جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں اس میں  
گنجائش عبارت کی کہاں ہے۔ بہت ہو گا تو یہ ہو گا کہ میرا اردو بہ نسبت اردو کے  
اردو کے فصیح ہو گا۔ خیر بہر حال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا۔  
یہ ۱۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کی تحریر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اردو نثر کی کوئی



مستقل کتاب نہیں لکھی۔ البتہ یورپی کے انگریز انسپکٹر مدارس نے اُردو زبان کی ابتداء کے متعلق ان سے جو تحریر حاصل کی تھی سوہ خدا جانے کیا ہوئی۔ کاش اس تحریر کا سراغ کہیں سے مل سکے۔

فارسی دیوان | فارسی تصانیف میں سے ہم سب پہلے نظم کو لیتے ہیں غالبؒ کے ایک مکتوب میں سید بدرالدین کو لکھتے ہیں :-

فارسی کا دیوان میں پچیس برس کا عرصہ ہوا چھپا تھا پھر نہیں چھپا۔

۱۸۶۳ء سے پچیس برس تک خالی دیتے جائیں تو ۱۸۳۸ء باقی رہتے ہیں اگر غالبؒ کے بتائے ہوئے تخمینہ کو صحیح سمجھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فارسی کا دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۳۸ء کے لگ بھگ چھپا تھا۔

غالبؒ کے سیدی بھائی میرزا علی بخش خاں رنجور پٹنجاہنگ کے ویساچہ ہیں لکھتے ہیں کہ ۱۲۵۱ھ میں نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروزپور جھیر کہ پرتھوئے آسمانی سے آفت نازل ہوئی کہ خدا کسی کو نہ دکھائے۔

بعد ازاں ہنگامہ ہم دران ہنگام از جے پور بہ دہلی رسیدم وہ کاشانہ برادر والا شان و آبرو کا  
ہریانہ مولانا غالب دادا فضل فرواد آدم چوں دران ایام دیوان فیض عنوان کہ مسے پٹنجاہ  
آرزو است تازہ فراہم آمدہ و پیرایہ اتمام پوشیدہ آچہ از نشر دران ہمایوں عجیفہ صورت ارقام  
دہشت ہمہ رایہ خدمت والائے آں خسرو اقلیم سنوری خواندم۔

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں غالبؒ فارسی دیوان مکمل ہو چکا تھا اور اس کا نام پٹنجاہ آرزو رکھا گیا پیرایہ اتمام پوشیدہ سے یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ دیوان چھپ چکا تھا اور یہ بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ چھپنے کے لیے مکمل ہو چکا تھا۔ بہر حال اس سے ظاہر ہے کہ غالبؒ کا فارسی دیوان سب سے پہلی مرتبہ ۱۸۳۵ء اور ۱۸۳۸ء کے درمیان شائع ہوا۔

غائب فارسی دیوان کے خاتمہ کی شہر میں سال تحریر ۱۲۵۳ھ لکھا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دیوان ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں چھپا۔

کلیات نظم کی طباعت | اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کلام غائب جو مجموعے اہتمام کے ساتھ مرتب کئے تھے وہ سب غزلیں لٹ گئے۔ غدر کے بعد نواب صاحب مرحوم نے پھر بڑی محنت سے یہ نادر ذخیرہ خراہم کیا۔ اور ۱۸۶۶ء میں منشی نو لکشور نے مسودہ منگاکر چھاپنا شروع کیا۔ غائب لکھتے ہیں :-

منشی نو لکشور نے شہاب الدین خاں (فرزند نواب ضیاء الدین احمد خاں) کو لکھ کر کلیات فارسی جو ضیاء الدین خاں نے غدر کے بعد بڑی محنت سے جمع کیا تھا۔ منگالیا اور چھاپنا شروع کیا۔ وہ پچاس جلد ہیں یعنی کوئی سترہ میر اس سے خارج نہیں۔

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ منشی نو لکشور کے مطبع نے تکمیل طباعت میں کافی دیر کر دی تھی۔ غائب میر ہمدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

کلیات کے چھاپے کی حقیقت سنو۔ سات صفحے چھاپے گئے تھے کہ مروی ادبی علی صہ بیمار ہوئے۔ کاپی نویس خضنی اپنے گھر گیا۔ اب دیکھئے کب چھاپنا شروع ہو۔

ایک خط میں نواب علار الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

کلیات کے اطلبہ کا اختتام اپنی زیت میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔

ستمبر ۱۸۶۶ء میں منشی نو لکشور دہلی آئے اور غائب بھی ملے۔ اس سے قبل وہ غالباً او وہ اخبار میں غائب کی کلیات نظم فارسی کی طباعت کا اعلان کر چکے تھے۔ اور اس کی قیمت سو ایتن سو روپے مقرر کی گئی تھی لیکن بعد میں پانچ روپے کی قیمت کا اعلان کروا۔ غائب نواب علار الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :-

شفیق کرم و لطف مجسم منشی نو لکشور صاحب یہیل ڈاک میاں آئے پھر سے اور بتائے

چچا (نواب ضیاء الدین احمد خاں) اور مہار سے بھائی شہاب الدین احمد خاں سے ملے جانے



دینے پڑے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ستمبر ۱۸۶۳ء میں غالب کے پاس کلیات کا پہلا مطبوعہ نسخہ آیا تھا۔ اسی مہینے میں انہوں نے ایک نسخہ مولوی نیدالدین خاں کی وساطت سے نواب الملک سر سالار جنگ اول وزیر اعظم حیدرآباد کے پاس بھیجا وہ منشی حبیب اللہ خاں دکا کے نام کے ایک مکتوب (مرقومہ ۲۵، دسمبر ۱۸۶۳ء) میں مولوی نیدالدین خاں کے بزرگوں اور اپنے بزرگوں کے گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

اب آپ دو کتاب سے یہ جانتا ہوں کہ آپ مولوی صاحب میں اور ان کو یہ خط اپنے نام دکھائیں اور میری طرف کے بعد سلام میرے کلیات کے پارسل کا ان کے پاس پہنچاؤ ان کے ذریعہ غایت سے اس جلد کا حضرت فلک رفعت نواب مختار الملک بہادر کی نظر سے گزرا اور جو کچھ اس گزرنے کے بعد واقع ہو اور یافت کر کے مجھے مطلع فرمائیں۔

کلیات کے انطباق کی جتنی تاریخیں لکھی گئیں۔ ان میں سے یہ ہندی مخرج کی تاریخ ۱۲۷۸ھ کی ہے بقیہ سب تاریخیں ۱۲۷۵ھ کی ہیں۔ ایک تاریخ عیسوی ہے جس سے ۱۸۶۳ء نکلے ہیں۔

ثنوی ”ابن ہر بار“ غالب نے شاہ نامہ اور سکندر نامہ کی بحر میں غزوات بنویں کو نظم کرنے کا اہل کیا تھا۔ لیکن وہ صرف تمیذات و مقدمات ہی مکمل کر سکے ”ابن ہر بار“ انہی تمیذات و مقدمات کا نام ہے۔ مجھے کلیات کا پہلا ایڈیشن نہیں مل سکا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ کلیات کی طباعت کے وقت ثنوی مکمل ہو چکی تھی یا نہیں اور کلیات کے پہلے ایڈیشن میں اسے شامل کیا گیا یا نہیں کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ ثنوی کلیات میں شامل ہوتی تو اسے علیحدہ چھاپنے کی ضرورت نہ تھی ثنوی کا جو علیحدہ نسخہ میرے پاس ہے۔ اور ۱۲۷۵ھ (۱۸۶۳ء) کا چھاپا ہوا ہے یہ بھی مکمل المطابق میں چھپا تھا۔ اس میں ثنوی کے علاوہ غالب کے دو قصیدے۔ تین قطعے اور دس رباعیات بھی ہیں۔ اس نسخہ کے متعلق غالب کی متداول تحریرات میں مجھے ایک حرف بھی نہیں مل سکا۔

”سببیں“ یہ غالب کے ان فارسی اشعار کا مجموعہ ہے جو کلیات اور ثنوی ”ابگر بار“ کی طباعت کے بعد کہے گئے یا ذاب ضیاء الدین احمد خاں کے فراہم کئے ہوئے اس مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے تھے جو منشی نو لکھنؤ کے مطبع میں بغرض طباعت بھیجا گیا تھا۔ غالب خود اس کے ویراچ میں لکھتے ہیں :-

”سببیں“ سیوہ را گویند کہ پایان موسم بر شاخسارے ماند و چوں آں را بر چنبد شاخسار  
ہے بار ماند ہر آئینہ آئینہ پس از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد و آنچه یاران از دہریں مسودات  
و ہشتاد و سن انان خبر نوشتہم و انیک بہمن برسانند در اوراق جدا کا نہ ضبط کردہ شدہ  
و آں را ”سببیں“ نام نہادہ ام۔

آخر میں لکھتے ہیں :-

اکنوں کہ ناسور کہن را ترا دیش ماند ملک از کف و زکراتہ ام پس اگر سخنے در اندیشہ  
خوابد زشت روئناس صغیر خواہد گشت۔

باقری خاں کالی کے نام کے ایک خط مرقوم ۲ دسمبر ۱۸۶۶ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا جہ الور کی خدمت میں ”سببیں“ کا ایک نسخہ نومبر ۱۸۶۶ء میں بھیجا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ”سببیں“ ۱۸۶۶ء میں چھپی تھی۔ میں نے ”سببیں“ کا جو نسخہ اپنے محترم دوست جناب شیر علی صاحب سرخوش دلاہور کی عنایت سے دیکھا تھا۔ اس کا سرورق غالب تھا۔ اس لئے مطبع وغیرہ کے متعلق میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔

پنج آہنگ | پنج آہنگ ”غالب کے کلیات شرکی پہلی کتاب ہے اس کے پانچ حصے ہیں۔ اس لئے اس کا نام ”پنج آہنگ“ رکھا گیا۔ حصہ اول میں آداب و القاب وغیرہ ہیں حصہ دوم میں فاضلی لغات کی مصطلحات و مصادر ہیں حصہ سوم میں دیوان غالب کے منتخب اشعار ہیں جو خط لکھتے وقت مختلف مطالب کے اظہار کے لئے مطلوب ہو سکتے ہیں۔ حصہ چارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور مختلف نثریں ہیں۔ حصہ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں۔

پنج آہنگ کے دیباچہ کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) میں جب انگریزی لشکر بھرت پور پر حملہ آور تھا تو نواب احمد بخش خاں مرحوم کے دستے کے ساتھ غالب اور علی بخش خاں رنجور بھی تھے میرزا علی بخش خاں نے غالب درخواست کی کہ

آداب و انقب متعارفہ رسمہ بروئے ہم ریختہ الفاظ شکر و شکوہ و شادی و غم با ہم آمیختہ  
برائے نامہ نگاران دستور اعلیٰ لرحضے ساختہ آید۔

غالب اپنے انداز تحریر کے متعلق فرماتے ہیں:-

چوں کتاب و ادق بہ کف گیرم مکتوب الیہ را بقتے کفر اذ حالت اورست در سر آغا و صوفی  
آواز دہم و نہ مزہ سنا مدعا گردم انقب و آداب و غیرت گوی و عافیت جوئی مشورہ اید  
و نہ چنگان مشورہ ارفع نمند .... لیکن خاطر اندک پڑو ہندہ (میرزا علی بخش خاں) عزیز بود فرمایش  
از مداد گوش بہ دل دریافت۔

گویا اس کتاب کا پہلا اور دوسرا حصہ میرزا علی بخش خاں کی فرمائش پر مرتب ہوئے تھے اور چوتھا حصہ خود میرزا علی بخش خاں نے مرتب کئے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نثرین جمع کر لی تھیں۔ اور سب کو مدون کرنا چاہتا تھا۔ لیکن فرصت نہ مل سکی بلکہ صنی الدین حسن خان بھی ان کی ترتیب پر ہر حصے کے نیز مجھے خیال آیا کہ اگر یہ تمام چیزیں یکجا ہو جائیں گی تو میرزا بیٹا غلام محمد الدین ان سے فائدہ اٹھا سکے گا۔

غدر سے پیشتر پنج آہنگ دو مرتبہ چھپ چکی تھی ایک مرتبہ بادشاہی چھاپہ خانہ میں دوسری مرتبہ منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ میں۔ غالب منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں:-  
پنج آہنگ تمہارے مرلے لی اچھا کیا۔ دو چھاپے ہیں۔ ایک بادشاہی چھاپہ خانہ کا ایک منشی نور الدین کے چھاپہ خانہ کا پہلا ناقص ہے۔ دوسرا سراسر غلط ہے۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:-

لے پنج آہنگ صفحہ ۳۰۰

پچھاپے کی پینچ آئینگیں اب بھی کہتی ہیں اور عیوب یہ دو عیب ہیں۔ ایک تو یہ کہ جو بعد از  
 و نفل از قسمہ تحریر ہوا ہے وہ اس میں نہیں دوسرے کا پی نہیں لے وہ اصل میں میری نظر  
 کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اذرا جی کے مبلغ  
 یہ ہے کہ کوئی صفحہ غلط سے خالی نہیں۔

موجودہ پینچ آئینگیں کے خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشی نوکشور علی آ  
 تھے تو وہ مجموعہ شریف رضی طاعت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

مہر نیروز | بہادر شاہ ثانی کی تیموری خاندان کی تاریخ مرتب کرانے کا ارادہ کیا تھا حکیم احمد  
 خاں واقعات جمع کرتے تھے اور غالب اس خدمت پر مامور ہوئے تھے کہ حکیم صاحب  
 کے فراہم کردہ واقعات کو اپنی بہار آفرین عبارت کا لباس پہنا دیں قلعہ کے ساتھ  
 غالب کے تعلقات ملازمت کا آغاز اسی سے ہوا تھا۔ پوری کتاب کا نام پرتوستان  
 رکھا گیا تھا۔ اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا حصہ اول میں ابتدا سے لے کر ہمایوں  
 بادشاہ کے انتقال تک کے حالات لکھے تھے۔ حصہ دوم میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر  
 بہادر شاہ ثانی تک کے حالات لکھنے کی تجویز تھی لیکن دوسرے حصے کی تسوید بھی شروع نہیں  
 ہوئی تھی کہ خاندان مغلیہ کی بساط پیہی گئی۔ نواب ضیا الدین احمد خاں نے مہر نیروز کی جو  
 تاریخ لکھی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۴ء تا ۱۸۵۵ء  
 میں شائع ہوئی تھی۔

چونکہ مہر نیروز میں "ماہ نیم ماہ" کا بھی ذکر تھا اس لئے شائقین "ماہ نیم ماہ" طلب کرتے  
 رہتے تھے۔ غالب لکھتے ہیں :-

اکثر صاحب اطراف و جوامع "ماہ نیم ماہ" کے بھیجے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کتنا  
 ہوں کہ جب "مہر نیروز" کی عبارت نہیں سمجھ تو "ماہ نیم ماہ" کو لے کر کیا کریں گے۔ جفا  
 مہر نیروز کے دیباچہ میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام پرتوستان ہے اور اس کے

دو جلدیں پہلی جلد میں ابتداء خلقت عالم سے ہایوں کی سلطنت تک کا ذکر۔ دوسرے میں اکبر سے بہادر شاہ تک کی سلطنت کا بیان پہلے حصے کا نام مہر نیرودہ دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ پہلا حصہ چھپا پا گیا۔ باہمی بھیجا گیا۔ قصہ تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا میر مرتضیٰ کا نام و نشان مٹا گیا

”تنبو“ اور ”تنبو“ کے متعلق غالب کے مکتوبات میں سب سے زیادہ ذکر ہے۔ بالخصوص تنقہ، مہر شیونان مالک مطبع مفید غلاق اگر وہ منشی بنی بخش حقیر کے نام کے خطوں میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ کتاب عذر کے دنوں میں عذر کے حالات کے متعلق لکھی گئی تھی اور اس میں التزام کیا تھا کہ عربی کا کوئی لفظ نہ آئے۔ اسے عذر کی مستقل تاریخ نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ اس میں صرف وہ لفظ درج ہیں جو غالب کو دوران سے علاقہ رکھنے والوں کو پیش آئے یا غالب نے وہ خود لکھتے ہوئے اور سنی شہادت کہ یہاں فساد ہوا میں نے اسی دن سے گھر کا دروازہ بند کیا اور آنا جانا منقطع کر دیا۔ شغل زندگی بسر نہیں ہوتی۔ اپنی سرگزشت لکھنی شروع کی جو سنایا وہ بھی فہم سرگزشت لکھا گیا عذر کے بعد وہی میں کوئی مطبع باقی نہیں رہا تھا اس سے غالب ”تنبو“ کو اگر وہ میں چھپوانے کا ارادہ کیا۔ وہ منشی ہر گرو پال کو لکھتے ہیں:-

میں نے آغاز پانچویں مئی ۱۸۵۸ء سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہرہ اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال تحریر لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دس تیر کی عبارت یعنی پانچویں توہم لکھی جاسے۔ اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ اہل اشخاص کے نام نہیں بدلے۔ وہ عربی، انگریزی ہندی جو ہیں لکھ دیئے ہیں۔ مثلاً تھارا نام ہر گرو پال ہے۔ منشی لفظ عربی ہے نہیں لکھا گیا اس کی جگہ شیدائزبان لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقمہ کا ہے یعنی نہ چھدرانہ گنجان اور اق بے سطر پر اس طرح کہ کسی صفحہ میں میں سطر کسی میں یا تیس سطر کسی میں انیس سطر آئے۔ چالیس صفحے یعنی میں درج ہیں۔ اگر کہیں سطر کے سطرے کوئی گنجان لکھے تو



شاید دو جزو میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سنتا ہوں ایک ہے۔ اس میں  
 کاپی نگار خوشنویس نہیں اگر اگرہ میں اس کا چھاپہ ہو سکے تو مجھ کو اطلاع دو۔ اس تیسری  
 اور بے نوائی میں کہیں کامیں بھی خریدار ہو سکتا ہوں لیکن صاحب مطبع اتنے پرکریوں  
 ماننے لگا۔ اور البتہ چاہیے کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ  
 پانسو سات سو چھاپنے کی صورت میں سو اتین آنے چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو  
 ایک ہی ہوگی رہ کاغذ وہ بھی بہت نہ لگے گا لکھائی متن کی تو اب کو معلوم ہوگئی تھی  
 پر البتہ نائن کے معنی لکھے جائیں گے۔ یہ ہر حال اگر ممکن ہو تو اس کا مکمل کرو اور صاحب مطبع  
 کیجئے مجھ کو لکھو۔

نواب انوار الدولہ کو بھی ایک خط میں قریباً اسی مضمون کی اطلاع دی ہے اور لکھتے  
 ہیں کہ پندرہ سطر کے سطر سے چار جزو کی کتاب بنے گی۔ اور مطبع مفید خلاق اگرہ میں جگہ لگائی ہوگی  
 کتاب کا حجم [خالی] ابتدائی خط میں تفتہ کو لکھا تھا کہ اگر کوئی گنجان لکھے گا تو کتاب دو جزو  
 میں آجائے گی۔ لیکن آرزو یہ تھی کہ حجم زیادہ ہو وہ تفتہ کو رقم فرمائے ہیں:-

میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزو میں آجائے میں نے پکھا تھا کہ عبارت

اس قدر ہے کہ دو جزو میں آجائے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔

طباعت میں اہتمام [خالی] کتاب چاہتے تھے کہ کتاب اچھی چھپے۔ اور اس باب میں تفتہ کے  
 علاوہ منشی نبی بخش صاحب حقیر اور میرزا حاتم علی بیگ تھر کو بھی طباعت کے اہتمام میں  
 شریک کر دیا تھا ان کے اپنے الفاظ میں گویا کونسل بنا دی تھی منشی نبی بخش صاحب  
 کے ذمہ کاپی دیکھنے کا کام لگا یا گیا تھا۔ حکام کے لئے چند عمدہ مجلد نسخے مطلوب تھے۔  
 اس لئے جلدوں کے باب میں تفصیلی ہدایات بھیج دی تھیں اور یہ کام منشی حقیر کے  
 صاحبزادے منشی عبداللطیف صاحب کے سپرد کیا تھا۔ اہتمام کا یہ عالم تھا کہ اگر تفتہ کو ایک

بات لکھتے تھے تو وہی بات تہ اور حقیر و نشتی شیونان مالک مطہر کو بھی لکھتے تھے ایک خط میں نقتہ کو ارشاد فرماتے ہیں :-

صاحب کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیا جس میں میری جان اٹھی ہوئی ہے۔ اور میں نے اس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلوتی نہ کرو۔ اور بول تو بہ فرماؤ کاپی کی تصحیح کا ذریعہ بجائی دشتی حقیر کا ہو گیا ہے۔ چہ جلد کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبد اللطیف کا کرو۔ میری طرف سے دیکھو اور کہہ کر میں تمہارا ابو طرحا و دفس چا ہوں تصحیح بھائی اور تزیین تم کرو۔ کہتا ہوں کہ نہیں جانتا تزیین کیوں کر کی جائے سنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حروف پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھج جاتی ہے پھر جلد بھی پر خلعت بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دشتکاری اور مناعی اور ہشاری میرے کس دن کام آئے گی۔

صحافی اور نقاشی | نقتہ نے غالباً لکھا تھا کہ صحافی اور نقاشی اپنے سامنے دہلی میں کرا لیجئے اس کے جواب میں غالب نے لکھا :-

میرزا نقتہ تم بڑے بے درد ہو۔ دلی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں اٹھا۔ بلکہ تم اس کو تباہ جانے ہو۔ یہاں نیچے بند تو نہیں بھات اور نقاش کہاں۔ شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو ضلیف کیوں دیتا میں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ جلدوں کے متعلق پھر فرماتے ہیں :-

یہ عبارت نشتی عبد اللطیف کو چڑھا دو میں تو ان کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجیب ہے۔ دو روپے فی جلد اس سے زیادہ کا عقد و منین۔ جب بچہ کو لکھو گے ہنڈوی بھیج دوں گا چھ روپے آٹھ روپے دس روپے عدا پارہ روپے۔ یہاں کو سمجھا دینا کسی کی طرف نہ کریں چیز اچھی ہو۔

”نیب“ کا نیب | غالبؔ جو مسودہ بھیجا تھا۔ اس کی حمد یہ عبارت میں یہ فقرہ تھا:

آرے خداوند چنانکہ نیست راہستی ده است کمستی پذیرفته رایت ساز نیز تواند بود  
آنکہ ہمہ را دیک دم بہ نوید شو کن (پیدا آورے اگر وہ دم دیگر نہ نیب مباحث (نیت ہو جا)  
ہم نہ! ہرہ کاست کہ انہوں و چرا دم نہ۔

”نیب“ عربی لفظ تھا۔ غالبؔ مسودہ بھیجنے کے بعد اس پر مطلع ہوئے تو ان کے  
دل میں اس غلطی پر بڑا اضطراب پیدا ہوا انہوں نے فوراً ”نیب“ کی جگہ ”نوا“ کا لفظ بنایا اور  
لکھا کہ کاپی میں اسی طرح درستی کر دی جائے۔ نقتہ کو لکھتے ہیں :-

میں تشریف لائے کہ آج صبح لکھ چکا ہوں تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اول  
یہ حمد ہے۔ اگر وہ دم دیگر نیب مباحث ”نیب“ کی جگہ ”نوا“ بنا دیا جائے ”نیب“  
لفظ عربی ہے۔ اگر وہ جائے تھا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیسرا چوتھی ترک سے  
”نیب“ کا لفظ چھینا جائے اور اسی جگہ ”نوا“ لکھ دیا جائے۔

”نقتہ“ نے غالبؔ کو لکھا تھا یا غالبؔ نے ”نقتہ“ کی تحریر سے سمجھا تھا کہ ”نیب“ ”نوا“ کے ورق  
چھپ چکے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

نیب والے دو ورق چار سوہوں پان سوہوں سب بدلواؤں انا۔ کاغذ کا جو نقصان  
ہو مجھ سے مانگو اپنا۔ اس لفظ کے رہ جانے سے ساری کتاب نکلی ہو جائے گی۔ اور  
میرے کمال کو دھبہ لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے۔ ہر چند مسودہ میں بنا دیا تھا۔ لیکن  
کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

پھر فرماتے ہیں :-

”نیب“ کے نیب سے مرا جاتا ہوں اس کی درستی کی خبر بھیجو۔

مزید ہدایات | مزید ہدایات دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

واللہ بے مبالغہ کہتا ہوں کہ بھائی منشی بنی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر حیاتاً

اصل نسخہ میں سہو کا تب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اس کو بھی صحیح کر دیں گے۔۔۔۔۔ خدا  
 کرے انجام تک یہی قلم یہی خط اور یہی طرز تصحیح چلا جائے۔ جدول مطبوعہ پہلے صفحے  
 کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خفا جا۔ ہے تو دل پسند اور نظر خریب ہوگی کاغذ  
 کے باب میں یہ عرض ہے کہ فریخ کاغذ چھوٹا ہے۔ چھ جلدیں جو نذر رکھا ہیں وہ اس کاغذ پر  
 ہوں اور باقی چارہ شیورام پوری اور چارہ ہونیلے کاغذ پر چھاپو۔ اور یہ بات کہ وہ جلدیں  
 جو ولایت جانے والی ہیں وہ اس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری یا  
 نیلے کاغذ پر چھپتے محض ہے دہاں کے حاکموں نے کہا ہے کہ ان کی نذر کی کتابیں اچھے  
 کاغذ پر ہوں مگر جو ایسا ہی صرف اور خراج زائد پڑتا ہو تو فیروزہ جلدیں اس کاغذ پر اور  
 چارہ جلدیں شیورام پوری پر ہوں باقی جلدوں میں تمہیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب اگر ہونے  
 تو کاجی کی سیاہی دلا دیا وہ اور خشنود ہوا اور آخر تک رنگ نہ بدے۔

جلدوں کی آرائش | معامہ ہوتا ہے کہ مرزا تبر نے جلدوں کی آرائش کا نقشہ غالب کے پاس بھیجا  
 تھا۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں :-

سبحان اللہ جلدوں کی آرائش کے باب میں کیا اچھی فکر کی ہے۔ میرے دل میں بھی  
 ایسی ہی ایسی باتیں تھیں یقین ہے کہ متعلق شاہوار ہو جائے گی اگر مرہ اگر ہو جائے تو  
 حرف خوب چمک جائیں گے۔ اس کا خیال ان چار جلدوں میں ہے مہی بارہ روپے  
 کی ہنڈوی پہنچنے ہی روپیہ وصول کر کے مجھے اطلاع دیجئے گا ورنہ میں مشورہ رہوں گا۔

ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ | نمائندے اس دوران میں ملکہ وکٹوریہ کی طرح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا پہلے  
 ان کا خیال تھا کہ قصیدہ علیحدہ ملکہ کی خدمت میں بھیجا جاوے اور کتاب علیحدہ جائے پھر پرنیال  
 ہو کہ قصیدہ بھی کتاب کے ساتھ چھپنا چاہئے۔ میرزا مہر کو لکھتے ہیں :-

میں نے خدمت ملکہ منظرہ نگار کی طرح میں ایک قصیدہ ان دنوں میں لکھا ہے مثلاً  
 برہنیت فتح و عملداری شایعہ سب سے منظور یہ تھا کہ کتاب کے ساتھ قصیدہ

ایک اور کاغذ تہ پر لکھ کر بھجوں پھر خیال آیا کہ دس سطر کے مسطر پر کتاب لکھی  
گئی ہے یعنی چھاپا ہوئی ہے یہ چھ صفحے یعنی تین ورق اور چھپ کر اس کتاب کے آغاز  
میں شامل جلد ہو جائیں تو بات اچھی ہے آپ اور منشی بنی بخش اور میرزا آقے خاں  
سے کہہ کر اس کا طور درست کریں پھر مجھ کو اطلاع دیں تو میں مردہ آپ کے پاس پہنچ دوں  
میرزا قمر نے غالباً لکھا تھا کہ کیا اسے نشر کا دیباچہ بنا دیا جائے؟ اس کے جواب  
میں فرماتے ہیں :-

قصیدہ کا نشر سے پہلے لکھنا ازراہ کرام و اعزاز ہے ورنہ نشر میں اوجسنت اور  
نظم میں اور انداز ہے یہ اس کا دیباچہ کیوں ہو؟ بلکہ صورت ان دونوں کے اجمال  
کی یوں ہو کہ سرشتہ آمیزش توڑ دیا جائے اور قصیدہ اور دستنبو کے بیچ میں ایک  
ورق سادہ چھوڑ دیا جائے۔

مسدود ورق | منشی شیو زائن مالک مطبع نے اسی زمانے میں غالب کو خط لکھا تھا جس کے  
لغافہ پر نام کی جگہ میرزا نوشہ صاحب نائب مرقوم تھا۔ غالب اس پر بہت پریشان ہوئے  
اور ڈرے کہ کہیں کتاب کے مسدود ورق پر یہی نہ چھاپ دیں۔ تقصیر کو لکھتے ہیں :-

آیا بیچ آجنگ پائہ نمبر و زچھاپے کی کوئی کتاب اس شہر میں (اگر کہ میں انہیں پہنچی۔  
جو وہ منشی شیو زائن) میرزا نام دیکھ لیتے؛ صرف اپنی نفرت عرصے و جاس و اویلا کی نہیں  
ہے۔ بلکہ سبب یہ ہے کہ وہی کے حکام کو تو عرف علوم ہے مگر حکایت ولایت تک و ذرا  
کے محکمے میں اور ملکہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عیب کو نہیں جانتا، اگر صاحب مطبع  
بے "میرزا نوشہ صاحب غالب" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا۔ کھویا گیا میری محنت و انکسار  
گئی۔ کتاب اور کی ہو گئی۔

کتاب کا اشتہار | غالب کو کتاب کے اشتہار کا بھی خاص خیال تھا لکھتے ہیں :-

ہمارے منشی شیو زائن صاحب اپنے منہ کے اخبار میں اس کتاب کا اشتہار کیوں

نہیں چھاپتے تاکہ درخواستیں خریداری کی فراہم ہو جائیں؟

کتاب کے مصارف | اہل دور کے ایک رائے امید سنگھ تھے جنہوں نے "دستبنو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ صرف پچیس جلدیں انہیں دی جائیں بقیہ جلدیں غالب اپنی خوشی کے مطابق اپنے دوستوں میں تقسیم فرمائیں یہی خریداری حقیقت میں "دستبنو" کی عبت کا ذریعہ بنی تھی۔ غالب کے مکاتیب میں "دستبنو" کے سلسلے میں رائے امید سنگھ کا نام بار بار آیا ہے مثلاً میر حسن کی لکھتے ہیں :-

میاں کیا باتیں کرتے ہو میں کتابیں کہاں سے چھپو ڈنا۔ ررٹی کھانے کو نہیں شرب پینے کو نہیں..... منشی امید سنگھ اندر واسے دلی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھی ایک دوست ان کو میرے گھر لے گیا۔ انہوں نے وہ نسخہ دیکھا چھپوانے کا قصد کیا اگر وہ میرا شاگرد رشید منشی ہرگوپال تفتہ تھا اس کو میں نے لکھا۔ اس نے اس اہتمام کو اپنے ذمہ لیا مسودہ بھیجا گیا آٹھ آنے قیمت ٹھہری پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لے لیں پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریق ہنڈوی بھجوا دیئے۔ صاحب مطبع نے بشمول سوا منشی ہرگوپال تفتہ چھاپنا شروع کیا۔ اگر وہ کے حکام کو دکھایا۔ اجازت چاہتے ہے۔ حکام نے بہ کمال خوشی اجازت دے دی۔ پانسو جلد چھاپی باقی ہے۔ اس پچاس جلد میں سے پچیس جلد منشی امید سنگھ مجھ کو دیں گے میں عزیزوں میں بانٹ دوں گا۔

ممانعت طبع کا اعلان | غالب کو کتاب کے حقوق محفوظ کرنے کا بھی بڑا خیال تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں خاتمہ کتاب پر ممانعت طبع کا اعلان لکھ دیا جائے۔ پھر تفتہ اور شیوڑاس کی وائس پر انہوں نے خود یہ عبارت تجویز کر بھیجی۔

نامہ نگار غالب خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ میری سرگزشت کی داستان ہے اس کو میں نے مطبع مفید علاقہ میں چھپوا لیا ہے اور میری کتابیں اس کا قاعدہ یہ قرار پایا ہے کہ اور مطبع مطبع جیت تک مجھ سے طلب نصرت نہ کریں اپنے مطبع میں چھاپنے کی جرأت نہ کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اسے اُمید نگہ نے شروع میں غالب کو پچیس جلدیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ بعد میں کہہ کر غالب چالیس جلدیں لے لیں چنانچہ غالب نقتہ کو لکھتے ہیں :-  
کل جمعہ کے دن ۱۲ نومبر ۱۸۵۸ء کو ۳۳ جلدیں بھیجی ہوئی پر خود ایشیوز ان کی پہچان  
سات کتابیں جو میرزا عاقل علی بیگ صاحب کی تحویل میں ہیں۔ وہ بھی یقین ہے کہ کل  
پہنچ جائیں۔

منقش و مجلد نسخے | میرزا مہر نے صحافی اور نقاشی کے لئے جو کتابیں رکھ لی تھیں وہ پہنچیں غالب  
بہت خوش ہوتے۔ فرماتے ہیں :-

بھائی جان کل جو جبر و زور مبارک و سعید تھا۔ گویا میرے حق میں روز عید تھا۔ وقت شام ۵

سات جلدوں کا پارسل پہنچا

واہ کیا خوب محفل پہنچا

..... میری آرزو ایسی رہی کہ وہ برتاؤ ہم و خیال ہے یہ بتاؤ تو میرے تصور میں بھی

نہیں گزرتا تھا۔ میں تو صرف اس قدر خیال کرتا تھا کہ جلدیں بندھی ہوئی دو کی پوچھیں

اور پانچ روپے۔ یا قسم کی ہوں گی وائے اگر تصور میں بھی گزرتا ہو کہ کتابیں اس قدر کم ہوں گی۔

بُستِ بکریاں کی | اب ہر حال غالب نے "دستبنو" کی جلدیں حکام میں اور دوستوں میں تقسیم کیں۔ ایک

مکتوبے جو اپریل ۱۸۵۹ء کا مرقوم ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک "دستبنو" کا پورا ایڈیشن

ختم ہو چکا تھا۔ غالب نے فنی شیوز ان سے یہ بھی پوچھا کہ "دستبنو" زیادہ تر کن لوگوں نے خریدی

اور خود ہی اسے ظاہر کی تھی کہ یا تو انگریزوں نے خریدی ہوگی یا بنگال کے رہنے والوں نے

فنی شیوز ان نے جب اطلاع دی کہ لاہور کے ضلع میں زیادہ بکی۔ تو غالب نے لکھا۔

میرا بھی یہی گمان تھا کہ لاہور کے ضلع میں گئی ہوں گی۔

پنج آہنگ، مہر نیوز اور "دستبنو" تینوں کا مجموعہ اس وقت کلیاتِ شرفا سی ہے۔

جس کا تیسرا ایڈیشن نو کشور کے مطبع نے ۱۸۸۸ء میں شائع کیا تھا۔ غالب اس کے بعد کوئی

ایڈیشن نہیں چھپا۔

”قاطع برٹن“ اور عرض کیا جا چکا ہے کہ غدر کے دنوں میں غالب خانہ نشین ہو گئے تھے اس ہنگامہ کے فرو ہونے کے بعد شہر والوں بالخصوص مسلمانوں پر مدت تک جو سختیاں اور آفتیں مسلط رہیں ان کا نقشہ بھی غدر کے باب میں پیش کیا جا چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں غالب دوستوں سے عموماً منقطع تھے۔ اور زیادہ وقت تنہائی میں گزارتے تھے۔ وہ کچھ مدت تک ”وستاندگی“ کی ترتیب میں مصروف رہے۔ اس سے فراغت پائی تو مطالعہ کے سہو وقت گزارا کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان کے پاس صرف ”برٹن قاطع“ تھی جو فارسی لغات کی ایک مشہور کتاب ہے۔ اس کے مولف محمد حسین ہیں۔ جو تبریزی مشہور ہیں۔ اس لئے کہ ان کے آبا و اجداد تبریز سے ہندوستان آئے تھے لیکن وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور وہاں ان کی ساری عمر گزری۔ اسی وجہ سے غالب ان کو جابجا کہتی ہیں:۔

ہر گاہ غم تنہائی دور آور دے ”قاطع“ را نگار منہ چل آں سفید نہ گفتار دے تلوار

داشت دردم را از راهے برد من آئین آموذ نگاری دہنم بر پیر و ان خودم دل سوخت

جادہ نمایاں ساختہ تابی را ہمہ بنوید۔

غالب نے اپنی کتاب کا نام ”قاطع برٹن“ رکھا اور یہ ۱۲۷۱ھ (مطابق ۱۸۶۷ء) میں مکمل ہوئی۔ وہ خود فرماتے ہیں:۔

یافت چوں گوشتال زیں تحریر آہنگہ ”برٹن قاطع“ نام است

شد ستمے ”قاطع برٹن“ درس الفاظ سال تمام است

اُردو کے ایک خط میں غدر کا ذکر کرتے ہوئے صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:

اس واسطہ کی کے دنوں میں چھاپے کی ”برٹن قاطع“ میرے پاس تھی۔ اس کو میں دیکھا

کرتا تھا۔ ہزار لغت غلط۔ ہزار بیان لغو، عبارت پوچ، اشارت پاور ہوا میں نے سو

سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور ”قاطع برٹن“ اس کا نام رکھا ہے چھپوانے



کا مقدور نہ تھا۔ مسودہ کا قصبے صاف کروالیا ہے اگر کو تو بہ سبیل ستار بھیج دوں۔ ہم اور  
چودھری صاحب جو اس شخص شناس اور منصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے  
پاس پہنچ جائے۔

تقاطع کی طباعت [تقاطع برطان ۱۲۷۶ء میں مکمل ہوئی۔ لیکن ۱۲۷۷ء میں چھپی ایک خط سے معلوم  
ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں بہادر والی رام پور نے "تقاطع" کی طباعت کے لئے دوسو  
روپے مرحمت فرمائے تھے۔ لیکن "تقاطع برطان" کے خاتمہ پر خود غالب نے بہ طور تقریظ جو عبارت  
لکھی تھی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب منشی نوکشور کی توجہ اور مہربانی سے چھپی تھی :-  
اگر اس جو امر و بیل و دل بہترین شیرازہ اوراق پریشان نہ ہوا نہ تھے۔ کا مذ مسودات تقاطع  
برطان کیا یا نگہ کر دے وہ باب آغشتہ فرو کو فتنے یا سرمہ فروش خریدے تا جگہ ہا سناختے۔  
یہ ہر حال تقاطع برطان ۱۲۷۳ء (مطابق ۱۸۶۲ء) میں نوکشور کے مطبع میں چھپی اور  
ایک روپیہ قیمت قرار پائی غالب اسب مجروح کو لکھتے ہیں :-

"تقاطع برطان" کا چھپا پہ ختم ہوا۔ ایک جلد بہ طریق نمونہ آگئی میں نے پچاس جلدوں کی درخواست  
پہلے سے دے رکھی ہے۔ اب پچاس روپے بھیجوں تو ان پچاس جلدیں منگواؤں۔ دیکھتے  
نومن تیل کب میسر آئے اور ادھاکب مانچے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نواب یوسف علی خاں جو دوسو روپے بہ سلسلہ طباعت  
تقاطع برطان بھیجے تھے وہ دوسری ضروریات میں صرف بچکے تھے کتاب منشی نوکشور نے  
پچھاپ دی اور غالب کو پچاس جلدیں خریدنے کے لئے روپیہ کے متعلق تشویش ہوئی۔  
تقاطع کی مخالفت کا طوفان | ہندوستان کے عام فارسی دانوں کے متعلق غالب کی رائے  
نے ان کے خلاف کھلتے میں جو ہنگامہ برپا کیا تھا۔ وہ تقاطع برطان کی اشاعت پر زیادہ  
شدت، زیادہ تندی اور زیادہ وسعت کے ساتھ دوبارہ ابل پڑا۔ اور غالب کو تا دم نہ

اس سے نجات نہ ملی۔ خواجہ حاکمی نے باطل صحیح لکھا ہے کہ تنقید نہ محض مذہب میں بلکہ ہر فن ہر کام اور ہر چیز میں اس درجہ ضروری ہو گئی ہے کہ تحقیق کا خیال نہ خود کسی کے دل میں خطا کرتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو اس قابل سمجھا جاتا ہے کہ وہ سلف کے خلاف کوئی بات برائے پر لائے، چنانچہ قاطع برہان کے شائع ہوتے ہی جاد خیال مقلدوں کے لشکر عاجباً غائب کے خلاف جوش میں آتے کسی کے سامنے یہ بات نہ تھی کہ غائب نے کیا لکھا ہے اور تحقیق کرنا چاہئے کہ اس کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ سب کے جوش مخالفت کا محرک محض یہ امر تھا کہ غائب کو صاحب برہان قاطع کے خلاف زبان کشا ہونے کی جرأت کیوں کی ہوئی؟ اس سلسلے میں غریب غائب کو چھوٹے پیانے پر وہ تمام باتیں اور افہامیں بروہت کرنی پڑیں جو تقلید و جمود کے عام راستے سے انک ہو کر ہر چلنے والے کو ہر دور ہر عہد اور ہر دھارے میں ہمیشہ پیش آتی رہی ہیں۔

قاطع کی داد کے لئے پانچ | غائب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جس شخص میں پانچ باتیں ہوں گی۔ وہ قاطع برہان اور صاف کی ضرورت کی داد دے گا۔ ورنہ عام آدمی محض برہان قاطع کے نام پر جانیں قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ پانچ باتیں یہ ہیں :-

(۱) وہ عالم ہو۔

(۲) فن لغت کو جانتا ہو۔

(۳) فارسی زبان کا کافی علم رکھتا ہو اور اس زبان سے اسے لگاؤ ہو۔ اساتذہ سلف

کا کافی کلام دیکھ چکا ہو اور اسے کچھ یاد بھی ہو

(۴) تصنیف مزاج ہو بہت و صرم نہ ہو

(۵) طبع سلیم اور ذہن تقسیم رکھتا ہو صبح الذہن اور کج فہم نہ ہو۔

خالفین کے ایادوات | قاطع برہان کے چھپتے ہوئے مخالفت کا جو منہ گامہ بپا ہوا تھا۔ اس کا نقشہ

۱۰ یاد نگار غائب صفحہ ۴۴۰۔

غالب ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں :-

معقدان بران قاطع برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ہنر  
دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قاطع بران نامط ہے۔ یعنی حریک خلاف قاعدہ  
ہے بران قاطع نہیں ہو سکتی۔ لو صاحب بران قاطع صحیح اور قاطع بران نامط بران  
قطع کی حامل ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ قبول نہیں کرتی۔ قاطع بران میں جو بران کا  
لفظ ہے مخفف بران قاطع ہے۔ بران قاطع کے رو کو قطع سمجھ کر قاطع بران نام رکھا تو کیا  
گناہ ہوا۔ دوسرا ایراد یہ ہے کہ باغشیاں ستیزے جا۔ انگلش کا وزن لفظ میں نہیں آتا  
چوتھا ہوں خدا کے واسطے انگلش اور انگریز کا وزن یہ اعلان کہاں ہے۔ اگر ہے بھی تو ضرور  
شعر کے واسطے لغات عربی میں سکون و حرکت کو بدل دیتے ہیں۔ اگر انگلش کے وزن کو غنہ  
کہ دیا تو کیا گناہ ہوا۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :-

قاطع بران کا لکھنا کیا ہے گویا باسی کڑھی میں آیا ہے لکھنا کیا ہے کہ سام ملات  
کا ردف ہوا کہ یہ تنک مایہ معارض کا بر سلف ہوا۔ ایک صاحب فرماتے ہیں کہ قاطع بران  
کی ترکیب غلط ہے۔ عرض کرتا ہوں کہ حضرت بران قاطع اور قاطع بران کی ایک غلطی  
ہے۔ بران قاطع نے کیا لکھا، نغیر، میں سمجھ قطع کیا ہے جو اپنے اس کو قاطع کا لقب  
دیا ہے۔ بران جب تک غیر کے کسی بران کو قطع نہ کرے کیوں کہ بران قاطع کا نام پانچویں  
بران قاطع کی صحت میں جتنی تقریر کیجئے گا وہ قاطع بران کی صحت ہونے کے کام آئے گی۔

لے ناکسے قاطع بران کے آغاز میں ترتیب کتاب کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے غدر کے ذکر میں ایک

فصل لکھا تھا جس کے ایک مصرعہ پر محول بالا اعتراض ہوا قطع یہ ہے :-

چوں کہ دسپاہ ہند در ہند      با انگشیاں ستیزے جا  
تاریخ و وقیع ایں وقائع      واقع شدہ رستخیزے جا

خائف و موافق کہتا ہیں "قاطع برہان" کی مخالفت میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کی فہرست میری تحقیقات کے مطابق یہ ہے۔

(۱) "ساطع برہان" مولفہ میرزا وحید بیگ

(۲) "قاطع القاطع" مولفہ مولوی امین الدین پٹیالوی۔

(۳) "محقق قاطع" مولفہ سعادت علی

(۴) "مؤید برہان" مولفہ مولوی آغا احمد علی

(۵) "شمس تیز" مولفہ مولوی عبد الصمد سیٹھی۔

غائب نے اور غائب کے دوستوں اور مولودوں نے جواب میں جو رسالے لکھے ان کے

نام یہ ہیں۔

(۱) "مطالعہ غیبی" مولفہ میاں داود خاں سیاح جس پر غائب نے سیاح کو "سلف" لکھی "مطالعہ غیبی"

(۲) "دافع ہدایاں" مولفہ مولوی نجف علی صاحب۔

(۳) "سولات عبد الکريم" جس کے مولف غائب عبد الکريم صاحب نامی کوئی شخص تھے۔

(۴) "تائید غائب" مولفہ غائب

(۵) "تین تیز" مولفہ غائب

ان میں سے "ساطع برہان"، "محقق قاطع"، "دافع ہدایاں" اور "سولات عبد الکريم" کا کوئی

نسخہ مجھے کہیں سے نہیں مل سکا مولانا محمد شفیع صاحب پرنسپل اور ٹیل کالج لاہور سے ایک نسخہ

شنا تھا کہ لندن میں پرائی کتابوں کے ایک تاجر کے پاس یہ سارا مجموعہ موجود تھا۔

غائب کے مسکاتیب میں ان کتابوں کا جہاں جہاں ذکر ہے اسے ذیل میں قتباً

پیش کرتا ہوں جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان کی مختصر سی کیفیت بھی عرض کرتا جاؤں گا

تین تیز میں جو کچھ لکھا ہے اسے الگ بیان کروں گا۔

محقق قاطع | محقق قاطع کے متعلق منشی حبیب اللہ خاں ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:-

۱۱۱ محرق قاطع کا تہا سے پاس پہنچا

کاسے کہ خواہم ز غاضب میرم

میں اس مخرانات کا جواب کیا لکھتا، نگراں سخن فہم دوستوں کو غصہ آگیا۔ ایک صاحب نے  
نارسی میں اس کے عیوب ظاہر کئے اور طالب علموں نے اردو میں دور رساے جدا جدا لکھے

دانا ہوا اور منصف ہو۔ محرق کو دیکھ کر جانے کے کہ تولف اس کا حق ہے اور جب وہ حق  
”دافع ہدیان“، ”رسولات عبد الکریم“ اور ”لطائف غیبی“ کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا۔ اور محرق کو درود  
تر معلوم ہوا کہ بے حیاجی ہے۔ ”دافع ہدیان“، ”رسولات“، ”لطائف غیبی“ تینوں نسخے ایک

میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوئے ہیں۔ یقیناً ہے کہ بقدریم قادیانہ روز نظر افرے گزریں

یہ خط ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”محرَق قاطع“ اور اس کے

جوابی رسائل ۱۲۶۲ھ میں لکھے گئے تھے۔

تولف دافع ہدیان | نوکارت نے غالب کے خط میں ایک خط مولوی نجف علی صاحب تولف دافع ہدیان  
کے نام مخرِف کیا تھا۔ اس پر دیکھا کو لکھتے ہیں :-

اے صاحب خط ویر وزہ کے ساتھ ایک خط مولوی نجف علی صاحب کے نام کا مع اس  
حکم کے کہ اس کو مولوی صاحب پاس پہنچاؤں میں نے پایا۔ حال یہ ہے کہ مولوی  
صاحب میری ملاقات نہیں۔ صرف اتحاد معنوی کے اقتضائے دافع ہدیان لکھ کر انہوں نے  
نسخہ میں مجھ کو دوی ہے۔ منشی گوہر دیکھ دہلوی ایک ان کے شاگرد اور میرے آشنا  
ہیں۔ ان کو یہ خط بجنہ بھیج دیا یقیناً ہے کہ وہ مولوی نجف علی صاحب کو بھجوا دیں گے انہی کے  
اظہار سے دریافت ہوا ہے کہ مولوی صاحب مرشد آباد بنگال میں ہیں۔ تو اب انہیں نے ذکر کرنا

تولف ساطع بران | میرزا جیم بیگ مصنف ”ساطع بران“ کے متعلق لکھتے ہیں :-

رحیم بیگ کا اصل وطن سرودھنہ ہے اور فی الحال میرٹھ میں مقیم اور سلی اس کا پیشہ ہے  
وہ آٹھ دس برس سے اندھا نظر میں مولوی بخش صاحبانی کا شاگرد و غلامی شکر کرتا ہے۔

سیاح کو لکھتے ہیں:

وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے وہ ایک لڑکے پڑھنے والے ملائے  
مکتب دار کا خط ہے۔۔۔ رحیم بیگ اس کا نام میرٹھ کا رہنے والا کٹی برس سے اندھا  
ہو گیا ہے۔ باوجود نابینائی کے حق بھی ہے۔ اس کی تحریر میں نے دیکھی۔ تم کو بھی بھیجاؤ گا  
مگر ایک بڑے مزے کی بات ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں جن کو لطائف غیبی میں  
رد کر چکے ہو۔ بہر حال اب اس کے جواب میں فکر نہ کرنا۔

یہ خط ۱۱ ستمبر ۱۸۶۵ء کا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شائع برائے "لطائف غیبی"  
اور ذائق ہدیاء وغیرہ کے بعد چھپی تھی۔ اور اغلب یہی ہے کہ ۱۸۶۵ء کے ابتدائی حصہ  
میں طبع ہوئی ہو۔

مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:-

تادمہ غائب تھا مکتوب امیر رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے  
اندھا ہو گیا ہے۔ کتاب پڑھ نہیں سکتا۔ سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا۔ لکھوا دیتا ہے  
بلکہ اس کے ہم وطن کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا اور دل سے مدد لیتا ہے۔ اہل  
دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صاحبائی سے اس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار پڑھانے کو  
اپنے کو ان کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وائے اس بیچ پوچھ چس کو صاحبائی کا تلمذ  
موجب غرور و تناد ہو۔

تقاطع القاطع [تقاطع القاطع مولوی امین الدین پٹیلوی نے لکھی تھی اور ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں چھپی تھی۔ اس کی طباعت کا مصرعہ تاریخ یہ ہے ع

شمسہ آبدار زبان امین دین

اور جو اقتباسات پیش کئے جا چکے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ واقع ہدیاء مولوی  
سجف علی صاحب نے فارسی میں لکھی تھی۔ اور "لطائف غیبی" سیاح نے اردو میں سرتب کی تھی۔

تطائف غیبی" غالب نے خود نہیں چھپوائی تھی۔ بلکہ صاحب مطبع نے چھاپی تھی غالب فرماتے ہیں :-

میں نے اپنے ذر سے "تطائف غیبی" کی جلدیں نہیں چھپوائیں۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں۔

یہ خط پنجم شعبان ۱۲۸۱ھ کا ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ "تطائف غیبی" ۱۸۶۶ء میں چھپی تھی۔ اس کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ ایک خط میں غالب فرماتے ہیں :-  
 "تطائف غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بیچ کر ملگائیں۔۔۔۔۔ یہ جو ہیں سیف الحق کا خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے لڑکھو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے لطف کی تلوار تمہارے لڑکھ سے چلتی رہے گی۔ تطائف غیبی نے نہ ہوا کی دھجیاں اڑا دیں۔

کتاب غالب کی تصنیف تھی "تطائف غیبی" چالیس صفحے کا ایک رسالہ تھا جو اکل المطبع میں چھپا تھا۔ سرورق پر یہ عبارت مرقوم ہے :-

ایں نسخہ کہ بہت رشک انگ  
 سر شگ بودہ اے خرچک  
 مست ایزد کہ نتیجہ نیک محقق مدق سیال دعاں سیاح لجنات سیف الحق تہی ایں نسخہ شگرت کے برطائف غیبی  
 بجواب محرق قاطع بران پصحت تمام و سعی مالا کلام غنیں بار بہ اینہام میر فرخ الدین دکن لکھنؤ  
 دہلی طراز انطبوع پذیرفت۔

رسالہ امد و میں ہے۔ اور اس میں مختلف اعتراضات کا جواب میں لطیفوں کی صورت میں دیا گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچی ہوں کہ اصل رسالہ یا تو کمالا غالب کا اپنا تصنیف کردہ ہے یا سیاح کی عبارت میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ اسے غالب ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے۔ اس لئے کہ عبارت کی روانی اور اعتراضات کی شوخی میں غالب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سیاح اس انداز کی عبارت نہیں لکھ سکتے تھے اور ان کی سیر

سیلح جو غالباً ۱۸۷۲ء میں چھپی تھی اس امر کی گواہ ہے کہ ان کا انداز تحریر لطائف غیبی سے بال مختلف تھا۔

مثلاً منشی سعادت علی صاحب جامع محرق کی نسبت ارشاد ہوتا ہے :-  
کوئی شخص ہے رعایائے دہلی میں سے کہ کبھی کسی زمانے میں کسی حکمہ نگیزی کا سرشتہ ہو گیا تھا۔ اور اب غاندیشین ہے، موسم بہ منشی سعادت علی نہ نثر سے واقف نہ نظم سے آگاہ، عقل کا سرمایہ نہ علم کی دستگاہ کسی نگاہوں میں کسی سببی میں کسی گھاٹ پر کسی باٹ پر اس بزرگ کا نام کسی سے نہیں سنا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے :-  
اہل نظر قاطع و محرق گواہ ہم دیکھیں گے تو قاطع کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی اور محرق کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی۔ ہمارے منشی صاحب اندوے علم و فن منشی نہیں ہیں از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں جیسے منشی بھیروں ناٹھ اور منشی گنڈال لطیفہ دوم میں فرماتے ہیں :-

اے صاحبانِ فہم و انصاف عبارت محرق قاطع برطان کو دیکھا چاہیے غلط بحث اٹھانے  
نمل رسو ترکیب تباہی روزمرہ، غلطی فہم۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں۔ بھلا غامیان <sup>الذین</sup> سوچ  
کی نثر و کسی ہوگی، خالصاً اللہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پھلڑ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک  
دیجڑا تانیدان بجا کر گایاں دیتا ہے یا ایک مٹری کو کسی نے چھڑ دیا ہے وہ غش بک رہا ہے۔

کتاب میں بعض مطالب ایسے آئے ہیں جن کے متعلق صحیح و قیض صرف غالب ہی کو ہوتی تھی۔ مثلاً منشی سعادت علی نے ایک موقع پر لکھا تھا یا محرق میں چھپ گیا تھا۔  
سنن میں قدر قلم راجہ رسو و اس کے جواب میں لطائف غیبی منظر ہے کہ قلم کے واسطے فرسودہ  
ہوتا ہے۔ نہ کہ سو دن، ایک دوست نے کہا۔

منشی جی نے خفا ہو کر قلم کو سرسہ کی مانند پس ڈالا ہوگا میں نے کہا کہ سن کی خبر ہو دیکھلا



اس کی کوئی وجہ اور تاویل کر دو سو دم کی جگہ سو دم کے کیا معنی؟ اس ظریف نے کہا کہ سو دم میں  
 ”دم“ کی صورت پائی جاتی ہے اور نشی جی ہے ”دم“ ہیں۔ بن جو حرف متکلم کا ہے۔ یہ دم کے  
 ساتھ آتا تو خدا نوحہ نشی جی دہا رہن جاتے۔

اس کے بعد لطیفہ لکھتے ہیں کہ

شاہ عباس ثانی پادشاہ ایران کے عہد میں حکیم شفا فی اصفہانی بڑا شیخہ بیان اور ہمدان  
 شاعر تھا۔ مومن خان یزدباشی میں اور اس میں عدوت پیدا ہوئی حکیم شفا فی نے اس کی جوچیا  
 لکھیں اذ بخلا ایک ترکیب بند نے بڑی شہرت پائی اور قبول طبع خاص دعام ہوا سپہ  
 بند کے دو شعر یہ ہیں

مومن ملہم بازی چملاں بہ کجارت پا کاری صد در صد کرماں بہ کجارت

اں گا دوم از سینہ بول سنہ کوئے بڑ جدت بہ در خانہ یاراں بہ کجارت

الراطہ داوا باش اصفہان ہر رہ گزریں دف و چنگ کے ساتھ اس ترکیب بند کو نکاتے پھر  
 تھے۔ مومن خان اُن کو تھما ہوتا تھا۔ مگر اس طائفہ کے نام دنگ سے کیا کہہ سکتا تھا ناچا  
 اپنے گھر بچہ۔ داما دور و روزہ بند کر لیا۔ اس جماعت نے اس کے در دولت پر شہود  
 سے گانا بجانا شروع کیا۔ پایاں کار مومن خان اپنے پیٹ میں چھری مار کر مر گیا میں ٹپنا  
 ہوں نشی جی بھی ان لطائف کو دیکھ کر کہیں اپنے کو ہلاک نہ کریں۔ اس بزدل نے فرمایا  
 کہ سیاں داو خاں یہ کام ہے۔ فیرت داووں ٹافٹی جی کی طرف یہ احتمال بیجا ہے

غرض میری رائے میں یہ کتاب غالب کی اپنی تصنیف کر وہ ہے۔ اگرچہ میاں داو خاں  
 سیرج کے نام سے چھپی۔

”نامہ غالب“ نامہ غالب غالب نے خود چھپوایا تھا۔ وہ فرماتے ہیں :-

”نامہ غالب“ صاحب طبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپے جو میں مول کے کر

بھجوں اور تم سے ان کی قیمت مانگ لوں۔ میں نے آپ تین سو جلد چھپوائی دوستوں کو

دور و نزدیک بانٹ دی۔ آج یک شنبہ ہے پائل روانہ نہ ہوگا جتنے یہ نسخے میرے پاس ہیں کل تہین بچاؤں گا۔

یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہے۔ ظاہر ہے کہ نامہ غالب ۱۸۶۵ء ہی میں چھاپا گیا ہوگا۔ رسالہ ہندوستانی بابت جنوری ۱۹۳۴ء (صفحہ ۱۰۶) سے معلوم ہوتا ہے کہ نامہ غالب ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۵ء و ۱۱ اکتوبر ۱۸۶۵ء میں بھی شائع ہوا تھا ایڈیٹر نے اس پر جو تمہیدی عبارت لکھی تھی وہ ذیل میں درج ہے:-

غالب مدوح (غالب) نے ایک کتاب قاطع برطان میں اکثریات و محاورات کے متعلق استقلال کی تصحیح اور غلط کتاب "برطان" کی یہ عبارت دلچسپ اصلاح فرمائی۔ اس پر بعض حدود کو تہ اندیش نے یہ تقضائے کور باطنی چلی اور نیز یہ امید اس کے کہ ایسے کمال الفن طوطی ہرگز متقاضی میں کچھ تھوڑی چیں چیں کر کے عوام کا الانعام کی نظروں میں کسی طرح سرخروئی حاصل کریں بجائے داد کے بیدار کیا کہ تو بد بکلام بلاغت نظام میں محنت بجا اٹھائی مگر لطیف لطیف میاں داد نماں صاحب سیاح نہیں یہ غلام بلا صاحب رئیس سورت نے ان تشکیلات کو بہ براہین شاکستہ رفع کیا۔ اسی طرح میرزا رحیم بیگ نامی کو بھی غلط و لغت ہوا تھا ان کی اصلاح مزاج کے واسطے حضرت (غالب) نے خود توجہ فرمائی چنانچہ وہ نامہ بلاغت لکھیں میں مجسّمہ نزع ذیل ہے:

دوستوں سے ہمتاقت غالب مخالفوں کے جواب کے لئے خود بھی دوستوں میں تحریک کرتے تھے مثلاً نواب علاء الدین احمد خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ شہاب الدین نے "محرّق قاطع" کا ایک نسخہ میرے کہنے پر بھیجا ہے اگر فرصت مساعدت کرے تو اس کی غلطیاں جمع کر کے مجھے بھیج دو۔

میرزا ایک دوست ہے کہ وہ منجملہ رجال الغیب کے ان حضرات کا غاکہ اثر رکھتا ہے نیز نیشاپور

نے اس کو مدد دی ہے تم بھی بھائی مدد دو۔

خود غلام غوث تجر کا سالہ غالب اس زمانے میں بہت مشغول تھے اور بے حد ذکی الحس ہو گئے

تھے کسی نے کہہ دیا کہ آپ کے عزیز شاگرد خواجہ غلام غوث خاں پیچہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ غالب نے بے تاب ہو کر فوراً خواجہ صاحب کو لکھا کہ یہ کیا واقعہ ہو اہل خیبر باطل غلط تھی۔ خواجہ صاحب نے اس پر غالباً شکوہ کیا۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں :-

پیر و مرشد خفا نہیں ہوا کہ تہ یوں سنا مجھے باورد آیا یہاں تک تو میں مورد نہیں ہو سکتا  
جنگ و استعجاب پر ہے کل استعجاب وہ ہے کہ آپ کا دوست کہتا ہے کہ میری صاحب نشیبت  
گورنر بہادر میرے شاگرد ہیں اور وہ قاطع برہان کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اولیاً کیا یہ حال ہے تو  
دائے بحال ہم اشیائے یہ حکایت ہے شکایت نہیں۔ میں دنیا داری کے لباس میں  
فقیری کر رہا ہوں لیکن فقیر آزاد ہوں : شاید دیکھا۔

قاطع برہان کی بناء طاعت | غالب نے قاطع برہان کو دوبارہ چھپوانے کا ارادہ کیا نواب یوسف علی خاں  
نے لکھ بھیجا کہ اپریل ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کے ساتھ دو سو روپے مزید بچپس کے لیکن اپریل کے  
آخری عشرہ میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا سیف الہی سیاح کی وساطت سے نواب  
میر غلام بابا خاں سے امداد کی درخواست کی گئی نواب صاحب نے کھڑی بھیج دی۔ غالب نے  
دوبارہ لکھا تو ستمبر ۱۸۶۵ء کو نواب میر غلام بابا خاں نے سو روپیہ کی رقم بھیج دی۔ غالب نے  
کاغذ منکا کر کتاب پھینکے لئے دے دی وہ خود اکتوبر ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں بہادر  
کی تحفہ نشینی کے جشن میں شرکت کے لئے رام پور چلے گئے کتاب وہی میں اکمل المطالع میں چھپ  
رہی تھی۔ مرزا شمس الدینی بیگ رشتہ دار کو سو روپیہ ۱۸۶۵ء کے خط میں رام پور سے لکھتے ہیں :-

قاطع برہان کا حال نکھنا۔ میں نے تیس روپے کی ہنڈی (سو روپے کی باقی) حکیم جی حکیم  
غلام نجف خاں کو بھیج دی ہے حضرت نے رسید بھیجی نہیں لکھی۔ ان سے رسید لکھو ابھیجو اور  
سب جلدوں کے شیرازے بندہ جائیں اور مرزا کا غددوں کی طرف لنگ جائے۔ خبردار کوئی  
نسخہ بے جلد نہ رہے۔ میں سو جلد کے تیار ہونے کی خبر اور بقیدہ حساب میرے پاس بھیج دینا اور پیغور

۱۵ ہندوئے ستمبر ۱۳۱۳ھ اور دوسرے ستمبر ۱۳۱۴ھ اور دوسرے ستمبر ۱۳۱۵ھ

بھیج دوں گایا اُکروں گا۔

طبع ثانی میں غالبؔ کے کچھ فوائد بڑھا دئے تھے اور اس کا نام ”قاطع برہان“ کے بجائے ”درفش کا دیانی“ رکھا تھا۔ اس کا کوئی نسخہ مجھے نہیں مل سکا۔ عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:-  
 ”قاطع برہان“ میں اور مطالب بڑھائے ہیں اور ایک دیباچہ دوسرا رکھا ہے ”درفش کا دیانی“ اس کا نام رکھا ہے۔

غالبؔ ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو رام پور سے واپس آئے تو ”درفش کا دیانی“ تیار ہو چکی تھی۔  
 سیدح کو لکھتے ہیں:-

اجی اہل میاں سیف الحق! رام پور سے آکر تین سو جلدیں ”درفش کا دیانی“ کی تیار پائیں۔ تو میر غلام بابا خاں کے حصہ بردارانہ کو ڈیڑھ سو جلد کا پتہ تیار نہ بنایا۔ اس پر ناٹ بیٹوایا۔ ٹوک گئے بھوایا سرکاری ڈاک والوں نے ہرگز اس کا بھیجنا قبول نہ کیا۔ ٹھیکے والے پمفلٹ والے ریل والے تلفظ اس کے ارسال سے انکار کرتے ہیں تم یہ وعدہ خدمتِ انوار میر غلام بابا خاں کو پڑھو اور اس باب میں جو وہ فرمائیں مجھ کو لکھو۔

مؤید برہان غالبؔ کے پاس ۱۸۶۶ء میں پہنچی تھی۔ وہ خود ذکا کو ۱۴ مارچ ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”مؤید برہان“ میرے پاس بھی آگئی ہے اور میں اس کی خوانات کا حال بہ قید شمار صفحہ و سطر لکھ رہا ہوں وہ تمہارے پاس بھیجوں گا۔ شرطِ مودت بہ شرطِ آنکہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو یہ ہے کہ میں ہوں یا نہ ہوں تم اس کا جواب ضرور دو۔ میرے بھیجے ہوئے اقوال جہاں جہاں مناسب سمجھو درج کرو۔

”تین تین“ مؤید برہان کے بعد غالبؔ نے اردو زبان میں ”تین تین“ لکھی تیس صفحے کا ایک مختصر سار مل ہے جو ”اکمل المبلغ“ میں چھپا۔ اس کی تمہیدی عبارت میں غالبؔ نے ”محرّق قاطع“، ”لطائف غیبی“، ”سطح برہان“، ”نامہ غالب“ اور ”قاطع القاطع“ کا ذکر کیا ہے مؤلف ”محرّق“ کے متعلق فرماتے ہیں:-

ایک مرد بے مغز صبیح الدین نے فارسی داں و نہ عربی خواں نے میری شکرش (ذائع برہان) کی زد پر میں ایک کتاب بنائی اور چھپوائی اور محرق قاطع اس کا نام رکھا۔  
**مولف قاطع برہان کے متعلق فرماتے ہیں :-**

ایک مرزا حیم بیگ میرٹھ کے رہنے والے بروئے کار آئے اور ایک مختصر مسیحیہ قاطع برہان نکال لائے مطالب مندرجہ لغویہ پیشہ محرق قاطع اسے مضامین منقول بغیر نے صرف ایک مرتبہ جی کو لکھ بھیجا۔ زیادہ اس طرف التفات کو تقصیر اوقات جانا۔

**مولف قاطع القاطع کی نسبت ارشاد ہوتا ہے :-**

میاں امین الدین کہ اب پٹیا لیں مقلب برادر میں ہیں انہوں نے قاطع القاطع چھپوایا ہندوئی میں سے بعد صرف متقاعد بخود صرف فارسیت کی اس قدر رعایت منظور رکھی کہ فقیر نے بعض فقروں کی ترکیبیں اپنی عبارت کے قالب میں ڈھالیں باقی سوائے عربی فشری اور فارسی سرودہ کے وہ منظر نگاریاں وہی ہیں جو کجترے اور بھٹیاریے ہستعال کرتے رہے ہیں.....  
 یارب میاں امین الدین کس بری قوم کے اور کس باجی گروہ کے ہیں کہ مولوی کہلائے ہندس بنے گمانا غلط مقلد قوم نہ چڑھے۔ گریہی طرے کے ازالہ حیثیت عربی کی نالاش ہو جاتی تو یہاں پر کسی بچی گریہ کے بغیر نفس نے ازالہ حیثیت کے لفظ کو گورا نہ کیا کہ ان کی مختصران کے باجی پن پر بھل جی؟  
**مولف نوید برہان** | مولوی احمد علی صاحب مولف نوید برہان کی نسبت فرماتے ہیں :-

عربیت میں امین الدین سے بڑھ کر فارسیت میں برابر فخر و نامہ نگاری ہیں کہ شہرے انظرہ ذیل کے ہیں وہ جن جن کر میرے واسطے ہستعال کئے اور یہ نہ سمجھا کہ قاطع اگر عالم نہیں شاعر نہیں۔ آخر منراخت امارت میں ایک پایہ رکھتا ہے صاحب غوثان ہے۔ عالی خاندان ہے امرائے ہند، دوسرائے ہند، ہمارا جگان ہند سب اس کو جانتے ہیں۔ رئیس دادوگان سرکار

**مولف خواجہ عالی فرماتے ہیں کہ غالب نے قاطع برہان کی مخالفت میں رسالے لکھنے والوں میں سے ایک کے خلاف ازالہ حیثیت عربی کی نالاش کی تھی لیکن جب کامیابی کی امید نہ رہی تو رضی نامہ دہل کو یاد دلا خط کو یادگار غالب صفحہ ۶۴،**

انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔ بادشاہ کی سرکار سے خیم الاولاد خطا ہے۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خاں  
 بسیار مہربان دوستانہ اتفاق ہے جس کو گورنمنٹ خاں صاحب لکھتی ہے اس کو مٹری اور کٹاؤ  
 گدھا کیوں کر لکھوں فی الحقیقت یہ دلیل بھجوائے ضرب الغلام انت المولے گورنمنٹ بہادر  
 کی تہین اور ضیح و شریف ہند کی مخالفت ہے۔ میرا کیا بگڑا۔ مولوی نے اپنا پاجی پن ظاہر  
 میں نے معلوم امین بے دین کو شیطان کے حواسے کیا۔ اور احمد علی کے الفاظ مذموم سے قطع  
 کیا۔ اور ان کے مطالبہ علی کا جواب اپنے ذمہ لیا۔

اس کے بعد اصل کتاب شریعہ ہوتی ہے جو سترہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ان فصلوں مختلف  
 اعتراضات پر تجربہ کیا ہے۔ اور ان کے جوابات دیے ہیں آخر میں مختلف اعتراضات  
 کو مستحق کی شکل میں کمر و سوالات مرتبہ کئے ہیں اور ہر سوال کے ساتھ جواب مصطفیٰ  
 خاں شیفہ کی طرف سے جواب دیا ہے۔ تمام جوابات میں غالب کی تائید کی گئی ہے آخر  
 میں خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم۔ مولوی محمد سعادت علی مدرس گورنمنٹ اسکول دہلی۔ اور  
 نواب خیار الدین احمد خاں نے بحسب بعض نواب مصطفیٰ خاں شیفہ کے جوابات کی تصدیق  
 و توثیق کی ہے۔

منقولہ کتاب جنگ امیر برہان کے متعلق غالب نے فارسی میں کہیں شعر کا ایک قطعہ بھی لکھا تھا جس کے چند فقرہ خواجہ حالی مرحوم  
 ریچو نہیں لکھ سکے ہیں۔ اس قطعہ پر منظومات کی جنگ شروع ہو گئی۔ مولوی احمد علی صاحب بٹلف  
 ”مؤید برہان“ کے ایک شاگرد عبدالصمد صاحب قدس نے غالب کی ”نیغ تیز“ کے جواب میں  
 ایک رسالہ ”شمیر تیز“ کے نام سے مرتب کیا تھا جو شمس ۱۸۶۸ء میں مولوی غلام نبی خاں کے مطبع  
 بنوی میں عبداللہ خاں کے زیر اہتمام چھپا۔ اس رسالہ میں منظومات کی جنگ بھی موجود ہے اس میں  
 سب سے پہلے غالب کا قطعہ درج ہے۔ پھر اس کے جواب میں اسی زمین میں مولوی عبدالصمد  
 کا ایک قطعہ ہے اس کے بعد عبدالصمد کے جواب میں غالب کے دو شاگردوں باقر علی خاں  
 اور فخر الدین حسین خاں سخن کے دو قطعے ہیں جو اسی زمین میں لکھے گئے۔ آخر میں عبدالصمد نے

ان دونوں قطعوں کا جو جواب دیا تھا وہ درج ہے۔ اس طرح غالب کے قطعہ سب سے اُن میں ہیں  
جواب اور جواب الجواب کے طور پر دو سود و شعر کہے گئے یہ چیزیں اب بالکل ناپید ہیں میری آرزو  
تھی کہ انہیں یہاں تمام درج کروں لیکن گنجائش اجازت نہیں دیتی البتہ غالب کے قطعہ کا اندراج  
ضروری ہے یہ سب ہیں "میں چھپا تھا دوبارہ کہیں شائع نہ ہوا۔"

### قطعہ

درسا سگزاری و یاد آوری بہ عالی خدمت جناب مولوی آغا محمد علی صاحب جہانگیر نوری انجانب

پندرخواہ ہے راہِ روی اسد شدہ خاں غالب ہوی

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ	و خصوص گفتگوئے پارس انشا کردہ است
کیچ و کمران را کہ در سند است از ایران عیا	مثالِ تعلیم ایران بے محابا کردہ است
قوم بر لوح را بہ ایرانی شرداں وادہ غلط	ترک ترکان سمرقند و بخارا کردہ است
در جہاں تو ام بود و دے ویت قتل	پیشوائے خویش ہند و زادہ را کردہ است
ہندیان را و زبانی مسلم داشتہ	تاجہ اندر خاطر دلاستے او جا کردہ است
خوش برآمد با ہمہ ہندوستان زایان خوش	تکیہ آریے برو لادت گاہ آبا کردہ است
بہر کہ بینی بازبان مولد خود آشنا است	ساز نطق موطن اجداد بے جا کردہ است
خواجہ را از اصفہانی بودن آبا چہ سود	خاقش و کشور بنگالہ پیدا کردہ است
یقین و جامع بران دلالہ ٹیکٹ چند	لابہ و سوگری و لطف و مدارا کردہ است
داوری کچہ بنا فرمود و دروے بہرہ	منصف صدر امین و صد علی کردہ است
گر چنین با ہندیان دارد تو لا و سخن	من ہم از ہندم چرا ز من تیرا کردہ است
سیل او باہر کسے از ہند حقیقت خاص	حیف و میل باد و عالم شور و غوغا کردہ است
کردہ است از خوبی گفتار من قطع نظر	ظلم زین قطع نظر بر چشم بینا کردہ است

۱۵ محمد بن تبریزی ثم دکنی ترف بران قاطع ۱۵ لایک چند بہا مولف بہا ہج ۱۲

مطلب از گفتن من چیست گویانیک مرد  
 و چنین نبود چنان باشد که در عرض کمال  
 صاحب علم و ادب و انگیزه از افراط غضب  
 در جدل و شتم کارسوزنیاں باشد و  
 اتقام جامع بران قاطع بے کشف  
 من سپاسی ز او ام گفتار من باید در  
 زشت گفتنم لیک از بدگفتی داده ام  
 مے کند تائید بران لیک بران ناپید  
 سستی طرز خرام خامه بران "تخار  
 بهر من توین و بهر خویش تخمیں جا بجا  
 آید و میند همه اند به کتاب مولوی  
 لغو و حسود او عسے محض از لطیف نمل  
 بگذر از منتهی این الفاظ را بر بسته میں  
 یا فتم از ویدن تاری پنهانے آن کتاب  
 غازیای همراه خویش آورده از بهر جاو  
 جوش زو از غایت فقر و غضب دل در  
 آتش خشمی که سوز و صاحب بر نخست

مروا میں کا راز حق آمرزش تمنا کرده است  
 تا بر آرد نامہ میں ہنگامہ پیدا کرده است  
 چو سیفہاں دفتر نفیر منی ذمہ دار کرده است  
 تنگ آمد علم تراں کارے کہ غا کرده است  
 آنچه ماکر ویم باوے خواجہ باکرده است  
 واسے بروے کہ تقلید من اینہا کرده است  
 شوخی طبعی کہ دارم میں تقاضا کرده است  
 نیست خبر تسلیم تویش ہر چہ نثار کرده است  
 یا نمے و نیست یاد انستہ افشا کرده است  
 ہم مرا ہم خویش را وروہر سوا کرده است  
 ہر چہ از ہنگامہ گیراں کس تماشا کرده است  
 مار و موش و سوسمار و گرہ بکجا کرده است  
 بادہ بنور شیشہ و ساغر میا کرده است  
 خود بد گفت و بہ حاجب و دیا کرده است  
 تانہ پنداری کویں پیکار تنہا کرده است  
 تاز بانس را بدیں کلپتر آگیا کرده است  
 دروش ہم چوں شرور رنگ ما کرده است

چوں نباشد باعث تشنن جز رشک محمد

باد غالب خستہ تر گزستہ پروا کرده است





# چودھواں باب

## کلام طبرق اصلاح اور شاعر

ہندو رند سخن پیشہ گناہ مہرت  
اندیں دیکھن مے کہہ آشاہت

غالب نے اپنے دوست سرلج الدین احمد خاں کی فرمائش پر اپنے منتخب اردو اور فارسی اشعار کا جو مجموعہ ”گل رعنا“ کے نام سے مرتب کیا تھا۔ اس کے دیباچہ میں تصریح کی ہے کہ ابتدا میں اردو شعر کہنے شروع کئے تھے۔ فارسی دیوان کے خاتمہ کی عبارت میں جو ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۶ء) میں لکھی گئی تھی۔ فرماتے ہیں گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ خواجہ عالی نے لالہ ہماری لال مشفق دشاگرد غالب کے بیان کی بنا پر لکھا ہے کہ اگر وہ کے ایک صاحب لالہ کنہیا لال جو غالب کے ہم عمر تھے ایک مرتبہ دہلی آئے اور اثنائے گفتگو میں غالب کو یاد دلایا کہ آپ نے پتنگ بازی کے متعلق ایک مثنوی اردو میں لکھی تھی اس کے آخر میں فارسی کا یہ شعر لاجن کر دیا تھا

رشتہ در گردنم آگندہ دوست

مے ہو ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

لالہ کنہیا لال صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ مثنوی آٹھ نو برس کی عمر میں لکھی گئی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شعر بھی کہنے شروع کر دئے تھے خواجہ عالی فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں انہوں نے ایک فارسی غزل کہی تھی جس کی ”رویف“ ”کہچہ“ تھی۔ یہ غزل ان کے استاد شیخ معظم کے پاس پیش ہوئی تو شیخ نے رویف کو مل بتایا لیکن ایک اور

لے کلیات شرف فارسی صفحہ ۹۰۹ و ۹۱۰ تعلیمات شرف فارسی صفحہ ۶۷۷ یا دیگر غالب صفحہ ۴۰۹۔

غالب کو نکلوسی کے کلام میں "کہ چہ بہ معنی" چہ کی سہل گئی۔ انہوں نے شیخ معظم کو یہ سند دکھائی تو وہ حیران رہ گئے۔ اور فرماتے لگے کہ فارسی زبان کے ساتھ تہیں خدا وادنا سبب ہے تم ضرور فارسی شاعر کیا کرو۔

اردو شاعری اور فارسی شاعری | غالب ایک اردو مکتوب میں فرماتے ہیں :-

خاکسار نے ابتدا رس تیز میں اردو زبان میں سخن سرفی کی ہے، پھر ادب و علم میں بادشاہ ملی کا ذکر ہو کر چند روزی روش پر غامہ فرمائی کی ہے نظم و نثر فارسی کا عاشق و مائل ہوں۔ ہندوستان میں رہتا ہوں مگر تیغ و صفائی کا گھٹاں ہوں۔

غالب انورالدولہ کو فارسی کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :-

از دیوار و ستارے آری آرد وند اعم ہانا از مناجاتی شریار سلیمان چنگا زبہادشاہ مرحوم  
گاہ گاہ ناگاہ رنگ ریختہ یمن بیژہ بہرمان بانے بلیں ستار و زاب زینت محل نگیم والدہ شہزاد  
جواں بخت در ریختہ بدیں رو بیضا ناروا دل آویختن نگرد مقبض غولی سرستاد ہوئے زندہ باشم  
آں شے یکے گمان کمالے (کہ نہ داشت) داشت پنداشت کہ روئے سخن سوئے دست و قطع  
غزلے کہ مرد و بہر بخا تیزہ کام زود داشت گفتار مرا پانچ سازد۔  
اسی مکتوب میں آگے چل کر فرماتے ہیں :-

آہ ازمن کہ ماریاں زود و سوختہ خوش آفریدند یہ آئین نیاکان خلیل سلطان تیر مار کلاہ کہ

۱۔ یادگار غالب صفحہ ۶۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸،

و نہ بہ فرجنگ فرزانگان پیش <sup>پیش</sup> "پیشی" آسا علم و ہنر سے گفتہ درویش باشم و از داد راہ سپرم  
 ذوق سخن کہ نزل آرد و ہر ہنری کردہ مرا بہ انس فریفت۔ مگر آئینہ خود و دوز و صورت معنی  
 نمودن نیز کار نایاب است بلکہ شکی و دانشوری خود <sup>نہیست</sup> نیست صوفی گری بجزارد بہ سخن گتری  
 یہو سے آئینہ گری ہم چنان کہ دم دہینہ در بجز شمع کہ سراسر است رواں کہ دم قلم علم شد و تیر کا  
 شکستہ نیامان قلم لہا زرد بہ روزگار ویدہ ورسے نہ بود یا پردہ بین نہ پرداخت۔

نواب شمس الامرا جید را آبادی کے نام کے فارسی خط میں لکھتے ہیں :-  
 شعر و سخن بابا نہا و مکہ بن پرند روحانی است و غماز بہد و ظہرت و گمراشتانی۔ و از غار ریختہ  
 گشتے وہ آرد و زبان غزل سرا بد سے نہا بہ پارسی زبان فوق سخن یافت و از ان وادی  
 عنان اندیشہ بر تافتہ دیوان مختصر سے از ریختہ فراہم آدہ و دان آگدستہ طاق لسیان کرد  
 کما پیش سی۔ مال بہت کہ اندیشہ پارسی نگار است۔

نواب علی بہادر خاں والی باندہ کو لکھتے ہیں :-

از ویر یانہ بختن ریختہ سے گرایم وہ بہ پارسی سخن سے سرایم لیکن چون رخا نے غلط  
 حضرت ظل النبی دوان است کہیں کو نہ گفتار برائے حضرت ملک رفعت ارغمان بروہ شہ  
 ناچار گاہ گاہ ریختہ سے گویم۔

بہ ہر حال غائب کی تمام تحریرات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں انہوں  
 نے اردو میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ پھر فارسی میں کہنے لگے۔ چند سال کے بعد کلیتہً فارسی کے  
 کے لئے وقف ہو گئے۔ جب قلعہ کے ساتھ ملازمست کا تعلق پیدا ہوا تو بادشاہ کی خوشنودی کے  
 لئے پھر اردو میں شعر کہنے لگے ان کا موجودہ اردو دیوان زیادہ تر اسی دور کا ہے۔

ملا عبد الصمد کی صحبت کا اثر | میرا خیال ہے کہ فارسی پر غائب کی خاص توجہ ملا عبد الصمد کی صحبت کی وجہ  
 سے ہوئی جو ۱۲۳۶ھ میں آگرہ آئے اور دو برس غائب کے پاس رہے۔ اس وقت غائب کی عمر  
 صرف چودہ برس کی تھی۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ غائب کے ابتدائی کلام میں فارسی بہت

زیادہ ہے۔ بلکہ باوی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے فارسی شعر کہہ لیتے تھے اس کے بعد کہیں کہیں اس میں فارسی الفاظ کی جگہ اردو الفاظ داخل کر دیتے تھے یا کہنا چاہتے کہ ان کچھ فارسی میں شعر کہتا تھا اور وہ کاغذ پر لکھتا اسے اردو بنا لیتے تھے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ابتدائی اردو کلام میں فارسییت اس وجہ سے بہت نمایاں تھی کہ انہیں اردو آتی نہ تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ اگرہ کی رہنے والی تھیں لہذا ان کی مادری زبان لازماً اردو تھی ابتدائی کلام میں فارسییت کے غلبہ کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ابتدائی میں زیادہ تر فارسی کلام دیکھنے لگے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغ پر تبدیل کا اثر بہت زیادہ تھا۔ اور اردو میں بدلنے کے انداز کی پیردی فارسییت کے زیادہ سے زیادہ ہتھمال کے بغیر ممکن نہ تھی۔

فارسی زبان اور ادب سے نفرت غالب کو اپنے اردو اشعار کے متعلق بہت زیادہ حسن ظن نہ تھا۔ اور وہ فارسی شاعری ہی کو خدا و کمالات کی حقیقی نمائش کا سمجھتے تھے۔ اور حق یہ ہے کہ ان کے فارسی کلام کو بہت مختلف فارسی زبان کے مشاہیر اسانذہ فن کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ پھر عالم اسانذہ میں کسی کی ایک چیز بھی ہوگی کسی کی دو چیزیں بھی ہوں گی۔ لیکن غالب کے ذوق کی جامعیت اور عمق گیری کا یہ عالم ہے کہ ان کی ہر چیز بھی ہے۔ ثنوی، نعل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، نثریں واقعات، حکای، علمی بحثیں، انتقاد و غرض ہر دائرے میں وہ یکساں قابل تدر ہیں لیکن ہندوستان میں غالب کی شہرت کا مار صرف ان کے اردو کلام پر ہے۔ بہرے کے باب میں ذوق کی غلط فہمی اور غلط اندیشی کے باعث جو صورت حالات پیدا ہوئی تھی۔ اس پر غالب نے ایک فارسی قطعہ بھی ذوق کو مخاطب کر کے لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں:-

اے کہ در بزم شہنشاہ سخن در گھستہ	کے بیڑ گوی فلان در شہر ہم رنگ من است
رہست گفتی لیکے دانی کہ نبود جائے طعن	کہ تراز با ہم ہل اگر غمہ چنگ من است
نیست نقصان یک جزو است از سوادت	کساں دژم ہر گے ز خلعتان فرنگ من است
فارسی میں تا بہ مبنی نقشہاے رنگ رنگ	بگزار از مجبورہ اردو کہ بے رنگ من است

فارسی میں تا بہ بنی کا ندرت کا قلم خیال مافی و از رنگم و آن نسخہ از رنگ من است ✓

.....

دشمنی اہم فنی شرط است و آن مافی کہ نیست از تو بد و نندہ در سائے کہ در چنگ من است  
در سخن چوں ہم زبان ہم نوازے من نہ چوں است پایج و تاب از رنگ من است  
رہے گویم دے از دست نہ تر توان ہر جہ و گرفتار فخر است آن رنگ من است

غالب کی یہ رائے اپنے اردو اشعار کے متعلق ہے۔ اردو کے محاکم کے متعلق معلوم ہے کہ غالب ان کی ترتیب و اشاعت کو اپنی شہرت سخنوری کے منافی سمجھتے تھے لیکن یہی ایک بڑا دیوان ریختہ اور یہی منافی شہرت سخنوری کا تیب آج غالب کی شہرت کے علم کو اردو زبان کے تمام ندرت کا رشا عروں اور نشر نگاروں سے بدرجہ بلند تر اٹھائے ہوئے ہیں۔ ارباب ذوق اندازہ فرمائیں کہ جس شاعر کے تخیل ان فرہنگ کے "برگ و شہ کی جاذبیت اور حسن خوبی کا یہ عالم ہے۔ اس کے نشتر تھائے رنگ رنگت۔ اور اس کے نسخہ از رنگ کا کیا رنگ ہوگا لیکن فہوس کہ فارسی کا ذوق ہندوستان میں بہت کم ہو گیا ہے۔ اور فطرت غالب کے کمالات کی اس حقیقی جولانگاہ سے عام طور پر بہت کم روشناسی حاصل ہے۔

نسخہ حمیدہ غالبؒ ۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۲۱ء تک جب کہ ان کی عمر چوبیس برس کی تھی۔ اردو کا ایک اچھا خاصا دیوان مرتب کر دیا تھا۔ جو اسی زمانے میں نواب فخر محمد خاں رئیس بھوپال کے فرزند ارجمند نواب فخر محمد خاں کے پاس نقل ہو کر پہنچ گیا تھا یہ نسخہ چند سال ہوئے ہیں علیٰ حضرت نواب حمید اللہ خاں بہادر فرما کر اسے بھوپال در متع اللہ معین طول جاتہ و حفظ بقا تہ کی خسر و اندہ تو بہات گرامی کی برکت نسخہ حمیدہ کے نام سے شائع ہو گیا ہے نسخہ حمیدہ کی تہذیب میں مرقوم ہے کہ یہ نسخہ ۱۵ صفر ۱۲۳۵ھ کو حافظ معین الدین صاحب نے لکھا تھا اس کے غائر مطالعہ سے منکشف ہوتا ہے کہ اس میں زیادہ تر کلام باطل ابتدائی دور کا

سے تہذیب نسخہ حمیدہ صفحہ

ہے جبکہ غالب کی وقت پسند طبیعت بیدل کے مطالعہ سے بہت مسحور تھی اور وہ بیدل کی تقلید میں نازک اور بلند مضامین پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نہ مافی قوس نے باغِ حاصل کیا تھا نہ اندازِ بیان پر پوری قدرت و دستِ نگاہ حاصل ہوئی تھی نتیجہ یہ تھا کہ وہ بیدل کے خاص الفاظ و ترکیب کو بہ کثرت استعمال کرتے تھے اور اسے اپنے ذہن میں بیدل کی پیروی سمجھتے تھے جس طرح گج کل کے بعض فرمایہ اور کورڈوق اصحاب نے اشعار میں فارسی اضافتوں کے سرفراز استعمال کو غالب کی پیروی سمجھ رکھا ہے اور صاف بات کو پیچیدہ، مبہم اور غیر فہم بنا دینا ان کے نزدیک غالب کا رنگ ہے۔

بیدل کی چپی | اس زمانے میں غالب پر بیدل کا رنگ اتنا غالب تھا کہ انہوں نے متعدد غزلوں کے مقطعوں میں مختلف طریقوں پر بیدل کا ذکر کیا ہے مثلاً

اسد ہر جا سخن نے طبعِ باغِ تازہ ڈالی ہو  
مجھے رنگِ بہار ایجا دی بیدل پسند آیا

.....  
مطربِ دل نے مرے تافنس سے غائب  
سال پر رشتہ پئے نسخہ بیدل باندھا

.....  
مجھے راہِ سخن میں خوفِ گرہی نہیں غالب  
عصائے خضر صحرا سے سخن ہے غائب کا

.....  
آہنگِ اسد میں نہیں خیرِ نعمتِ بیدل  
عالمِ ہمہ افسانہ ما دارو و ما میسج

اس زمانے کے کلام میں محض روئیں ہی فارسی نہیں ہیں بلکہ پورے مصرعے فارسی

کے چلے آتے ہیں مثلاً

ہسان جو ہر آئینہ از ویرانی دہا  
غبار کو چہ ہائے موج ہے خاشاک ساحلہا

.....

نصا خندہ گل تنگ ذوق عیش بے پروا  
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا

.....

بہ شغل تنہا رہو شاں و غلوت، شہما  
ستر مار نظر ہے رشتہ تسبیح کو کہما

نائب اپنے شاگرد عبدالرزاق شاہ کو لکھتے ہیں :-

ابتداء فارغین میں پیدل و اسیر کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا، چنانچہ ایک نزل کا قطع یہ تھا :-

طرز تبدیل میں ریختہ لکھنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھتا گیا دس برس میں بڑا ویران

جمع ہو گیا۔ آخر جب قیادت ملی تو اس دیوان کو دور کیا اور ان کی حکم چاک کئے دس پندرہ شعر دے

فرستے گئے دیوان عالیاں رہتے دینے۔

یہی وہ دیوان ہے جو نسخہ حمیدیت کے نام شائع ہوا

نسخہ حمیدیت کی تصحیح و ترمیم کا مسئلہ مفتی انوار الحق صاحب اہل نسخہ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں

کہ اس پر جگہ جگہ بسیاں فوجدار محمد خاں کی مہریں ثبت ہیں بعض ۱۲۴۸ھ کی اور بعض ۱۲۶۲ھ کی ہیں

یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کہتے کہ ایک بار اور ممکن ہے کہ یہ چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض

سے تالیف کے پاس ہی کر رہا ہے۔ اور ان کی نذر سے گزرا ہے اور انہوں نے خود اس میں تاج

ہملا جس کی ہیں کیونکہ اگرچہ ان ہمالوں کا خط بہت خراب اور ٹکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے اور گو محض اس کی بناء پر ان کو غالب کا قلمی قرار دینا شاید درست نہ ہو لیکن خود ان ہمالوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے۔ یا کسی صریح کی کچھ صورت بدل دی ہے۔ بہت سی غلطیاں بھی اسی قلم سے حاشیہ پر بڑھائی گئی ہیں۔ جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان پیکٹسہ موجود ہیں۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے۔ اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پوسٹ ٹر شائع نہیں ہوئے۔

نسخہ حمید کی بھی غالب | لیکن میرے خیال میں مفتی صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے۔ اس کے وجہ کے پاس نہیں گیا | اختصاراً درج ذیل ہیں :-

(۱) غالب ۸۲۷ء میں کلکتہ گئے۔ اور جاتے ہوئے لکھنؤ ٹھہرے ”و“ کی تختی میں ان کی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے :-

والی پہنچ کر جو عشق اتا ہے ہم ہے ہم کو  
صدرہ آہنگ نہیں برس قدم ہے ہم کو

اس کے آخر میں ایک قطعہ ہے جس میں لکھنؤ کا ذکر ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی | ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو  
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر | غم پر خفت و طوف حرم ہے ہم کو  
لے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب | جادہ رہشش کاٹ کر کم ہے ہم کو

قطعہ سے ظاہر ہے کہ یہ غزل یقینی طور پر لکھنؤ میں کسی گئی تھی اور آخری صلاف بتا رہا ہے۔ یہ کلکتہ جاتے وقت کسی گئی تھی لیکن مطبوعہ نسخہ حمید میں یہ غزل غالب کے کلام میں





اُردو اشعار تعداد سمرسری اندازہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخہ حمیدؒ میں قصاید اور گیارہ رباعیات کے علاوہ کل ۱۸۹۰ اشعار ہیں۔ ان میں غالبؒ کے پائیس العلماء مولانا محمد حسین صاحب آزاد کی روایت کے مطابق مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خاں کو توالی دہلی نے انتخاب کے وقت کل ۱۰۴۳ اشعار لئے۔ ۱۸۲۵ء کے بعد آخری تمکب چالیس برس میں غالبؒ کے اُردو غزلیات میں ۹۵۰ اشعار کہے۔ بعد کے قصائد، قطعات اور مثنوی انہی کے اشعار کی تعداد ۲۷۰ ہے۔ رباعیات گیارہ ہیں یعنی اگر سب اشعار کو شامل کر لیا جائے تو ان کے چوالیس برس کے کل اُردو اشعار تیرہ سو سے کسی قدر کم بنتے ہیں۔ اور ان میں وہ اشعار بھی شامل ہیں جو ان کے سبط دیوان میں شامل نہیں ہوئے لیکن رقیات میں چھپ گئے۔ ایسے اشعار بھی ہیں جو نہ رقیات میں چھپے نہ دیوان میں شامل ہوئے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ اور ۱۸۲۵ء کے بعد سے ان کے کل اُردو اشعار تیرہ سو سے متجاوز نہیں ہوتے اس ران میں انہوں نے فارسی کے کئی ہزار اشعار کہے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کے اُردو اشعار زیادہ تر اس زمانے کے ہیں جبکہ قلعہ کے ساقان کا رابطہ ملازمت قائم ہو چکا تھا اور بادشاہ کی خاطر سے انہیں اُردو میں شعر کہنے پڑتے تھے۔

انتخاب شمار درست ہے [نسخہ حمیدؒ والے اشعار کا کوئی مجموعہ اگر انتخاب کے وقت غالب یا ان کے دوستوں کے پیش نظر تھا، تو سمجھنا چاہئے کہ انتخاب درست نہ تھا اس لئے کہ نسخہ میں بعض ایسی غزلیں موجود ہیں جو تھما یا جزواً انتخاب میں آتی چاہئیں تھیں مگر نہیں آئیں مثلاً کھینچنے والی غزل ہے

وامان دل بہ دہم تماشا نہ کھینچے      اسے مدعی خجالت بے جا نہ کھینچے  
عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر      دامن کو اس کے لہجہ حریفانہ کھینچے  
خود نامہ بن کے جائے اسلئے کھینچے      کیا فائدہ کہ مست بیگانہ کھینچے

یا

تماشا سائے گلشنِ تناسے چیدن بہارِ آفرین گنگا میں ہم  
اسد شکوہ کھنڈ و دغا ناسپاسی ہجومِ تناسے لاچار میں ہم

یا

خود پرستی سے رہے باہم گنا آشنا بیکسی میری شریکِ آئینہ تیرا آشنا  
رابط یک شیرازہ وحشت ہیں اجڑا ہوا سبزہ ہیکانہ صبا آوارہ گل نا آشنا

یا

شکوہ یارانِ غبارِ دل میں پنہاں کر دیا  
غائب ایسے گنجِ کوشایاں ہی دیرِ بخت

یا

سہر پہرے و بال ہزار آرزو رہا  
یار ہیں کس غریبِ بخت رسیدہ ہو

یا

اے فوارِ تماشا سرِ کف چلتا ہوں میں  
اک طرف جلتا ہے دلِ دراک طرِ جلتاں

یا

ہوئی ہیں آبِ اشہرِ کوششیں جہ سے تدبیریں  
عرقِ ریز پیش میں موج کی مانند نہنجیریں  
بہر حال ان میں سے کوئی شعرِ شمارِ سحرِ مرغوبت مشکل پسند آیا "مے مقابلے میں قابل

حذف و رد نہ تھا۔

نئے انتخاب کی ضرورت | میرا خیال ہے کہ پورا مجموعہ بوقت انتخاب اشعارِ غالب یا ان کے دوستوں

کے سامنے نہ تھا۔ اگر حالات نے مساعیت کی اور صحت نے اجازت دی تو میرا ارادہ ہے کہ غالب کے اچھے اشعار کا ایک نیا مجموعہ مرتب کروں۔ ایسا مجموعہ اس درجہ سے بہ طور خاص ضروری ہے کہ غالب کے بعض ان اشعار کی وجہ سے جن میں فارسیت کا رنگ بہت غالب ہے اور معانی زیادہ قابل ذکر نہیں۔ ان کی عظمت اور ان کے کمال کا مداح حقیقی عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو رہا ہے۔ اور غالبیت کے غلط تصور نے جو مرد و دیوان کے عام مطالعہ کا لازمی نتیجہ تھا بہت سے لوگوں کو اس راستے پر لگا دیا ہے جو کم از کم غالب کا سطح نظر نہ تھا۔

تسخیر حمید کے علاوہ بھی غالب کے بعض اچھے اشعار ملے ہیں جو اب تک ان کے دیوان میں شامل نہیں ہو سکے مثلاً

درد ہو دل میں تو دوا کیجے	دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجے
ہم کرم یاد کرنی آتی ہے	آپ سنتے نہیں تو کیا کیجے
عرض شوخی نشاط عالم ہے	حسن کو اور خود منا کیجے

یا

اس جو روجہا پر بھی بطن نہیں ہم تجھ سے  
کیا طرفہ تمنا ہے امیر کرم تجھ سے

نہ پوچھ حال اس انداز اس غماج کے تھا	بہوں پہ جان ہی آجائے گی جواب کے تھا
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی	مور قیسے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ
نہ ہو بہ ہرزہ ردا اور سعی بے ہودہ	کہ دور عیش ہے مانا خیال و خواب کے تھا
ہنر حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب	جو جاگنے کو ملا دیرے کے خواب کے تھا

۱۲ یہ آٹھوں غیر مطبوعہ اشعار تھی صاحب کی مکمل شرح کلام غالب ماخوذ ہیں

اردو سکا تیب کی تعداد اردو نشر کے سلسلے میں تمام ضروری تفصیلات باب تصانیف میں پیش کی جا چکی ہیں یہاں صرف ان سکا تیب کی تعداد عرض کر دینا مناسب ہے مطبع فاروقی کے چھپے ہوئے اردو سے پہلے "اردو مطبع نو لکھنؤ کی چھپی ہوئی عود ہندی سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں میں تقریباً ۱۵ اور نامہ غالب کے علاوہ کل رقعات کی تعداد ۶۱۵ ہے۔

اردو سے پہلے

۴۷۰

۱۴۵

عود ہندی

ان میں سے کم و بیش ۱۱۷ رقعات مشترک ہیں۔ اردو سے پہلے کے بعض دوسرے مجموعوں میں چند اور رقعات کا اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں چند نئے رقعات ہندوستانی الیڈی صوبہ متحدہ کے رسالہ "ہندوستانی" میں چھپے ہیں۔ چند فریقہ رقعات بعض رسائل میں طبع ہوئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک صاحب رام پور والے تمام سکا تیب کو جواب تک شان نہ نہیں ہوئے۔ ایڈٹ کر کے چھاپنے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے معلوم ہوا کہ انہوں نے غالب کے شاگرد نذر الدین حسین سخن کے کسی عزیز کے پاس بکے رقعات، موسومہ سخن کا ایک مجموعہ دیکھا تھا جواب تک شائع نہیں ہوا میں نے اس مجموعہ کو حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ اب تک اس کا پتہ نہیں مل سکا یہ طبعہ رقعات میں سے زیادہ تر میرزا الفتہ، نواب علار الدین احمد خاں ہنشی شیورائن میر محمد جیسو دربار شری خواجہ غلام غوث خاں بیخبر نواب نور الدولہ بہاؤ شفیق، حکیم غلام نجف خاں اور میرزا حاکم علی بیگ تھر کے نام ہیں۔

سکا تیب اردو کے انداز و اسلوب کی نسبت صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے۔ کہ ایسی رائے سلیس اور بہار آفریں تحریر کا اردو زبان میں اور کوئی نمونہ موجود نہیں۔ بالخصوص سکا تیب میں تو ایسا انداز آج تک بڑے سے بڑے ادیب بھی پیش نہیں کر سکے کمال یہ کہ ہر قسم کے مباحث اسی ایک انداز میں قلم برداشتہ لکھتے جاتے ہیں۔ یہ انداز ان سے پہلے کسی کو میسر تھا اور

ان کے بعد کوئی شخص اس کی پوری پیروی کر سکا غالب کے اردو اشعار کی کافی قدر ہوئی ہے لیکن ان کے اردو مکاتیب کی اعلیٰ اور بلند حیثیت سے اس وقت تک عام اہل علم پوری طرح پرکھا نہیں۔ میری قلمی رائے ہے کہ غالب کے ان اردو مکاتیب کی مزاولت نشر بخاری کا جوا چھا اور عہدہ ملکہ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ کسی دوسرے مصنف کی تصانیف کی مزاولت سے پیدا نہیں ہو سکتا لیکن مجھ کو مکاتیب کو بھی از سر نو مرتب کرنا ضروری ہے جس میں عابجا نشریات موجود ہوں ہیں۔ اس باب میں بہت ساموا جمع کر لیا ہے۔ خدا کرے کہ اس مجہد کی ترقی کے لئے فرصت ملے آجائے غالب کے بعد اس وقت تک جتنے بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے ہیں نے قریباً سب کے مکاتیب دیکھے ہیں۔ دور حاضر کے اکثر اکابر اہل علم سے بھی مجھے شرف خط و کتابت حاصل رہا ہے۔ لیکن ایک حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا مجھے کسی بزرگ کے انداز تحریر میں غالب کی دلکش خصوصیات جامعیت کے ساتھ نظر نہیں آئیں۔ حضرت مولانا کے مکاتیب میں مزید دلچسپی اور افادہ کا پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرہ علم و فضل غالب کے مقابلے میں بہت وسیع ہے۔

اچھوتا انداز | غالب کو خود بھی اپنے مکاتیب کے نادرا اور اچھوتے انداز و اسلوب کا احساس تھا۔ وہ فرماتے ہیں :-

میں نے وہ انداز تحریر یاد کیا ہے کہ مراد کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم  
 باتیں کیا کرو اور بھر میں وصال کے فرے لیا کرو۔  
 یہ چیز صرف اردو کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ غالب کا عام انداز تحریر بھی تھا۔ وہ چوچ آ  
 کے آغاز میں لکھتے ہیں :-

ہنجار میں درنگا ریل این ہست کہ چوں ملک و ورق بکف گیرم مکتوب الیہ را بلفظے کہ در فرست  
 دوست و مرزا غلامرضا و از دویم در فرستد ہمارا کہ درم القاب و القاب و خیریت گوی و رعایت  
 ہونی حشر و اند ہست و بچگان شورا و دفع ہند

فارسی شری | فارسی کے کلام نظم و نثر کی نسبت زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

تقاطع بران "پنج آہنگ"، "مہر و زر" و "تنبیہ کا مفصل ذکر باب تصانیف میں آچکا ہے "پنج آہنگ" کے آخری دو حصوں (آہنگ چارم اور آہنگ پنجم) کی نسبت اتنا عرض کر دینا چاہئے کہ آہنگ چارم میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظیں اور متفرق نثریں ہیں۔ آہنگ پنجم میں فارسی مکاتیب ہیں۔ آہنگ چارم کی نثروں کی فہرست درج ذیل ہے

- (۱) دیباچہ دیوان فارسی۔
- (۲) دیباچہ گل رعنا۔
- (۳) خاتمہ گل رعنا۔
- (۴) مولانا فضل خیر آبادی کے نام خط صنعت تعطیل میں۔
- (۵) معتمد الدولہ آغا میر وزیر شاہ اودھ کے نام عرضداشت صنعت تعطیل میں۔
- (۶) خاتمہ دیوان فارسی۔
- (۷) دیباچہ دیوان اردو
- (۸) تقریظ گلشن بیچار مرتبہ نواب مصطفیٰ خاں شیفہ۔
- (۹) طلحی صبح اور ہجوم ظلمت شب کے متعلق دو نثریں۔
- (۱۰) تقریظ دیوان حافظ۔
- (۱۱) دیباچہ دیوان میرزا رحیم الدین بہادر جس کا آخری حصہ صنعت قطع الحروف میں ہے۔
- (۱۲) مواروہ العظم فیضی کی تقریظ صنعت تعطیل میں۔
- (۱۳) دیباچہ دیوان نثری ہرگوپال نقفہ۔
- (۱۴) تقریظ آثار الصنادید سرسید مرحوم۔
- (۱۵) دیباچہ دیوان ریختہ نواب حسام الدین حیدر خاں۔
- (۱۶) دیباچہ مذکرہ طلسم زار بحر فوج۔
- (۱۷) تنہیت عطائے خلعت بہ فراز و اے رام پور۔

(۱۸) تقریظ مجموعہ آثار مرتبہ مولوی مظہر الحق۔

اس فہرست سے ظاہر ہے کہ غالب نے زیادہ تر کتابوں کے دیباچہ، خاتمہ اور تقریظیں لکھی ہیں لیکن سب کا انداز جدا جدا ہے۔ اور کوئی شراسی نہیں ہے جس میں نظری کی سند شری کی طرح محض خیال آرائی کی گئی ہو اس زمانے میں غیر منقوط یا مقطع الحروف عبارتیں لکھنا محال۔ نگارش سمجھا جاتا تھا۔ غالب کی شروں میں اس نگارش کے نمونے بھی موجود ہیں۔

فارسی مکاتیب | لیکن ان کی شراسی کا ہر درجہ دلکش مجموعہ ان کے مکاتیب میں جن پر آہنگ پنجم مشتمل ہے۔ ان کی تعداد کم و بیش ایک سو چالیس ہے۔ میر خیال ہے کہ اردو کے مکاتیب کی طرح فارسی کے مکاتیب کی بھی ایک بڑی تعداد ضائع ہو گئی یا چھپ نہیں سکی۔ اردو کے مکاتیب زیادہ تر غالب کی زندگی کے آخری بیس سال کے ہیں۔ اس سے پہلے وہ عموماً فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے۔ چونکہ کثیر الاحباب اور کثیر الاقارب تھے۔ اس لیے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ انہوں نے پندرہ سو لہ برس کی عمر سے لے کر پچاس پچپن برس کی عمر تک پینتیس چالیس برس میں محض ایک سو چالیس مکاتیب لکھے۔

کلیات نظم | کلیات نظم کے آغاز میں قطعات، نوے اور تارکین ہیں۔ پھر ایک محسن ہے۔ اس کے بعد ترکیب بند، بعد ازاں مثنویاں، قصیدے اور غزلیات اور آخر میں رباعیات ہیں۔ ان کا سرسری اندازہ یہ ہے :-

قسم نظم	تعداد	اشعار
قطعات	۶۷	۸۳۴
محسن	۱	دس بند
ترکیب بند	۳	۲۳۰
ترجیع بند	۱	۵۶
مثنویاں	۱۱	۲۰۲۲



۴۳۸۷

۳۲۸

غزلیات

۲۰۰

۱۰۰

رباعیات

گویا کلیات فارسی کے کل اشعار کا اندازہ سوا دس ہزار کے قریب ہے۔ ”سب ہیں“ کے کل اشعار قریباً ساٹھے چھ سو ہیں ثنوی ”اب گہ یار“ کے ساتھ جو اشعار چھپے اور وہ کسی دوسرے مجموعہ میں شامل نہیں ہو سکے قریباً ایک سو ہیں۔ اس طرح غالب کے فارسی اشعار کا مجموعہ گیارہ ہزار کے قریب ہے لیکن بعض چیزیں ناپید ہیں مثلاً نواب ٹکس الامرا حیدر آبادی کا قصیدہ بعض اشعار و قطعات و رباعیات شروں میں آئے ہیں اور کسی مجموعہ نظم میں شامل نہیں ہو سکے۔ ان سب کو جمع کرنا وقت طلب ہے۔

قطعات اور ترکیب بند اقطعات متفرق مضامین کے متعلق ہیں مثلاً اپنے اور معاصرین کے درمیان فرق کے متعلق، اور الہی کی پیروی نہ کرنے کے متعلق، ایک بخیل کے متعلق، ذوق کے متعلق بعض قطعات امرا و حکام کی مدح و ثنیت میں ہیں۔ چند نوحے ہیں۔ ترکیب بند وہ ہیں ایک حضرت علی علیہ السلام اور دوسرے محمد بنی اللہ عنہم کی منقبت میں اور دوسرا بہادر شاہ کے صاحبزادے مرثیہ میں ترجیع بند بہادر شاہ کی مدح میں ہے اور محسن حضرت علی کی منقبت میں۔

ثنویاں | ثنویوں کی کیفیت یہ ہے :-

(۱) بہادر شاہ کی مدح میں موسوم ”بہر منہش“

(۲) ایک قصہ موسوم ”درد و داغ“

(۳) بنارس کی تفریب میں موسوم ”بہ چرخ ویر“

(۴) ایک قصہ موسوم ”بہ گاہ و بآ“

(۵) کلمتہ میں جن لوگوں نے نازکے خلاف اعتراضات کا ہنگامہ بپا کیا تھا ان کے

جواب میں موسوم ”بہ باد خالص“

(۶) تبرکات اور مسئلہ مکان و اقدار فیض حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کلاما

خیر آبادی کی تحریک پر لکھی اور یہ اس سلسلہ بحث کی ایک کڑی ہے جو مولانا فضل الرحمن خیر آبادی اور شاہ اسماعیل شہید کے درمیان شروع ہوئی تھی۔

(۷) تنہیت نامہ عید بخت بہادر شاہ ثانی

(۸) تنہیت نامہ عید بخت شہزادہ فتح الملک ولی عہد بہادر شاہ

(۹) واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ کی شرمسوم لہست و ہفت افسر کا دیباچہ

(۱۰) آئین اکبری صحیح سرسید احمد خاں کی تفسیر۔

(۱۱) مثنوی "ابگر بار"

ابگر بار | ان میں سے بعض مثنویوں کی کیفیت اور بعض اشعار کتاب کے مختلف حصوں میں جا بجا پیش کئے جا چکے ہیں۔ لیکن آخری مثنوی کے متعلق تھوڑی سی تفصیل ضروری ہے۔ غالب کی یہ سب سے بڑی مثنوی ہے جس کے اشعار گیارہ سو سے زائد ہیں۔ ان کا ارادہ تھا کہ شاہ تاج کے دنگ میں عزت نبوی علی اللہ علیہ وسلم کو نظم کریں لیکن افسوس کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا وہ اس مثنوی کے صرف مقدمات یعنی حمد و نعت و منقبت، غرض تالیف وغیرہ ہی متنبہ کر سکے اصل مضمون شروع نہ ہو سکا۔ اس میں صرف معراج کا واقعہ ۲۸ اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کے آخر میں غرض تالیف کے متعلق فرماتے ہیں :-

زباں تازہ سازم دینروے بخت	بہ ذکر شہنشاہ بے تاج و تخت
گزشت آنکہ دستانہ لکھن	ز کین خسرو و ستم آرد سخن
منہم کم بود در کلام	شہنشاہ کیسہ سپہ امام
ز خیر و بد سیم تختہ انگیز تر	ز مرغ حیران سخنیز تر
فرو مردن شمع ساسانیاں	بود صبح اقبال ایمانیاں
رقم سنج منشور یزدانیم	ز ایمانیاں گویم ایمانیم
کسے را کہ نازد بہ بیگانگان	خود در شمار دزد و دوانگان

بہ اقبال ایماں زنیروئے دیں سخن را اتم از سید المرسلین  
فردوسی کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کی صحت و درستی میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔  
غالب اس ثمنوی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

در خمیر دود افروزین چناں فردا دمکہ فردات خداوند دنیا دیں حضرت امام المرسلین  
سلام علیہم رب العالمین بہ بند بشارش اندر آرام۔ زعید و مناجات و نقب و ساقی نامرد  
منوی :- یہ پیدائی پزیرفت۔ با چانی و خباگر بیا سخنمائی دل آویز سرانگیر گفتہ آمد۔ و شو  
در مناجات بہ شہیدہ ابدع ہاں ساں رندان و قلندران سخن سرودہ شد کہ سر و شان بشتی۔ الب  
از شور بایا ہوئے بختا از نو۔ و در بارہ معراج عروج نکراں پایہ یافت کہ سخن از جاتیکہ سے خوشتم  
بل بجا رسید گفتارناشتاں کہ بہ ترا ت فارسی گویان ہند و گرفتہ اندواں را بہ ملتے گراں  
ہے فرد شہد و ہے خندان حسن خدا و خلق مرا چوں بینند۔

قصائد کی تفصیل یہ ہے :-

نفاذ و قصائد

مدح

۱۲

(۱) حمد و نعت و مناقب ائمہ

۱

(۲) اکبر شاہ ثانی پادشاہ دہلی

۱۵

(۳) بہادر شاہ ثانی پادشاہ دہلی

۳

(۴) ملکہ و کٹوسہ

۱

(۵) لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل

۲

(۶) لارڈ ولین براگورنر جنرل

۱

(۷) سر چارلس ٹکٹ

۱

(۸) جیمس ہامپن لٹنٹ گورنر یوپی

لے ثمنوی اب بنگلہ دیش مطبوعہ ۱۲۸۰ھ صفحہ ۳

- (۹) پرنسب صاحب  
 (۱۰) مامس ماڈک  
 (۱۱) ولیم فریزر  
 (۱۲) کالون صاحب  
 (۱۳) لا ڈار ڈنگ گورنر جنرل  
 (۱۴) ایڈمنسٹریٹور بہادر  
 (۱۵) لا ڈو کینگ گورنر جنرل  
 (۱۶) سر رابرٹ ٹنگری ٹنٹ گورنر پنجاب  
 (۱۷) شہزادہ فتح الملک  
 (۱۸) ابو الفتح  
 (۱۹) نصیر الدین حیدر شاہ اودھ  
 (۲۰) امجد علی شاہ اودھ  
 (۲۱) واجد علی شاہ اودھ  
 (۲۲) نواب یوسف علی خاں والی رام پور  
 (۲۳) نواب وزیر الدولہ والی ٹونک  
 (۲۴) راجہ شیو دیان سنگھ والی الور  
 (۲۵) مہاراجہ نند سنگھ والی پٹیالہ  
 (۲۶) نواب مصطفیٰ خاں شیفہ مرحوم  
 (۲۷) مفتی صدر الدین گزروہ مرحوم  
 (۲۸) نواب شہار الدین احمد خاں شیر مرحوم  
 (۲۹) سر سالار جنگ اول

(۳۵) ایک عام قصیدہ یا نظم جس کا کوئی مدوح نہیں۔

مثنوی ابرگرہ یار کے ساتھ دو قصیدے ہیں ایک لارڈ ایلچن کی مدح میں اور دوسرا لارڈ ولارنس کی مدح میں "سب جیس" میں ایک قصیدہ نواب کلب علی خاں بہادر دہلی رام پور کی مدح میں ہے۔

قصیدوں کا انداز غالب نے خود ایک جگہ اپنے قصیدوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ حرفِ چہرہ درست ہے فرماتے ہیں :-

کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا وہ روشِ ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی عجز کو نہیں آتی کہ باطل بھاؤں کی طرح بکنا شروع کر دیں میرے قصیدے دیکھو تشبیہ کے شہر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم نہیں بھی یہی حال ہے۔

۱ واقعہ یہی ہے کہ ان کے تمام قصیدوں میں یا تو تشبیہیں بہت اعلیٰ ہیں یا چھوٹے شعرا نہ نقطہ نگاہ سے خاص طور پر قابلِ قدر ہیں جن میں انہوں نے اپنی حالتِ بیان کی ہے تشبیہوں میں غالب نے اپنی شاعری کے ہر کمال کو انتہائی حسنِ خوبی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اکثر قصائدِ عرفی اور دوسرے مشاہیرِ اساتذہ فن کے قصیدوں پر لکھے ہیں اور غالب اگر ان سے آگے نہیں نکلے تو پیچھے بھی نہیں رہے لیکن افسوس کہ یہ غالب کو عرفی اور دوسرے شعرا جیسے قدروان ملے اور نہ زبانِ فارسی کا وہ ذوق باقی رہا جس سے عرفی اور دوسرے اساتذہ کا کلام صدیوں متبع ہوتا رہا۔ بلکہ غالب کی وفات کے ساتھ ہی فارسی زبان کا تذکرہ بڑی حد تک ختم ہو گیا۔

اصلاحِ اشعار مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں غالب کے طریقِ اصلاحِ اشعار کا بھی مختصر ذکر کر دیا جائے۔ وہ اپنے شاگردوں سے صاف لکھا ہوا کلام منگاتے تھے اشعار کا بہنِ لسطور اتنا ہوتا تھا کہ اس میں حسبِ ضروری اصلاح دی جاسکے جو مقصد اصلاح بھی واضح فرمادیتے تھے اور اصلِ مسودہ مرسل کو وہ پس کر دیتے تھے۔ قاضی محمد جمیل بریلوی کو لکھتے ہیں :-

دو عنایت نامہ آپ کے اوقات مختلف میں پہنچے۔ پہلے خط کے حاشیہ پر اور پشت پر اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ سیاہی اس طرح کی کھچی کہ حروف اچھی طرح پڑھیں جاسکتے، اگرچہ بنیائی میری اچھی ہے۔ اور میں عینک کا محتاج نہیں لیکن باریں ہمہ اس کے پڑھنے میں بہت تکلف کرنا پڑتا ہے۔ علاوہ اس کے جگہ اصلاح کی باقی نہیں۔ چنانچہ اس خط کو آپ کی خدمت میں دہس بھیجا ہوں۔ تاکہ آپ یہ نہ جانیں کہ میرا خط بھگاڑ کر مچھینک دیا ہو گا۔ اور موند امیر اندیش آپ کو معلوم ہو جائے۔ آپ نہ دیکھیں۔ اس میں اصلاح کہاں دی جائے، واسطے اصلاح کے جو غزل بھیجے۔ اس میں جن افراد وین العصرین کا فاصلہ زیادہ چھوڑے۔ آپ کے دوسرے خط میں جو کاغذ اشعار کا ہے حروف اس کے روشن ہیں۔ مگر میں بسطو مہفقود اور اصلاح کی جگہ معدوم آپ کی خاطر سے سچ کتابت اٹھاتا ہوں اور دونوں غزلوں کو بعد اصلاحی تکھتا جاتا ہوں۔ مسودہ تو آپ کے پاس ہو گا اس سے مقابلہ کر کے معلوم کر لیجئے گا کہ کس شعر پر اصلاح ہوئی اور کیا اصلاح ہوئی اور کون سی بیت موقوف ہوئی۔

تفتہ کو لکھتے ہیں :-

دوسرا پارسل جس کو تم نے سچے تکلف خط بنا کر بھیجا نہ اصلاح کو جگہ نہ تحریر سطور کا بیچ و پست سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورثے پر کیوں نہ لکھا اور چھدا چھدا کیوں نہ لکھا ایک آدھ ورق زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا یہ ہر حال اب مجھے شک ہے چننے پڑے ہیں۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں :-

اشعار جناب رند کے پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد درست ہو گئے۔ اور اصلاح اور اشعار اور فرامد جیسا کہ میرا شیوہ ہے عمل میں آیا۔

مجھے سادہ بکسوں ملو کہ ان کے پاس اطراف ملک سے نظمیں اور نثریں (اور دو اور فارسی کی) اصلاح کے لئے آتی تھیں سب کو انتہائی توجہ سے دیکھتے تھے۔ سخت تحالیف کے عالم میں

لے جانی بائیں لال رند وکیل مہاراجہ بھرت پور



انداز شعر خوانی خواجہ حاکمی فرماتے ہیں کہ شعر خوانی کا انداز بڑا دلکش اور موثر تھا۔ خواجہ صاحب نے صرف ایک مرتبہ غالب کو مشاعرہ میں غزل پڑھتے سنا۔ ان کی باری سب کے بعد آئی صبح ہو گئی تھی انہوں نے کہا صاحبو! میں بھی اپنی بھیر ویں الایٹا ہوں۔ یہ کہہ کر اول اردو طرح کی غزل اور اس کے بعد فارسی کی غیر طرح نہایت پرورد آواز سے پڑھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدروان نہیں پاتے اس نے غزل خوانی میں فریاد کی کیمیت پیدا ہو گئی ہے۔

خواجہ حاکمی نے ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز قلعہ سے سیدھے نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر آتے اور کہنے لگے۔

آج حضور نے ہماری بڑی قدروانی فرمائی عید کی مبارکبادیں قصیدہ لکھ کر لے گیا تھا جب میں قصیدہ پڑھ چکا تو ارشاد ہوا کہ مرزا غم پختے خوب ہو۔

اس سے بھی یہی نظا ہر ہوتا ہے کہ شعر پڑھنے کا انداز بہت دلکش تھا۔

طریق غاکش فکر شعر کا طریقہ خواجہ حاکمی کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ

اکثرات کو عالم سر خوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سراغ نام ہو جاتا تھا۔

تو کہ بند میں ایک گرہ نکالیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں دکا کر سورتے تھے

اور دوسرے دن صرف یا دیر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلمبند کر لیتے تھے

ایک خط میں میرزا تقی کو لکھتے ہیں:-

کیا ہنسی آتی ہے تم پر اند اور شا عروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھ ہو کہ آگتا کی غزل یا قصیدہ

سامنے رکھ لیا۔ یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر نغفہ جوڑنے لگے۔ لاجلہ

لا قوافی بالندہ بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی

ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں صرف بھرا اور رویت قافیہ تو دیکھ لیا اور اس



بین میں نثر اور قصیدہ لکھنے لگا..... بجا فی شاعری معنی آخری ہے تانیہ پائی نہیں۔  
 شاعرے | غالب کے فارسی مکاتیب میں چند مشاعروں کا بھی ذکر ہے جن میں انہوں نے شرکت  
 کی۔ اردو مکاتیب میں میری تحقیق کے مطابق صرف ایک جگہ قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر آیا ہے  
 قاضی عبدالحی بربلوئی نے مشاعرہ قلعہ کا مصرعہ طرح مانگا تھا جو اس میں انہیں لکھتے ہیں :-  
 قلعہ میں شہزادگان تیموریہ جمع ہو کر کچھ غزل غوالی کہتے ہیں۔ وہاں کے مصرعہ طری کر گیا کچھ  
 اور اس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھے لکھا میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا ہوں  
 یہ صحبت خود چنداں نہ ہے۔ اس کو دوام کہاں۔ کیا معلوم ہے کہ اس کے نہ ہو اور اس کے ہوتو  
 آئندہ نہ ہو۔

اس مکتوب پر کوئی تاریخ درج نہیں لیکن بہر حال یہ عذر سے پہلے کا مکتوب ہے  
 اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خاندان تیموریہ کے اوضاع و اطوار اس زمانے میں ایسے ہو گئے  
 تھے کہ اسباب بصیرت کو یقین ہو چکا تھا۔ یہ محفل اب ختم ہونے والی ہے اور اس شمع کی  
 جھلکا ہٹ صرف چند دم کی مہمان ہے۔

فارسی مکاتیب میں سے جن میں مشاعروں کا ذکر ہے۔ چار ذاب مصطفیٰ خاں شہنشاہ  
 کے نام ہیں اور ایک میر ہمدی بختی کے نام۔

پہلا مشاعرہ | ذاب مصطفیٰ خاں کو لکھتے کہ جمعہ کی شب کو (۲۳ مارچ سنہ ۱۰۷۱ ہجری میں) بزم  
 سخن آراستہ ہوئی میں نے طرحی زمین میں غزل نہیں کہی تھی اس لئے مشاعرہ میں جانا نہیں  
 چاہتا تھا۔ لیکن ذاب ضیاء الدین احمد خاں نے زین العابدین خاں عارف اور غلام حسن خاں

۱۰۷۱ میرا خیال ہے کہ یہ ۱۰۷۲ یا ۱۰۷۳ء کا مکتوب ہے اس لئے کہ انہی دنوں میں جیسا کہ آئندہ قلمباز  
 سے معلوم ہو گا۔ غالب نے "گزشتہ" والا قصیدہ کہا تھا جو "سید الاخبار" کی ۱۰۷۳ء کی ایک اشاعت میں  
 چھپا تھا۔ "سید الاخبار" کا یہ پرچہ میرے محترم دوست مولانا مظہر الدین صاحب شیر کوٹی مالک "ایڈیٹر المان"  
 دہلی کے پاس ہے اس کا کچھ حصہ "المان" میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

تھو کو دو فرشتوں کی طرح مجھ پر مقرر کر دیا۔ وہ دونوں شام کو ہاتھی لے کر میرے مکان پر آئے۔  
اور مجھے سوار کر کے لے گئے۔ وہاں پہنچ کر مولانا صدر الدین آزر وہ کی زیارت سے بے رغبتی کی  
تلافی ہو گئی صحابی نے طری زمین میں غزل پڑھی۔ دو تین شعور نشین تھے۔ عارف اور جوہر  
نے دو غزلیں پڑھیں ہیں نے اسی روز ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے۔

صبح شذخیں نہ کہ رو دادا اثر بنائیم  
چہرہ آغشته بہ غناب جب گریںائیم

یہ غزل سنائی یا چندہ مشاعرے کے لئے گریںائیم نے آید دانا تم نے آید طرح ہوئی۔  
دوسرا مشاعرے اور سب مشار ہیں بی غالب شریاب ہوئے۔ فرماتے ہیں کہ آرزو کے  
بہت سے شاعر جمع تھے۔ اور انہوں نے لمبی لمبی غزلیں پڑھیں مفتی صدر الدین آزر وہ بیمار  
تھے اس لئے شریاب مشاعرہ نہ ہوئے۔

چوں نوبت بہ من رسید بخت ملک شخواست  
طی خواندم

چہ پیش از وعدہ چوں باور نہ اندام نے آید  
بہ نوئے گفت سے آیم کہے دامن نے آید  
مشاعرے میں آئندہ کے لئے عرفی کا یہ مصرعہ طرح قرار پایا  
صد سال سے تو اں بہ تمنا گریستن،  
غالب لکھتے ہیں :-

دریں زمین طائب آملی۔ قصیدہ وار و عرفی دو غزل تا غالب بے قرار ہو گیا  
دہرہ درخروش آزد

۱۔ کلیات شرفارسی صفحہ ۲۰۱۔

۲۔ کلیات شرفارسی صفحہ ۲۰۲۔

تیسرا مشاعرہ | تیسرے مشاعرے کی کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں کہ شام ہوئی تو وہی دو فرشتے یعنی عارف و خواجہ آگر ٹھٹھے لے گئے۔ میر نظام الدین ممنون اور مولوی امام بخش صہبائی بہ سبب ملازمت نہ آئے، حضرت آرزوہ کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا۔ وہ اگرچہ دیر سے آئے مگر تشریف لے آئے۔ میں نے طرحی زمین میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس قصیدہ کو برات نامقبول کی طرح ناخواندہ واپس لے جاؤں اور آرزوہ کے شوا کو درود سنان دوں لیکن حضرت آرزوہ کی تشریف آوری سے دل مطمئن ہو گیا۔ اور میں نے قصیدہ پڑھنا ضروری سمجھا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مشاعرہ بین اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی طرح دی جاتی تھیں اور دونوں زبانوں کے شعرا آتے تھے۔ مگر غالب صرف فارسی کلام پڑھتے تھے۔ اس وقت تک قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے غالباً اُردو کہتے ہی نہ تھے صرف فارسی کہتے تھے۔

چوتھا مشاعرہ | چوتھے مشاعرے کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں میری خاک زمیں گیر رنجیتہ گویوں کی آنکھوں کا غبارِ دہنی میں نے ایک ہفتہ پہلے غزل کہہ لی تھی۔ اور حضرت آرزوہ کی خدمت میں بھیج دی تھی۔

پانچواں مشاعرہ | میر ہمدی تجرج والے خط میں قلعہ کے مشاعرہ کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں کہ جبہ کی شب ۲۵ فروری (سنہ ۱۲۰۵) کو پادشاہ کا حکم پہنچا کہ سب شاعر قلعہ میں جمع ہوں چنانچہ خاندان بابر کے شہزادے اور دوسرے لوگ اس قدر تعداد میں آئے کہ نشست میں بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ سب سے پہلے سلطان الشعراء شیخ محمد ابراہیم ذوقؒ نے پادشاہ کی غزل پڑھی۔ پھر شہزادہ خضر سلطان نے اپنی غزل سنائی۔ ان کے بعد میرزا حیدر رشکوہ، میرزا

۱۔ کلیات شرفارسی صفحہ ۲۰۲۔ کلیات شرفارسی ۲۰۲۔ پشاور غلبہ قلعہ کے ساتھ تعلق ملازمت پیدا ہونے کے بعد ہوا جبکہ ذوق بقیہ حیات موجود تھے گویا ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء کے درمیان کوئی مشاعرہ چاہیے

نورالدین میرزا عالی بخت عالی نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ عالی کے پاس ہی میں (غالب) بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی غزل دس شعر کی ٹپھی مہمبائی کے شاگردوں میں سے محوی نام ایک نوجوان نے "نشد رستا نہ" لگائی میرزا حاجی شہرت نے کم و بیش ستر شعر میں طرچی میں سنائے میں پیشاب کے بہانے سے وہاں سے اٹھا۔ اور اپنے گھر چلا آیا۔ دکانوں کے دروازے کھلے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ شراب پی اور سورا۔ صبح قلعہ میں گیا تو وہ چاروں شہزادے جن کے نام اوپر مرقوم ہیں جمع تھے انہوں نے رات والی غزلیں پھر سنائیں میں نے بھی اپنی غزل دوبارہ پڑھی۔ وہیں سنا کہ مشاعرہ ساری رات جاری رہا۔ سب آخر میں سلطان الشعراء (ذوق) نے دو غیر طرچی غزلیں سنائی تھیں۔

غالب کی شاعری کے متعلق محولہ بالا بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) انہوں نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے تھے۔ ابتدا اردو سے ہوئی تھی۔ دس بارہ برس میں خیالی مضامین کا ایک دیوان تیار کر لیا تھا جب اچھائی برائی کی تمیز پیدا ہوئی تو اکثر اشعار حذف کر ڈالے۔ صرف چند اشعار بہ طور نمونہ موجود رہے۔

(۲) فارسی بھی اردو کے بعد ہی شروع کر دی تھی اور کم و بیش بیس برس کی عمر تک دونوں کی مشق یکے کے ساتھ جاری رہی۔

(۳) اس کے بعد فارسی کی طرف زیادہ توجہ ہوتی گئی اور اردو کی طرف سے دل ہٹا گیا۔ تاہم وہ ۱۸۴۵ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک اردو کے بجائے حقیقتہً فارسی کے شاعر سمجھے جاتے رہے۔

(۴) قلعہ کے ساتھ ملازمت کا تعلق پیدا ہونے کے بعد وہ پاس خاطر شاہ انہوں نے پھر اردو پر توجہ مبذول کی ان کے مروجہ دیوان کی زیادہ تر اچھی غزلیں اسی

دور کی کہی ہوئی ہیں ۔

(۵) نظم و نشر کا سلسلہ یوں تو ان کے آخری دم تک قائم رہا لیکن ان کی اُردو داؤ  
فارسی نظم و نشر کی بہترین چیزیں وہ ہیں جو ۱۸۲۵ء سے لے کر قریباً ۱۸۶۵ء  
تک لکھی یا کہی گئیں۔ ۱۸۲۵ء عیسوی سے قبل وہ ناپختہ تھے اور ۱۸۶۵ء کے  
بعد ان کے دماغی قوی شدید انحطاط کی زد میں آ گئے تھے ۔

